فتح مبین

از قلم

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

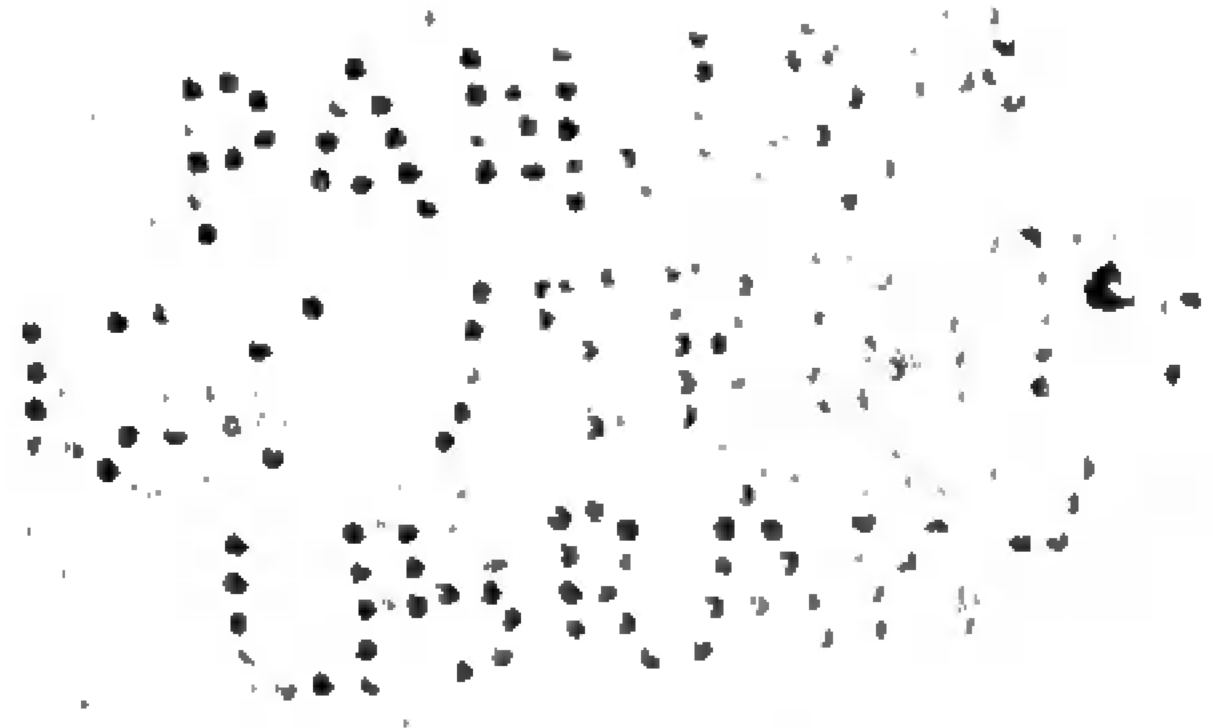
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی



ناشر

...نہ امامیہ ◎ اردو بازار

لاہور



بار اوّل ———— دسمبر ۱۹۶۳ء

تعداد اشاعت ———— ایک ہزار

کتابت ———— ثاقب زیروی

طباعت ———— نامی پریس

قیمت ———— چار روپے

ناشر ———— مکتبہ امامیہ

ترتیب

عرضِ ناشر

ہماری انمول پیشکش "فتح مبین" آپ کے زیر نظر ہے۔ فاضل قلم کار ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی کی ذات گرامی علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، ہمیں فخر ہے کہ وہ امامیہ مشن پاکستان کے اُن خاص قلمی معاونین میں سے ہیں جو ہمیشہ بے لوث قلمی اعانت فرماتے رہتے ہیں گذشتہ دنوں بھی ہمیں ممدوح کے دو عظیم شاہکار "دینیات" (پانچ حصوں میں) اور "شہید اعظم"، شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی،

کچھ عرصہ سے ہم یہ بات بڑے دُکھ کے ساتھ محسوس کر رہے ہے کہ پاکستان میں ایک نیا فتنہ بڑی تیزی کیساتھ پروان چڑھ رہا ہے جو بنی امیہ کی حمایت میں تحریری اور تقریری "جہاد" میں مصروف ہے، کسی بھی شخص کو جبر و اکراہ کے ساتھ اسکے عقیدہ سے باز نہیں رکھا جاسکتا ہے ـــــ خاندان بنی امیہ کے ثناخوانوں کو اس کام کی جزا و سزا تو بارگاہ ایزد متعال سے عطا ہوگی لیکن اس بات کا قلق ضرور ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے مدح خوان تحقیق کے نام پر تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنیکی ناکام کوشش میں مصروف ہیں، ہم سرکار محمدؐ و آل محمدؐ کے نام لیوا ہونے کیوجہ سے یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ تصویر کا صحیح رُخ بھی پیش کرتے رہیں تاکہ گمراہی نہ پھیلانے پائے ـــــ اس کتاب میں فاضل مصنف نے روایت و درایت کے ساتھ بنی امیہ کے مقابلہ میں آل محمدؐ کی فتح مبین کو قلم کی پوری توانائیوں کیساتھ اس دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ آل محمدؐ کے کردار کی عظمت و لازوال فتح کا اقرار کرنیکے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ـــــ آپ یقیناً اس کتاب کو پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

ناشر

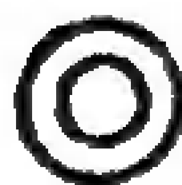
انتساب

اپنے بھائی اور محسن

الحاج السیّد ابو محمد صاحب جے پی
صدر شیعہ اثنا عشری جماعت — بمبئی

کی خدمت میں

جن کی محبت اور شفقت کا سہارا پاکر میں یہ کتاب مکمل کر سکا!



پیش لفظ

آلِ رسولؐ کا دربار بہت بڑا دربار ہے، میں نے اسی دربار میں حاضر ہو کر معرفت و بصیرت کی بھیک مانگی، جو کچھ ملا وہ اربابِ نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں، یہ فیض ہے اسی سرکار کا، اس میں میرا کوئی کارنامہ نہیں!

مجھے اپنی کوتاہیوں اور کم علمی کا اعتراف ہے، اس لئے میں قارئین سے بصد ادب یہ درخواست کروں گا کہ میری غلطیوں سے عفو بصر فرمائیں، اور اگر کوئی کام کی چیز مل جائے تو بارگاہِ آلِ رسولؐ میں میرے لئے شفاعت کی دُعا فرمائیں۔

نیاز کیش

غلام غلامانِ علیؑ

ذاکر حسین فاروقی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ اللَّعِينِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اَلصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَسَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ، شَفِيْعِ الْمُذْنِبِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ، سَيِّدِنَا وَشَفِيْعِنَا وَنَبِيِّنَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاهِرِيْنَ.

نسلِ انسانی کی تاریخ معرکہ حق و باطل کی تاریخ ہے، کشمکش نور و نار کی تاریخ ہے، الوہیت و شیطنت کی پنجہ کشی کی تاریخ ہے، جھوٹ اور سچ کے مجادلہ کی تاریخ ہے اور ـــــ اسی جدال نور و ظلمت نے نہ صرف یہ کہ تاریخ کو ہمارے لئے انتہائی موجبِ عبرت بنادیا ہے بلکہ اسی کے نتیجہ میں فکر و نظر کی وہ راہیں کھلتی ہیں جو نسلِ انسانی کے لئے ہمیشہ ایک عظیم سرمایۂ ہدایت و موعظت ثابت ہوتی رہیں گی!

حق و باطل کی معرکہ آرائیوں کی اس طولانی، خونین اور عبرت انگیز تاریخ میں ایک چیز ہمیشہ نمایاں رہی ـــــ اور وہ یہ کہ حق پرست ہمیشہ مادی وسائل کے اعتبار سے کمزور، بے بس، افتادہ، پسماندہ، اور ناچار نظر آئے۔ ان کو صبر آزما تکالیف اور ہمت شکن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان کو پے در پے قربانیاں دینا پڑیں، اور ان پر مظالم کے وہ پہاڑ توڑے گئے، جن کے ایک ادنیٰ تصور سے بھی روح میں کپکپی اور قلب میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے ـــــ اس کے مقابلہ میں باطل پرستوں کو ہمیشہ سلطنت کا طمطراق، تاج شاہی کی چمک دمک، خدم و حشم کا دبدبہ، عساکر کی ہیبت و سطوت، برق تاب شمشیروں کی آتشیں قوت، سیم و زر کے انبار اور اکثریت کا ناز و تبختر حاصل رہا! ـــــ خالص مادی اعتبار سے ان دونوں متحارب قوتوں میں ایک عظیم فرق موجود رہا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے ٹکراؤ کی تاریخ کبھی صحیح روشنی میں نہیں لکھی جاسکی، اس کشمکش کے صحیح نتائج کبھی اخذ

نہیں کئے جا سکے، اور نسلِ انسانی ان حقائق سے کبھی پورے طور پر آگاہ نہیں ہو سکی جو اس عظیم ٹکراؤ کے نتیجے میں اسے معلوم ہونا چاہیئے تھے!

علمائے "تاریخ" نے جب بھی اس کشمکش پر نظر ڈالی تو ان کی ظاہر بین نگاہیں حق کی بے بسی اور باطل کے شکوہ و دبدبہ سے مرعوب ہو گئیں۔ اور پھر نتائج اخذ کرنے میں انہوں نے ایسی ٹھوکریں کھائیں، ایسے فیصلے صادر کئے، جو نہ صرف یہ کہ حقیقت کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے بلکہ نسلِ انسانی کے لئے انتہائی گمراہ کن، انتہائی ہمّت شکن، اور انتہائی تباہ کُن ثابت ہو سکتے ہیں، جن کے مان لینے کے نتیجے میں دنیا پر شیطنت کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ اور جن پر ایمان لے آنے کے بعد نسلِ انسانی کا مستقبل ایک بھیانک تاریکی، ایک پر ہول ظلمت اور ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے کے علاوہ اور کچھ تسلیم نہیں کیا جا سکتا!

ہمارے مؤرخین نے جب بھی معرکۂ حق و باطل کی تصویر کشی کی تو ان کی کوتہ بین نگاہیں صرف فریقین کے "وسائلِ جنگ" میں اُلجھ کے رہ گئیں، انہوں نے کبھی خود جنگ اور اُس کے نتائج کو نہیں دیکھا بلکہ صرف متحاربین کے مادّی وسائل کو دیکھ کے کچھ "اندازے" قائم کر لئے جن کو بعد میں "تاریخ کے فیصلے" کا معزز لقب عطا کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح نتائج مرتب کرنے سے قاصر رہے۔ اور انہوں نے جن افکارِ باطلہ کو "حقیقت" کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا وہ منطقی فکر کی ایک ادنیٰ سی ضرب بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں!

علمائے تاریخ نے بس یہ دیکھا کہ ایک فریق کے پاس حکومت کی طاقت، عساکر کا جلال اور شاہانہ کرّ و فر کی قوتیں موجود ہیں۔ اور دوسرا فریق دلق پوش بوریہ نشینوں پر مشتمل، ایک طرف چمکتی ہوئی تلواریں، لچکتے ہوئے نیزے اور زہر بھرے تیر ہیں۔ تو دوسری سمت دبی دبی دُعائیں، پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو اور کلیجوں سے اٹھتا ہوا

وہ یہاں ایک طرف مادی وسائل کا انبار ہے اور دوسری سمت ظاہری قوتوں کا فقدان —— اور بس اتنا ہی دیکھ کر انہوں نے جنگ اور اس کے " نتائج " کا فیصلہ صادر کر دیا. انہوں نے صرف وسائل کو دیکھا اور یہ فیصلہ کر دیا کہ جس فریق کو دبدبۂ سلطنت اور فرِ شہی حاصل ہے وہ کامیاب اور فتحمند، اور جس فریق کے مادی وسائل کم ہیں وہ ناکام اور مغلوب! —— حالانکہ یہی ان کی غلطی تھی! —— کسی جنگ کا فیصلہ محض وسائل سے نہیں ہوتا اس لئے کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات بظاہر کمزور جماعتیں محض اپنے عزم و ہمت کے سہارے طاقتور جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ کمتر درجہ کے اسلحہ رکھنے ...... والی فوجیں صرف اپنے کمانڈروں کی ذہانت اور فنونِ حرب کی لیاقت کے نتیجہ میں اعلیٰ پیمانہ پر مسلح فوجوں کو شکست دے دیتی ہیں، مٹھی بھر انسانوں کا عزم طاقت و سطوت کے دیوتاؤں کو اپنے سامنے سر بسجود ہو جانے پر مجبور کر دیتا ہے، خونِ اسرائیل کی تب و تاب طلسم سامری کا تار پود بکھیر دیتی ہے. اور غریب مزدور قیصر و کسریٰ کے تاج اپنے قدموں تلے روند ڈالتے ہیں، ابھی کل کی بات ہے کہ نہتے ہندوستانیوں نے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا چراغ گل کر دیا۔ کوریا کے نہتے سپاہیوں نے امریکہ کا جاہ جلال خاک میں ملا دیا۔ ہند چینی کے مجاہدین حریت نے فرانس کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اور انڈونیشیا کے ناطاقت سرفروشوں نے ولندیزیوں کا طنطنہ حکومت ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا، مادی اور ظاہری اعتبار سے یہاں بھی بہت فرق تھا لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ کمزوروں نے طاقتوروں کو، غلاموں نے آقاؤں کو، عزم و ہمت کے پتلوں نے خوف ناک توپوں اور آتش بار بموں کو، اور جذبہ حریت سے سرشار نہتے انسانوں نے سلحشور اور آہن پوش فوجوں کو دندان شکن شکست دی؟ اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ اگر

جذبہ صادق ہو، لگن سچی ہو، مقاصد اعلیٰ ہوں، قربانیاں پیش کرنے کی قوت ہو، فدا کاری کا ذوق موجود ہو، اور حصول مقصد کے لئے سعی پیہم جاری رہے تو مادی وسائل کی کوئی حقیقت نہیں، اسلحہ کی کمی جنگ کے نتائج پر کوئی اثر نہیں ڈالتی، اور بظاہر ناچار و بے بس جماعتیں بھی طاقتور سلطنتوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکتی ہیں —— ایسی حالت میں محض وسائل دیکھکر شکست یا فتح کا فیصلہ کر دینا قطعاً غلط ہے۔ فیصلہ جنگ کے نتائج دیکھ کر صادر کرنا چاہیئے اور یہی وہ چیز ہے جسکا حق و باطل کی معرکہ آرائیوں کے سلسلے میں فقدان نظر آتا ہے!

مورخین جب بھی حق و باطل کی کشمکش کا تذکرہ کرتے ہیں تو محض وسائل پر اس کے نتائج کا فیصلہ کر دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا فیصلہ بیشتر غلط ہوتا ہے، اور ان کی اسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ نسلِ انسانی اُن عظیم معرکوں کے نتائج کے باب میں سخت غلط فہمی کا شکار ہوئی ہے جن پر انسانیت کی فوز و فلاح اور نسلِ انسانی کے مستقبل کا انحصار ہے!

مجادلۂ حق و باطل کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے، "یہ فیصلہ" ہمیشہ آپ کے سامنے آئے گا۔ کہ کامرانی و فتحمندی باطل کو نصیب ہوئی اور حق اپنی بے سر و سامانی، بے بسی اور بے چارگی کے نتیجہ میں مقہور، ناکام اور شکست خوردہ رہا۔ ظفر مندی کا تاج باطل کے سر پر جگمگایا۔ اور ذلت و مسکنت حق کا مقسوم رہی، جھوٹ جیتا اور سچ ہارا، شیطنت کے علمبردار غالب ہوئے اور الوہیت کے پرستار مغلوب! —— یہ فیصلہ اس لئے صادر نہیں کیا گیا کہ حقیقت یہی تھی، بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے، اس فیصلہ کی وجہ محض یہ تھی کہ مورخین نے صرف وسائل جنگ دیکھ کے کچھ اندازے قائم کر لئے، حقیقت پر نظر ڈالنے سے گریز کیا، نتیجہ میں ان کا فیصلہ غلط ثابت ہوا، اور غلط فیصلہ کے نتیجہ میں نسل انسانی کو ایسے زبردست

نقصانات کا شکار ہونا پڑا ان کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے حد درجہ دشوار ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حق و باطل کے ہر ٹکراؤ میں "ظاہری فتح" بھی ہمیشہ حق ہی کو حاصل رہی ہے لیکن یا تو اس لئے کہ تاریخیں باطل پرستوں کے اثرات کے ماتحت لکھی گئیں اور یا پھر اس لئے کہ علمائے تاریخ کی نگاہیں معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں، ہمیشہ اعلان اسی امر کا ہوتا رہا کہ ظاہری فتح باطل کو نصیب ہوئی اور حق پرست مغلوب ہوئے، مورخین کی اس غلطی سے نسلِ انسانی کو بے حد نقصان پہنچا، اگر وہ ایک ذرا سی باریک بینی سے کام لیتے اور حق کی فتح مبین کا ادراک کرتے ہوئے اس کا اعلان کر دیتے تو شاید نسلِ انسانی کی تاریخ آج سے بالکل مختلف ہوتی، اور دنیا وہ نہ ہوتی جو آج ہے!

جب لوگ یہ دیکھ لیتے کہ حق والے اقلیت میں رہتے ہوئے، بے سروسامانی کی زندگی بسر کرتے ہوئے، دولت و عساکر کی قوتوں سے محروم رہتے ہوئے سلطنت کے جاہ و جلال سے بے پروائی برتتے ہوئے، مادّی وسائل اور ظاہری اسباب جنگ کے اعتبار سے بے حد کمزور ہوتے ہوئے ہر معرکہ میں باطل کو دنداں شکن شکست دیا کرتے ہیں، اس کے غرور اور طنطنہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں، تو ان میں حق پسندی کے عزائم ابھرتے، سچائی پر قائم رہنے کی ہمت پیدا ہوتی، اعلیٰ اقدار انسانی کی خاطر قربانیاں دینے کی قوت ابھرتی، اور باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر رہنے کی وہ طاقت موجود رہتی جس کے نتیجہ میں دنیا سے باطل کا وجود ہی ختم ہو جاتا! ——— لیکن نسلِ انسانی کا پرانا دشمن، شیطان، بھی اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر عام انسانوں نے یہ حقیقت جان لی کہ مٹھی بھر بے سروسامان انسان محض عزم و ہمت کے

سہارے بار بار باطل کو شکست دے چکے ہیں، تو تمام انسان پوری جرأت
کے ساتھ حق کے پرچم تلے متحد ہو جائیں گے، اور اس اتحاد انسانی کے نتیجہ میں
دنیا سے باطل یا شیطنت پرستی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا، اسلئے شیطان نے انسانوں
کو یہ یقین دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ فتح کے پرچم ہمیشہ باطل ہی
کے نام پر لہرائے جاتے ہیں، قوت، سطوت، عظمت، شوکت اور دولت صرف باطل
کے خزانہ میں نظر آتی ہیں۔ حق ہمیشہ ذلت و مسکنت کا شکار رہتا ہے، حق پسند
صرف مرنے یا تباہ ہوتے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، ان کا مقسوم صرف شکست
اور بربادی ہے، اور کامرانی و ظفر مندی کے پرچم صرف باطل کی فضاؤں میں اڑتے
نظر آتے ہیں، شیطان جانتا تھا کہ یہ واہمہ وجود میں آجانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ عام
انسان یا تو اپنی کمزوری اور بزدلی کے نتیجہ میں معرکہ حق و باطل سے دور رہیں گے
اور یا پھر خوف یا طمع کے نتیجہ میں باطل کے کیمپ میں جمع ہو جائیں گے ——— بد
قسمتی سے شیطان اس منصوبہ میں کامیاب رہا، اور مورخین نے باطل کی فتح
ظاہری کے جو نقشے مرتب کئے، حق کی پامالی کا جس انداز میں ماتم کیا، شیطانی
قوتوں کے جاہ و جلال کی جو تصویر کشی کی، اس کے نتیجہ میں شیطان کا مقصد پورا ہوگیا
باطل کی ظاہری فتح مندی ایک حقیقت ابدی کے طور پر تسلیم کر لی گئی اور اسکے
نتیجہ میں عام انسانوں میں حق پسندی کی جو قوتیں ابھرنا چاہیئے تھیں اور جن پر نسل
انسانی کے مستقبل کا انحصار تھا وہ دب کے فنا کے غاروں کی نذر ہو گئیں، باطل
کی ظفر یابی اور اسکے ظاہری شکوہ کے تصور نے انسانوں کی نگاہوں میں خیرگی
پیدا کر دی، اور حق کی حمایت کا جذبہ اتنا کمزور ہو گیا کہ آج کے ترقی، روشنی
اور علم کے دور میں بھی اس کے ابھرنے کی امید بہت کم نظر آتی ہے، ہم یہ
تماشا آئے دن دیکھا کرتے ہیں کہ حق کی حمایت میں ایک کلمہ بھی زبان سے ادا

کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوا کرتا ہے۔ اسلئے کہ انسانوں کے لاشعور میں یہ بات جم چکی ہے کہ حق کی حمایت کا نتیجہ تباہی، بربادی اور ناکامی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ پختہ ہوچکا ہے کہ ظاہری کامرانی صرف باطل کا مقسوم ہے، اور اگر انہوں نے باطل کی طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہا تو انسان کا وہی عبرتناک انجام ہوگا جو حق پرستوں کا ہوتا رہا ہے، اس تصوّر نے حق کے باب میں ان کی ہمتوں کو پست، ان کے دلوں کو چھوٹا، اور ان کے قلوب کو مضمحل کردیا ہے، ان کے دلوں میں یہ بات راسخ ہوچکی ہے کہ طاقت ہمیشہ باطل کا ساتھ دیتی ہے، اور اس طاقت کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے —— اور یہی ہے وہ چیز جو دنیا کی تباہی کی اصلی جڑ کہی جاسکتی ہے اسی تصور کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا پر باطل کا پرچم لہرا رہا ہے اور حق مقہور و پسماندہ نظر آتا ہے، باطل پرستوں کے مقابلہ میں حق پرستوں کی کسی جمعیت کا تیار کرنا حد درجہ دشوار ہوچکا ہے اور اگر کسی گوشہ سے حق کی کوئی آواز بلند بھی ہوتی ہے تو اُسے آسانی سے دبا دیا جاتا ہے حق کی یہ پامالی نتیجہ ہے تاریخ کے غلط مطالعہ کا، مورخین کے غلط اندازوں کا، اور نسلِ انسانی کے اس غلط اور تباہ کن تصور کا کہ فتح ظاہری باطل کا مقسوم ہے، اور پامالی و نامرادی حق کا مقدور!

اِس سلسلہ میں ایک اور مزیدار حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے!

اِنسان فطرۃً حق پسند ہوا کرتا ہے اور چاہے خوف یا طمع اُسے باطل کے پرچم تلے جمع کردے، لیکن اس کا دل اور اس کا ضمیر ہمیشہ حق کی پاسداری پر مجبور کرتا ہے، وہ چاہے لاکھ گناہ میں مبتلا ہو، لیکن نیکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتا، ہزار برائیاں کرتا رہے لیکن اچھائیوں کی خوبی کو تسلیم کرتا ہے، یہ

اس کی فطرت ہے جسے وہ تبدیل نہیں کر سکتا، یہ اس کا مزاج ہے جسے بدلنے پر وہ مطلق قادر نہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ باطل کی ظاہری شان سے مرعوب ہو جانے کے باوجود اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا ضرور موجود رہتی ہے کہ حق ظفر مند و کامران ہو۔ وہ حق کو مقہور اور پامال دیکھنا پسند نہیں کرتا، باطل کو کامران و سر بلند قرار دیتے ہوئے اسے ایک فطری تردد اور ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے اس کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی کہ وہ جھوٹ کو سچ کے مقابلہ میں، گناہ کو نیکی کے مقابلہ میں، برائی کو اچھائی کے مقابلہ میں فضیلت عطا کرے، یہی وجہ ہے کہ جہاں مورخین باطل کی ظاہری شان سے مرعوب ہو کر اس کی فتح کا اعلان کرتے رہے وہیں اپنی انسانی فطرت سے مجبور ہو کر ان کو حق کی فضیلت اور برتری کی بھی ایک راہ نکالنا پڑی، چنانچہ انہوں نے ایک نیا نعرہ ایجاد کیا، اور وہ یہ تھا کہ

حق و باطل کے ہر معرکہ میں جہاں ظاہری فتح باطل کو نصیب ہوئی وہیں "باطنی فتح" حق کے حصہ میں آئی!

"باطنی فتح" کا یہ نعرہ محض اس لئے ایجاد کیا گیا کہ مورخ کا دل اور اسکی فطرت حق کو پامال اور شکست خوردہ قرار دینے پر تیار نہیں تھی، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کھینچ تان کے ہی کیوں نہ سہی، حق کی کامیابی کا پرچم بھی لہرا دیا جائے اور باطل کی ظفر مندی ایک ظاہری حقیقت سہی، لیکن باطن کی ایک پُر اسرار نقاب اڑھا کے حق کو بھی کامیاب و کامران قرار دیا جائے، اور اس طرح اپنی فطرت کو تسکین دے لی جائے۔

مورخین یہ جانتے تھے کہ ان کا یہ نعرہ ایک طفل تسلی، ایک خوش آیند خواب اور ایک دل خوش کن معمہ ہے، لیکن چونکہ یہ نعرہ ان کی فطرت سے قریب تر تھا

اور اسکے نتیجہ میں حق کی فضیلت کا انسانی جذبہ تسکین پاتا تھا اِس لئے وہ باطل کی ظاہری اور حق کی باطنی فتح کا راگ ہمیشہ الاپتے رہے اور یہ بات اتنی مرتبہ کہی اور سُنی گئی کہ آج بچّہ بچّہ کی زبان پر یہی بات ہے کہ معرکہ حق و باطل میں جہاں باطل اپنی مادّی قوتوں کے سہارے ظاہری کامیابی حاصل کرتا ہے وہیں حق باطنی طور پر کامران و منصور ہوا کرتا ہے!

ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ یہ ایک واہمہ ہے، جو محض فطرتِ انسانی کی تسکین کے لئے تراشا گیا ہے، ورنہ دو متحارب قوتوں کا بیک وقت کامیاب ہونا ——— ایک کا ظاہری طور پر اور دوسری کا باطنی طور پر ——— عقلی اور منطقی طور پر قطعاً محال ہے!

جنگ میں صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں، ایک تو یہ کہ ایک فریق غالب ہو اور دوسرا مغلوب، اور دوسرے یہ کہ جنگ غیر فیصلہ کُن طریقہ پر ختم ہو جائے۔ ہر دو فریق کا کامیاب ہونا محال ہے لیکن مورخین عین اسی محالِ عقلی کے تسلیم کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جہاں باطل کی ظاہری فتح کو ایک حقیقتِ ثابتہ کے طور پر تسلیم کیا جائے وہیں حق کو کسی پُراسرار اور نامعلوم طریقہ پر فتحِ باطنی کا تمغہ عطا کر کے پلہ برابر کر دیا جائے۔ باطل کی کامرانی ایک سائنٹفک حقیقت کے طور پر مانی جائے لیکن چونکہ حق کو شکست خوردہ قرار دیتے ہوئے ایک ندامت اور کوفت سی محسوس ہوتی ہے۔ اسلئے اسکے نام کے ساتھ بھی ایک غیر مرئی اور غیر محسوس فتح کا لیبل چسپاں کر دیا جائے!

اگر حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو "باطنی فتح" ایک حرف بے معنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، فتح صرف ایک ہی قسم کی ہوتی ہے اور وہ ظاہری ہوتی ہے، وہی ہے جو نظر آئے، دیکھی جائے، محسوس کی جائے، جسے ہر دیکھنے والی آنکھ فتح

قرار دے، نہ یہ کہ وہ غیر مرئی ہو، غیر محسوس ہو، عالم اسرار یا عالم روحانیت کی کوئی ایسی عجیب کیفیت ہو جسے صرف فلسفے کے زور اور منطق کی قوت سے ثابت کیا جا سکے، جو حکماء و علماء کی ژرف نگاہیوں کی مرہون کرم ہو، حقیقت کی دنیا سے دور صرف ذہن کے نکتہ رس گوشوں میں وجود رکھتی ہو اور جسے دنیا کی نگاہوں سے دور صرف خوابوں کے جزیرہ میں ساکن قرار دیا جائے! ـــــ اگر اسی طرح محض فلسفیانہ نکتہ آرائیوں پر فیصلہ کا انحصار کر دیا جائے تو دنیا کی ہر فتح کو شکست اور ہر شکست فتح قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح و شکست کا مفہوم ہی دنیا سے معدوم کیا جا سکتا ہے!

"فتح باطنی" کے حرف لایعنی کو معنے خیز بنانے کے لئے جو بات بڑے شد و مد سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حق پرستوں کے ظاہری طور پر شکست کھا جانے کے باوجود ان کے اصول باقی رہ گئے، اور باطل ان کے اصولوں کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہوا، اسی کو باطنی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو باطل کی "فتح باطنی" کا اعلان بھی اسی شد و مد سے کیا جا سکتا ہے جس کا مظاہرہ حق کی فتح باطنی کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے اسلئے کہ جہاں حق کے اصول نہیں مٹے وہیں باطل کے اصول بھی فنا نہیں ہوئے۔ اگر حق کے نقوش قائم رہے، تو باطل کا تصور بھی باقی رہا، اگر باطل کی قوتیں حق کو محو نہیں کر سکیں تو حق بھی باطل کو نابید کرنے سے قاصر رہا ـــــ ایسی حالت میں اگر حق کے اصولوں کا دنیا میں باقی رہنا حق کی فتح باطنی ہے تو باطل کے اصولوں کی بقا باطل کی فتح باطنی قرار دی جانا چاہیئے!

اگر یہ کہا جائے کہ حق کی "فتح باطنی" سے یہ مراد ہے کہ باطل حق کو مٹا دینا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تو اس کے جواب میں یہ عرض کیا

[ب]نتا ہے، کہ حق کا مقصد بھی باطل کو فنا کر دینا رہا ہے۔ اور وہ بھی اپنے اس [مق]صد میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اگر حق کو مقصدی اور باطنی فتح نصیب [ہو]ئی تو اسی حد تک باطل کی فتح باطنی سے بھی انکار محال ہے!

اس صورت میں باطل کا پلہ حق کے مقابلہ میں یقیناً گراں معلوم ہوتا ہے، [اس] لئے کہ باطل کی فتح ظاہری تو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیجاتی ہے، [ا]ور باطنی فتح، یعنی اصولوں کی بقا، تو اس معاملہ میں حق اور باطل مساوی الرتبہ [نظ]ر آتے ہیں، حق کو تو صرف باطنی فتح کا مالک قرار دیا جاتا ہے لیکن باطل کو [ظا]ہری اور باطنی دونوں قسم کی فتح حاصل ہوتی نظر آتی ہے جس سے اس کا پلہ قطعاً [گر]اں ہو جاتا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ فتح میں ظاہری اور باطنی کا فلسفیانہ امتیاز ان لوگوں کو [م]طمئن کر سکتا ہے جو حقیقت کی دنیا سے دُور، خوابوں کی دنیا میں زندگی بسر [ک]رنے کے قائل ہوئے ہیں، لیکن عقیقت بلند اور صاحبِ فکر انسان اس تفریق پر [م]طمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک فتح صرف وہ ہے جو دیکھی اور پرکھی جاسکے [ج]س کے ثبوت کے لئے صرف واقعہ بیان کر دینا کافی ہو، فلسفہ کی امداد ضروری [نہ] ہو، جسے ایک عام آدمی بھی فتح قرار دے سکے، علماء کی نکتہ آرائیوں میں اس کا [و]جود تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو!

اگر باطنی، اصولی یا مقصدی فتح کے اس فلسفہ کو تسلیم کر لیا جائے جو آج بڑے [ش]د و مد سے بیان کیا جاتا ہے تو فتح مکہ کو جسے قرآن پاک نے فتح مبین قرار [دی]ا [ہ]ے صرف فتح ظاہر قرار دینا پڑے گا اور ابو سفیان کے لئے یہ دعوے کرنا [بھی] بجانب ہو گا کہ اس جنگ میں اسے "باطنی اور مقصدی فتح" نصیب ہوئی، [اس] لئے کہ بالآخر اس کی نسل نے اسلام کو اپنا کھلونا بنا کے دُنیائے عرب کی

فرمانروائی حاصل کر لی اور جن "اصولوں" کے لئے ابوسفیان جنگ کرتا رہا تھا وہ پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی دنیا پر غالب آ گئے! ـــــ ظاہر ہے کہ ابوسفیان کے اس دعوے کو کوئی سلیم العقل انسان ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا اور فتح مکہ کے فتح مبین ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، یہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ فتح باطنی دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی، اور یہ لفظ محض اس لئے تراش لیا گیا ہے کہ باطل کی فتح ظاہری کا اعلان و اعتراف کرنے سے جو ذہنی و روحانی کرب محسوس ہوتا تھا، اسے حق کی ایک خیالی فتح کے دل خوش کن تصور سے دور کر دیا جائے، اور اگر حق کی فتح مبین کا اعلان نہ کیا جا سکے، تو کم از کم پلہ مساوی ضرور کر دیا جائے!

واقعہ یہ ہے کہ حق اور باطل میں جب بھی تصادم ہوا تو حق کو ہمیشہ ظاہری فتح نصیب ہوئی ـــ فتح مبین! ـــ اور تاریخ پہ اگر ایک ذرا بھی گہری نظر ڈالی جائے تو اس واہمہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ ظاہری فتح باطل کو حاصل ہوا کرتی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ حق کی علمبرداری کے فرائض ہمیشہ انبیاء اور اوصیاء علیہم السلام نے انجام دیئے ہیں اور یہ وہ ذوات مقدسہ تھیں جو عقل و حکمت ربانی کی امین تھیں، ان کی عقل عام عقول بشری سے کہیں افضل اور ان کی حکمت و تدبیر عام انسانی فہم سے کہیں برتر تھی، ان کا ہر فعل عقل و حکمت پر مبنی ہوتا تھا، اس لئے وہ کسی ایسی جنگ کا آغاز نہیں کر سکتے تھے، جس کا انجام شکست ہو اس لئے کہ شکست اور ناکامی ـــ خواہ اسے فتح باطنی کہہ کے اس کی شان میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کیوں نہ کی جائے! ـــ کسی حالت میں اچھی چیز نہیں کہی جا سکتی، صاحبان عقل اسی وقت لڑتے ہیں جب وہ اپنی طاقت اور حریف کی قوت کا اندازہ لگا کے یہ یقین کر لیتے

ہیں کہ فتح کا سہرا انہیں کے سر رہے گا، اور دشمن لاکھ طاقتور نظر آئے لیکن ان کے مقابلہ میں ضرور مغلوب رہے گا۔ شکست کھانے کے لئے لڑنا نہ تو عقلمندی ہے اور نہ خیر، ایسی حالت میں علمبرداران حق، امنائے حکمت ربانی اور قدرت کے مقرر کردہ قائدین نسل انسانی کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسی لڑائیاں لڑیں جن میں شکست لازمی ہو یا کم از کم ایک عام انسان کو وہ مغلوب، مقہور نظر آئیں؟

اور باطل پرستوں کے زیر اثر مرتب کردہ تاریخیں خواہ کچھ کہیں لیکن حقیقت یہ ہے حق اور باطل سچ اور جھوٹ میں جب بھی ٹکراؤ ہوا ہے تو فتح مبین ہمیشہ حق پسندوں کے ہاتھ رہی ہے، باطل کو ہمیشہ ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور باطل کی فتح ظاہری کے جو افسانے مشہور کر دیئے گئے ہیں وہ پادر ہوا سے زیادہ نہیں ہیں!

قرآن پاک نے جو حقائق و معارف کا گنجینہ اور حکمت و بصیرت کا خزانہ ہے نسل انسانی کو اس حقیقت سے بڑے خوب صورت انداز میں روشناس کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

حق آیا اور باطل مٹا۔ بے شک باطل مٹنے والا ہے!

یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے پیش کیا ہے، لیکن افسوس کہ باطل کی ظاہری فتح کے غوغائے باطل نے ہماری نگاہیں اس حقیقت تک نہیں پہنچنے دیں اور حق کی جس فتح مبین کی جانب قرآن پاک نے ہمارے ذہنوں کو موڑنا چاہا تھا وہ ہماری نگاہوں سے آج تک روپوش ہے:

قرآن نے حق کی فتح کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انتہائی واقعیت پر مبنی ہے اور جن لوگوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس کلام

الٰہی کی تصدیق کرنے پر مجبور رہیں!

ہم اس سلسلہ میں چند تاریخی شواہد پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حق کو ہمیشہ ظاہری فتح نصیب ہوئی اور حق کبھی اس کا محتاج نہیں رہا کہ اس کی نام نہاد شکست پر باطنی فتح کا لیبل چسپاں کر کے اسے مرہونِ منت کیا جائے!

تاریخ انسانی میں حق اور باطل کا سب سے پہلا ٹکراؤ اس دن ہوا جس دن شیطان نے آدمؑ کی خلافت ظاہری کو چیلنج کیا، اُدھر آدم کے جسد خاکی میں نفخ روح ہوا، اِدھر معرکہ حق و باطل آراستہ ہوا، اور اس معرکہ کا جو انجام ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، آدم اور شیطان دونوں جنت سے نکلے لیکن اس عالم میں کہ شیطان کی گردن میں ابدی لعنت کا طوق اور اس کے سینہ پر "رجیم" کا تمغہ آویزاں تھا، اس کے برعکس آدمؑ کے فرقِ مبارک پر خلافت ارضی کا تاج جگمگا رہا تھا، دوش پر زرتاشے بکرامت جلوہ بار تھی، نبوت کی مہر انگشت مقدس کی زینت تھی، رسالت کا جلال جبین انور سے نمایاں تھا اور مسجودِ ملائکہ ہونے کا شرف آپ کی عظمت کا نقیب تھا —— اس ظاہری اختلاف سے قطع نظر بھی کر لیجئے، تب بھی اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ شیطان اپنے مقصد میں قطعاً ناکام رہا، ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا اور اس باب میں شیطان کا اعتراض بزم قدس میں تسلیم نہیں کیا گیا، اس کے برعکس آدم کامیاب رہے، مسجودِ ملک بھی قرار پائے، خلافت الٰہی کے امین بھی مقرر ہوئے اور زمین کی بادشاہت بھی ان کو حاصل ہو کے رہی —— یہ تھی حق کی فتح مبین، جس سے کسی صاحبِ عقل کے لئے انکار محال ہے!

حق اور باطل کا دوسرا ٹکراؤ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، ایک

١١٨٨٦

طرف اکیلے نوحؑ تھے اور دوسری جانب پوری قوم، ایک سمت انتہائی کمزور اقلیت اور دوسری طرف بے پناہ اکثریت، حق کا پرستار ایک، اور باطل کے شیدائی لاکھوں، لیکن نتیجہ کیا نکلا اس ٹکراؤ کا؟ ـــــ یہی کہ طوفان کی ایک موج نے باطل کا سفینہ غرق کر دیا اور کشتی نوح نجات و سلامتی کا مظہر قرار پا گئی، سارے باطل پرست نذر اجل ہو گئے اور دنیا پر حق پسندوں کا راج اس شان سے قائم ہوا کہ نوحؑ آج تک آدم ثانی کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں؛

اسے فتح مبین نہیں کہا جائے گا تو پھر اور کیا کہا جائے گا؟

حق اور باطل کا تیسرا ٹکراؤ سرزمین نینوا پر ہوا جہاں باطل کے پاس حکومت کا جلال بھی تھا، عساکر کا شکوہ بھی تھا، خزائن کی قوت بھی تھی، اکثریت کی طاقت بھی تھی، پجاریوں اور کاہنوں کے اثرات بھی تھے اور ان کے مقابلہ میں ایک تن تنہا حق پرست تھا، جو درانہ اور شیرانہ انداز میں باطل کو دعوت مبارزت دے رہا تھا، باطل کی انتہائی کاوش یہ تھی کہ حق کی آواز کچل دی جائے، اور حق ساری دنیا پر چھا جانے کے لئے مچل رہا تھا، مقابلہ ہوا، باطل کی قوتوں نے ابراہیم کے لئے آگ تیار کی، لیکن حق پر آنچ نہیں آنے پائی، نمرود کی خدائی حرف باطل کی طرح فنا ہو گئی اور ابراہیمؑ نے نہ صرف یہ کہ سرزمین نینوا پر توحید کا پرچم لہرا دیا بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی وحدانیت اور صداقت کے جھنڈے گاڑ دیئے، عربستان میں ان کے بڑے صاحبزادے اسمٰعیلؑ ان کی تحریک کے نقیب قرار پائے، شام میں اسحاقؑ نے ڈیرے ڈال دیئے اور سدوم میں لوطؑ ان کے مشن کے محافظ مقرر ہوئے، پورا جزیرہ نمائے عرب حق کی تحریک اور حق کی فتح کا مرکز بن گیا اور یہ مرکز

اس شان سے بنا کہ آج جبکہ نمرود اور اس کے ساتھیوں کا کوئی نشان سطح ارض پر موجود نہیں ہے ابراہیم کا تعمیر کیا ہوا مکان ان کی تحریک توحید کا سب سے تابناک اور درخشندہ نشانی تسلیم کیا جاتا ہے !

مصر کی سرزمین پر حق اور باطل میں جو تصادم ہوا وہ تاریخ انسانی میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، ایک طرف فرعون تھا اور حکومت کا طمطراق مصری قوم تھی اور اس کے ترقی یافتہ علوم و تمدن، سلطنت کا زعم تھا اور دولت کا غرور، اور دوسری سمت ایک کمبل پوش اور بوریہ نشین مجاہد حق تھا، جو ہر قسم کے ظاہری ساز و سامان سے معرا تھا، فرعون بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے اور اپنی ربوبیت تسلیم کرانے پر مصر تھا، اور موسیٰؑ بنی اسرائیل کو آزاد کرانے اور اس جھوٹی ربوبیت کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے، ٹکراؤ ہوا، اور انتہائی سخت ہوا، نمرود سے بڑھ کر فرعون کو ایک اور طاقت نصیب تھی اور وہ تھی علم اور سحر کی قوت، لیکن جسطرح ابراہیمؑ کے ہاتھوں نمرود کو شکست ہوئی اسی طرح موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعون غرق دریائے ضلالت ہوا، مصری سلطنت ختم ہو گئی اور سرزمین شام پر بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی حضرت موسیٰؑ کی یہ فتح مبین کسی "باطنی" پردہ کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کھلی ہوئی، ظاہر اور روشن فتح تھی ایسی فتح جو صرف حق کے لیے مقسوم ہے !

سرزمین فلسطین پر حق اور باطل میں ٹکراؤ ہوا۔ اب مقابلہ اور زیادہ سخت تھا، رومی سلطنت اور یہودی قوم، دونوں مسیحؑ کے مقابلہ میں صف آرا تھیں سلطنت، اکثریت، طاقت، دولت، علم، مذہب، غرض کیا تھا جو باطل کے قبضہ میں نہ تھا، اور اس کے مقابلہ میں تھا ایک کمزور اور تنہا،

اللہ کا سچا بندہ، ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا! ایک طرف تلوار تھی اور دوسری جانب محبت، نتیجہ جو کچھ ہوا وہ دنیا پر آشکار ہے، یہودی ذلیل ہوئے قیصر کی نسل مسیح پر ایمان لانے پر مجبور ہوئی اور خود مسیح کو یہ عزت و عظمت نصیب ہوئی کہ آج دنیا کے اسی کروڑ عیسائی اور پچاس کروڑ مسلمان ان کا نام سنتے ہی ادب کی گردنیں خم کر دیا کرتے ہیں!

فاران کی چوٹیوں سے حق کا آوازہ بلند ہوا تو پورے عرب میں ہلچل مچ گئی، قریش کی چمکتی تلواریں نیاموں سے ابل پڑیں، عرب سورماؤں کی تیوریوں پہ بل پڑ گئے، خیبر کے یہودی ہوں یا تبوک و نجران کے نصرانی مکہ کے بت پرست ہوں یا نجد کے صابئین، سب ایک مجاہد حق کے مقابلہ میں صف بستہ ہو گئے، مقابلہ ہوا اور بار بار ہوا، نتیجہ جو نکلا وہ قرآن کے الفاظ میں

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝

کی تصویر تھا، قریش کی تلواریں کند ہو گئیں، یہودیوں کی سازشیں ناکام ہو گئیں، دشمنوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پورا جزیرہ نمائے عرب توحید کے ان نعروں سے گونجنے لگا جن کی بازگشت سے آج سارا عالم گونج رہا ہے!

حق و باطل کے معرکوں کی یہ محض چند مثالیں ہیں جن میں سے ہر ایک میں حق کو فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ ایسی ہی اور دوسری سیکڑوں مثالیں انبیاء کے مجاہدات سے پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوگا کہ فتح مبین ہمیشہ حق کا مقسوم ہے اور ناکامی و نامرادی باطل کی تقدیر، لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، اس لئے کہ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمارا مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ حق و باطل کی کشمکش کے

سلسلہ میں ہمارے ذہنوں میں جو تصور بٹھا دیا گیا ہے، حق کی پاپالی اور باطل کی ظاہری سربلندی کا جو واہمہ ہمارے لئے شیطان نے تیار کر دیا ہے اور شیطنت والوہیت کے ٹکراؤ کے متعلق جو غلط فہمیاں عوام میں پیدا ہو گئی ہیں ان پر سے پردہ اٹھا دیا جائے اور اس حقیقت کو برافگندہ نقاب کر دیا جائے کہ

فتح مبین ہمیشہ حق کے ہاتھ رہتی ہے
باطل ہمیشہ مغلوب اور ناکام رہتا ہے

باطل کی ظاہری اور حق کی باطنی فتح دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی اس لئے کہ باطل کو دراصل کسی قسم کی فتح نصیب نہیں ہوتی، فتح صرف حق کو حاصل ہوتی ہے، اور یہ فتح اتنی کھلی ہوئی اور روشن ہوتی ہے کہ اس سے انکار ہر سلیم العقل انسان کے لئے محال ہے!

آلِ رسولؐ کا مجاہدۂ حق

حضرت سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی بابِ نبوت بند، وحی ربانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور انبیائے طاہرین کے شاندار مجاہدات حق کا دور اختتام تک پہنچا۔ —— لیکن شیطنت اور الوہیت کی جنگ ختم نہیں ہوئی، یہ جنگ جاری رہی اور آج بھی جاری ہے، اس لئے کہ شیطان نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی ہے اور حق کے مقابلہ میں اس کی سرگرمیاں آج بھی اسی زور شور سے جاری ہیں جس زور شور سے دورِ نبوت میں جاری تھیں!

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دنیا پر ایک عظیم احسان یہ ہے کہ آپ نے شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی آلِ پاک ہمارے درمیان چھوڑی، جس نے دورِ رسالت گذشتہ نبوت کے بعد حق کی قوتوں کی قیادت فرمائی اور جس کے فیوض و برکات و تعلیمات کی روشنی میں آج بھی حق کے پرستار شیطان اور اس کی قوتوں کا دلیرانہ مقابلہ کر رہے ہیں!

آلِ رسولؐ کے مجاہدات کی تاریخ انتہائی شاندار اور تابناک ہے لیکن ملتِ اسلامیہ کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان مجاہدات پر کبھی صحیح روشنی میں نگاہ نہیں ڈالی جاتی اور حق کی خاطر ان ذواتِ مقدسہ نے جو سعی و جہد فرمائی ہے اس پر دشمنوں کی تو خیر، دوستوں کی نگاہ بھی بہت کم جاتی ہے!

اس حقیقت کو سبھی بیان کرتے ہیں کہ چمنستانِ اسلام کی شادابی آلِ رسولؐ کی

مرہون کرم ہے، زلف ایمان کو اگر کسی نے سنوارا تو وہ یہی بزرگوار تھے، اور دین حنیف اگر آج زندہ ہے تو انہیں ذوات مقدسہ کے دم سے ، لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود آئمہ آل رسولؐ کے حالات کی تحقیق اور ان کے عظیم کارناموں کے متعلق تفکر و تعقل پر کوئی خاص توجہ نہیں دیجاتی، ان کی تحریک کو سمجھنے، ان کے انقلاب آفرین و فکر انگیز اقدامات کے صحیح اسباب وعلل کو معلوم کرنے اور تاریخ اسلام میں ان کے حقیقی کردار اور موقف کا پتہ چلانے پر کوئی توجہ نہیں دیجاتی، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی عظمت کے ہزاروں گوشے ایسے موجود ہیں جو آجتک پردہ خفا میں ہیں اور اسلامی تاریخ میں ان کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے اس پر عوام تو رہے الگ، خود خواص کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ سکی ہیں!

کیا ستم ہے کہ آل رسولؐ سے عشق و ارادت کا دعوے رکھنے والے بھی آل رسولؐ کے حالات پر غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی تلاش و تحقیق مناظرہ بازی سے آگے نہیں بڑھتی، یہی وجہ ہے کہ آئمہ اہل بیت کے متعلق اچھی اور عالمانہ تصانیف بہت کم بازار میں آتی ہیں اور جو کتابیں لکھی بھی جاتی ہیں ان میں وہی فرسودہ اور پامال باتیں ملتی ہیں جو اب تک ہزاروں مرتبہ کہی اور لکھی جا چکی ہیں ۔ ذہنی اور فکری انحطاط کا یہ دردناک نظارہ ہمارے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے اور اس کے نتیجہ میں خود مذہب اہلبیت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے!

چونکہ ذاکری کے نقطہ نظر سے اہلبیتؑ کو مظلوم، مقہور، پامال بے دست و پا، مجبور، بے بس اور ناکام ظاہر کرنا حد درجہ مفید ہے اور اس کے نتیجہ میں مجلس میں گریہ بھی خوب ہو جاتا ہے، اس لئے ہمارے واعظین آل رسولؐ کی زندگی کے

انہیں پہلوؤں کو ابھارتے اور اجاگر کرتے ہیں جن سے یہ ذوات مقدسہ زیادہ سے زیادہ ناکام، محروم، اور ستم رسیدہ معلوم ہوتی ہیں، دوسرے پہلوؤں پر نہ تو غور و فکر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور نہ زور بیان صرف کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ عوام میں یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ آل رسولؐ کی زندگی حسرت و نامرادی اور اشک و آہ کی ایک طولانی داستان ہے، مظلومی و پامالی درد انگیز اور الم آفرین کہانی ہے ایک افسانۂ ماتم، ایک تاریخ درد و غم ہے، اور اس اعتبار سے عوام کے لئے قطعاً ناقابل تقلید ہے اس لئے کہ انسان فطری طور پر نامرادی اور غم سے دور رہنا چاہتا ہے اور کسی ایسے انسان کی تاسی قبول نہیں کر سکتا جس کی زندگی ہمہ درد و ناکامی ہو، عوام جب یہ دیکھتے ہیں کہ آئمہ آل رسولؐ کو بہ جرم حق پرستی ہمیشہ ناکامی، تکلیف اور غم کا سابقہ رہا تو خود ان کا فطری جذبہ حق پرستی مضمحل ہو جاتا ہے اور ان کے دلوں میں لازمی طور پر یہ خیال ابھرتا ہے کہ حق پرستی کا نتیجہ ایک ناکام زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا — ظاہر ہے کہ عوام کی اکثریت ایک ناکام، شکست خوردہ اور پامال زندگی پر قناعت نہیں کر سکتی، چند اصولوں کی خاطر زندگی کی ہر نعمت کو خیر باد کہہ دینا، اور مرقع الم بن کے زندگی بسر کرنا چاہے فلسفیانہ طور پر کتنا ہی بلند تر اصول انسانیت ہو لیکن عوام کے لئے عملی چیز نہیں ہے، ایسی حالت میں جب آل رسولؐ کو ایک ناکام اور شکست خوردہ عنصر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ان کی تقلید و تاسی کا تصور ترک کر دیتے ہیں، چنانچہ عملاً یہی ہو رہا ہے اور ہمارے عوام کا کردار دن رات آل رسول کا ذکر سنتے رہنے کے باوجود جو کچھ ہے وہ ہمارے اس دعوے کا کھلا ہوا ثبوت ہے!

ہم یہ نہیں کہتے کہ آل رسولؐ کے مصائب نہ بیان کئے جائیں یا ان کی

مظلومی کی داستان میں کوئی کمی کر دیجائے اس لئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے آئمہ کے مصائب کا تذکرہ دراصل نسل انسانی کی معراج کا تذکرہ ہے اعلیٰ اقدار انسانی کا تذکرہ ہے، انسان کی اخلاقی و روحانی بلندی کا تذکرہ ہے اور اس کے نتیجہ میں حقانیت کا آفتاب اس شان سے چمکتا ہے کہ باطل کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں، آل رسولؐ کے مصائب کا ذکر صبر و تحمل، ایثار و فداکاری، خلوص و للہیت، شرافت و ضبط نفس اور سچی حق پرستی پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں احیائے دین ہوتا ہے، حقیقت اسلام جلوہ فگن ہوتی ہے رسول اللہؐ کے پیغام کی اشاعت ہوتی ہے اور آنسوؤں کے سیلاب میں سارے گناہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں آل رسولؐ کے مصائب ضرور بیان ہونا چاہئیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے مجاہدۂ دینی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیئے، کیونکہ ان سے بھی اہلبیت علیہم السلام کی سیرت کے بہت سے نقوش ابھرتے ہیں، اور حق و باطل کی اس کشمکش میں جو خود ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں جاری رہتی ہے، ہمیں ایک نیا عزم، ایک نئی ہمت، ایک نیا ولولہ جہاد اور استقامت علی الحق کا ایک نیا درس ملتا ہے ہمیں آل رسولؐ کی کامرانیوں کی داستان بھی عوام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے اس لئے کہ جہاد حق و باطل میں ان کی ہر فتح ہمارے لئے زندگی کا ایک نیا پیغام ہو گی، صبر و استقامت کا ایک نیا درس ہو گی، عزم و ہمت کی ایک نئی تعلیم ہو گی اور اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ حق پر مر مٹنے والے ہمیشہ کامران و بامراد ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی فتح مبین کا نمونہ ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں ان کی زندگی بھی کامیاب ہوتی ہے، اور ان کی موت بھی کامیاب، حقیقی عزت اور سربلندی انہیں کے لئے ہوتی ہے، ابدی

نعمتوں سے وہی سرفراز کئے جاتے ہیں اور جہاں آخرت میں ان کے مراتب اعلیٰ ہوتے ہیں، وہیں خود اس دنیا میں بھی سچی اور پائیدار فوز و فلاح انہیں کے حصے میں آتی ہے!

ہم مانتے ہیں کہ آلِ رسولؐ کی مقدس زندگیوں کا ایک حصہ مصائب و آلام میں بسر ہوا لیکن یہ مصائب ہی دراصل ان کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنے، دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر مقصد کے حصول کے لئے انسان کو سعی و جہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس سعی و جہد کے دوران میں اسے مصائب اور تکالیف سے گذرنا پڑتا ہے، کوئی مقصد بغیر تکلیف و سعی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مقصد جتنا بلند ہوتا ہے مراد جتنی اعلیٰ ہوتی ہے، مطلوب جتنا گرانقدر ہوتا ہے محنت اور تکلیف بھی اسی درجہ کی ضروری ہوا کرتی ہے، آلِ رسولؐ کے مقاصد انتہائی بلند تھے اس لئے لازماً ان کو عظیم مصائب اور صبر آزما تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کی قربانیاں رائیگاں گئیں، ان کے مصائب بے نتیجہ ثابت ہوئے؟ ان کی محنت و تکلیف بے سود تھی، اور وہ ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوئے جن کے لئے ان کو قربانیاں پیش کرنا پڑ رہی تھیں؟ ---

ظاہر ہے کہ اس قسم کا دعوئے کرنے کی کسی کو مجال نہیں ہو سکتی، اس لئے ہمیں یہ مان لینا چاہیئے، کہ جہاں آلِ رسولؐ کو عظیم ترین مصائب کا سامنا ہوا وہیں انہوں نے عظیم ترین کامیابیاں بھی حاصل کیں ——— بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ آلِ رسولؐ کی حقیقی عظمت بھی اسی چیز میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے عظیم مقاصد کے لئے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ اور بالآخر ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوئے، جن کا حصول ان ناسازگار حالات اور اس بہت تنگ ماحول میں بڑے سے بڑے انسان سے بھی ممکن نہیں تھا!

میرا شکوہ بس اتنا ہے کہ ہمارے واعظین جہاں آلِ رسولؐ کے مصائب بیان کرتے ہیں وہیں وہ ان عظیم کامرانیوں پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں جو ان صبر آزما تکالیف کے نتیجہ میں اہلبیت کو نصیب ہوئیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جب آئمہ آلِ رسولؐ جہادِ حق میں عظیم ترین قربانیاں پیش کرتے رہنے کے باوجود حسرت و نامرادی کا شکار رہے۔ تو پھر عام انسان اس مجاہدہ میں شمولیت اختیار کر کے کون سی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ —— اس سوال کا عزم حق پرستی مضمحل اور ان کی ہمت شکستہ ہو جاتی ہے اور وہ اس جہادِ حق میں جرأت مندانہ طریقہ پر حصہ لینے سے گریز کرنے لگتے ہیں جس پر دین کی بقا، انسانیت کی فلاح، ملت کے ارتقاد، اور دنیا کے فوز و فلاح کا انحصار ہے، اس کے برعکس اگر آلِ رسولؐ کے مصائب کے تذکرہ کے ساتھ ہی ان کی کامرانیوں اور فتح مندیوں کا ذکر بھی جاری رہے تو اس سے عوام میں حق پر مر مٹنے کا عزم تازہ ہو گا۔ اور وہ حق کی خاطر قربانیوں کا عظیم اور پیش قرار انجام جان لینے کے بعد خود ہر قربانی پیش کرنے پر آمادہ نظر آئیں گے —— یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے آئمہ اسی حکمت ربانی کے امین اور اسی تدبیر الٰہی کے حامل تھے، جو انبیاء کی ذواتِ مقدسہ میں جلوہ گر رہی، یہی وجہ ہے کہ جس طرح انبیاءؑ نے حق و باطل کے ہر معرکہ میں فتح مبین حاصل کی، اسی طرح آئمہ آلِ رسولؐ نے بھی ہر ٹکراؤ میں مکمل فتح حاصل فرمائی، وہ حق کے جیتے جاگتے پیکر بلکہ مجسم حق تھے، اور حق کو بہ نصِ قرآنی ہمیشہ فتح نصیب ہوتی ہے اس لئے ان کو بھی ہمیشہ فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کامیابیوں کی مفصل روئداد دنیا کے سامنے پیش کی جائے، اور ان حق نما حضرات کی سعی و جہد کی ایک مکمل تصویر عوام کے سامنے لائی جائے لیکن یہ کام بہر حال علماء کا ہے، اور وہی اسے کما حقہٗ انجام دے سکتے ہیں، راقم الحروف نہ تو عالم ہے اور نہ اس عظیم موضوع پر قلم اٹھانے کا اہل۔ اس کا مقصد اس مقالہ سے صرف اتنا ہے کہ ارباب ملت کو آلِ رسولؐ کی سیرت طیبہ پر ایک نئے زاویہ اور ایک نئے نقطہ نظر سے غور کرنے کی دعوت دیدے اور بس —— اور اگر وہ اپنی اس کاوش میں کچھ بھی کامیاب ہو گیا تو اس کو اپنے لئے سرمایۂ نجات تصور کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے گا۔

اسلام ـــــ ایک انقلابی تحریک

اسلام کے علاوہ سارے مذاہب چند عقائد و عبادات اور چند مراسم اور اخلاقی ضابطوں کا مجموعہ ہیں۔ پیغمبر اسلام روحی لہ الفدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل ساری دُنیا میں یہ تصوّر عام تھا کہ مذہب چند عقائد اور چند مراسم کا نام ہوا کرتا ہے اور جو شخص ان عقائد پر ایمان رکھتا ہے اور چند مراسم انجام دے لیتا ہے وہ پکا مذہبی آدمی ہوتا ہے۔ اپنی عملی زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو مذہب کی گرفت سے آزاد تصوّر کیا جاتا تھا، سیاست، معاش، تعلیم، تہذیب، اور تمدن وغیرہ سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان امور میں ہر شخص خود اپنے پسندیدہ تصوّرات کی پیروی کے لئے آزاد تھا۔

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذہب کے نام سے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی وہ اس سے بالکل مختلف تھی، ـــــ آپ نے جہاں دُنیا کے سامنے چند عقائد و عبادات پیش فرمائے وہیں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک مکمل

قانون بھی پیش فرمایا۔ اور اس "آزادی" کو بالکل سلب کر لیا جو انسانوں کو حاصل تھی، آپ نے دین کے نام پر دراصل ایک عظیم انقلابی تحریک کا آغاز فرمایا ایسی انقلابی تحریک جو ماضی کے تمام آثار باطلہ کو مٹا کے حیات انسانی کو نئی اور اعلےٰ اخلاقی و روحانی اقدار پر منظم کرنا چاہتی تھی، جو سیاست معاش اور تمدن کے ہر شعبہ پر حاوی تھی اور ان میں سے ہر معاملہ میں انقلاب آفریں اصلاحات وجود میں لانا چاہتی تھی، جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو نظام الٰہی کے مطابق استوار کرنا چاہتی تھی، جو انسانی حاکمیت کے ملعون تصور کو ختم کر کے زمین پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنا چاہتی تھی، اور جو ایک ایسی اخلاقی، روحانی اور ذہنی فضا پیدا کرنا چاہتی تھی، جس میں انسان منشائے الٰہی کے مطابق وہ تمام ترقیاں حاصل کر سکے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کے شایان شان کہی جا سکتی ہیں۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عظیم روحانی انقلابی تحریک کے حقیقی قائد اعظم تھے، آپ نے یہ تحریک شروع فرمائی تو جس شخص نے سب سے پہلے اس تحریک کو اس کے سارے عناصر و مضمرات کے ساتھ قبول کیا اور اسے پروان چڑھانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینے کا وعدہ کیا وہ ایک نوجوان تھا ــــــ علیؑ مرتضیٰ!

اس بلند فطرت، بلند حوصلہ، بلند ہمت اور بلند نظر نوجوان نے جسکی فطرت میں شبنم کی لطافت اور سنگ و آہن کی صلابت ایک ساتھ سموئی ہوئی تھی، اسلامی تحریک کے قائد اعظم کی آغوش میں تربیت پائی تھی اس لئے وہ اپنے قائد کے افکار و نظریات سے کماحقہٗ آگاہی رکھتا تھا، اسے معلوم تھا کہ اس کا قائد اس وقت کے مروجہ نظام کے کن اجزا سے

اختلاف رکھتا ہے اور حصول کامیابی کے بعد کس قسم کا نظام نو قائم کرنا چاہتا ہے، وہ اس تحریک کے سارے خدو خال جانتا تھا، اور اپنے قائد کی مزاجی ساخت کو بھی خوب پہچانتا تھا، اسے معلوم تھا کہ کس قسم کے حالات میں اس کا قائد کیا طرزِ عمل اختیار کرے گا، اس نے اپنے قائد کے مزاج اس کے طریق کار، اس کے انداز فکر، اور اس کی سیرت کے سارے نقوش کی اشاعت کو اپنے قلب و روح کا جزو بنا لیا تھا، اور اسے اس تحریک سے اتنی گہری دلچسپی، اتنا والہانہ عشق اور ایسی سچی محبت ہو گئی تھی کہ وہ جیتا تھا تو اس تحریک کی کامیابی کے لئے اور مرنا چاہتا تھا تو اس کی بقا کے لئے یہ تحریک اس کے جسم و جان کا ایک جزو بن چکی تھی، اس کی ہر سانس اس عظیم تحریک کے لئے وقف تھی، اور وہ اس کی کامیابی کے لئے اپنے قائد کے اشارہ پر دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے پر تیار رہتا،

تحریک اسلامی کا قائد اعظم بھی اس حقیقت کو خوب جانتا تھا اُسے اس نوجوان کی عظیم صلاحیتوں اور اس کی اعلیٰ فطری استعدادوں کا بھی خوب احساس تھا، وہ اپنے شریک نور کے جذبہ فدا کاری، خلوص اور مستقل مزاجی سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھا، اسے یقین تھا کہ یہی نوجوان آگے چل کے اس کے مشن کو کامیاب بنائے گا اس لئے کہ ———

جہاں تک اس تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا تعلق ہے، یہ نوجوان ایک بے مثل عالم، ایک بے نظیر حکیم، ایک عدیم المثال خطیب، ایک بلند پایہ انشا پرداز، اور ایک بے پناہ معلم اخلاق و روحانیت کی حیثیت سے قطعًا اس کا اہل ہے کہ وہ اس تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کرے!

جہاں تک اس تحریک کو دشمنوں کے مقابلہ سے بچانے اور مخالفین کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کا تعلق ہے، یہ نوجوان ایک عدیم النظیر جرنیل اور ایک مافوق الفطرت سپاہی کی حیثیت سے اس کی پوری اہلیّت رکھتا ہے کہ تحریک کی مدافعت کی ذمہ داریاں اسی کے سپرد کی جائیں

اور

جہاں تک اس تحریک کے پھیلاؤ اور اس کی بقا کا تعلق ہے اس نوجوان میں ایثار، قربانی، فداکاری اور جانسپاری کے وہ جوہر موجود ہیں کہ وہ اپنا اور اپنے گھرانے کا خون دیکر بھی اس تحریک کی جڑوں کو مستحکم اور اس کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کر سکتا ہے!

پیغمبر اسلام نے اپنی تحریک کا آغاز ایک دعوت سے کیا جسے تاریخ اسلام میں دعوت ذوالعشیرہ کہا جاتا ہے۔ اس دعوت میں مکّہ کے تمام اکابر موجود تھے، پیغمبرؐ نے ہاشمی سرداروں کے سامنے اپنی تحریک پیش کی تو بزم میں سناٹا چھاگیا، چہروں پر وحشت برسنے لگی، اور پیغمبرؐ کی تقریر کا جواب ایک طویل خاموشی سے دیا گیا۔ اس طلسم سکوت کو جس شخص نے توڑا وہ یہی نوجوان تھا، جس نے بڑے شیرانہ انداز میں انتہائی بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعاظم قریش کے سامنے بڑی صفائی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ وہ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں جان کی بازی لگا دیگا، اور بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس عظیم روحانی تحریک کو آگے بڑھانے میں پوری پوری مدد دے گا!

پیغمبرؐ اسلام نے بھی سچی قدر شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بزم میں علیؑ کو اپنا وصی، وزیر اور خلیفہ مقرر کر دیا، اس لئے کہ آپ یہ جانتے تھے کہ اسلامی انقلاب سے جو گہری شیفتگی، جو سچی ارادت علیؑ کو ہے، نیز جو اعلیٰ قائدانہ صلاحیتیں علیؑ میں موجود ہیں وہ کسی دوسرے انسان میں ممکن نہیں ہیں، آپ کا یہ تاریخی اعلان دراصل ایک مہر توثیق تھی جو علیؑ کی قیادت پر اس وقت ثبت کی جا رہی تھی جب علیؑ کی حیثیت ایک کمسن بچہ سے زیادہ نہیں تھی، اس سے جہاں علیؑ کی بے پناہ عظمت ہمارے سامنے آتی ہے وہیں پیغمبرؐ اسلام کی مردم شناسی کا بھی یہ اعلیٰ نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ فگن ہوتا ہے کہ آپ ایک دس بارہ سال کے بچہ کو دیکھ کر اس کے مستقبل کا کیسا صحیح اندازہ فرما جاتے تھے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کی جن عظیم صلاحیتوں کی جانب دعوت عشیرہ میں اشارہ فرمایا تھا وہ دورِ رسالت میں پورے شباب کیساتھ جلوہ افگن ہوئیں، دنیا نے دیکھا کہ علیؑ اتنے بڑے عالم ہیں کہ نبیؐ ان کے باب ہیں مدینۃ العلم ہونے کا اعلان کر رہے ہیں، اتنے عادل ہیں کہ اَقضَاکُمْ عَلِیٌّ کا فرمان صادر ہو رہا ہے، اتنے بڑے مبلغ ہیں کہ پورا یمن ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر رہا ہے، اتنے سرفروش ہیں کہ عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں صف آرا ہیں، اتنے بہادر ہیں کہ عرب کا بڑے سے بڑا سورما ان کے نام سے کانپ رہا ہے، دعوت تحریک میں اتنے پیش پیش ہیں کہ سورہ برأت کی تبلیغ انہیں سے متعلق ہے، اتنے جانسپار ہیں کہ اپنے قائد کی جان بچانے کے لئے شب ہجرت چار سو ننگی تلواروں کے سائے میں آرام کر رہے ہیں۔ اور تحریکِ اسلامی کے سارے رموز کے اتنے عالم

ہیں کہ پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کی نگاہیں انہیں کی جانب اٹھتی ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اسلامی تحریک سے سچی دلچسپی رکھتے تھے وہ رسولؐ کی زندگی ہی میں علیؑ کو مستقبل کا قائد اور پیغمبرؐ کا جانشین تسلیم کرنے لگے تھے، سلمان، ابوذر، عمار اور مقداد وغیرہ اسی مکتبِ خیال کے افراد تھے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بزرگوار اسلامی تحریک انقلاب کے سچے فدائی، حقیقی پرستار اور صفِ اوّل کے رُکن نہیں تھے!

اسلامی تحریک آگے بڑھی تو دنیا کی ہر انقلابی، عوامی، اور عظیم تحریک کی طرح اس تحریک میں بھی ہر قسم کے لوگ شامل ہو گئے، ذاتی صفات سے قطع نظر اجتماعی طور پر ہم ان لوگوں کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں!

(۱) پہلا طبقہ ان سچے انقلابیوں پر مشتمل تھا جو پرانے غیر الٰہی اور جاہلی نظام کو مٹا کے اس کی جگہ پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات کے مطابق وہ نیا نظامِ زندگی قائم کرنے کے خواہش مند تھے، جسے الٰہی یا اسلامی نظامِ زندگی کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے!

(۲) دوسرا طبقہ وہ تھا جو پرانے جاہلی نظام سے نفرت رکھتا تھا اس لئے جہاں تک اس نظام کے مٹا دینے کا تعلق تھا وہ پورے جوش اور ولولہ کے ساتھ پیغمبرؐ کے ساتھ رہا ——— رہا اس جاہلی نظام کی جگہ ایک نیا اور صالح نظام قائم کرنے کا سوال، تو اس طبقہ کو اس معاملہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، انصار کا بڑا حصہ اسی طبقہ سے متعلق تھا، چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں تک پرانے نظام کو مٹا دینے کا سوال تھا، انصار ہمیشہ سرفروشی کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی آنکھ بند ہوتے ہی جب نئے نظام کی صورت مرتب کرنے کا سوال ابھرا تو انصار گھروں میں بیٹھ رہے، اور خلافت اسلامی کا سوال صرف مہاجرین بلکہ قریش کی مرضی پر منحصر ہو گیا!

(۳) تیسرا طبقہ مفاد پسندوں (OPPORTUNISTS) کا تھا جنہیں نہ پرانے نظام سے پرخاش تھی نہ نئے نظام سے دلچسپی، ان کو بس اپنی فکر تھی، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک ضرور کامیاب ہو گی، اس لئے وہ اس تحریک سے وابستہ ہو کر اپنے لئے ایک روشن مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے تھے، مہاجرین قریش کی اکثریت اسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھی،

(۴) اور چوتھا طبقہ ان رجعت پسندوں (REACTIONARIES) کا تھا جو اس انقلاب کی کامیابی سے حد درجہ خائف و ترساں تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ انقلاب پسندوں کی صفوں میں شریک ہو کر اندر ہی اندر اس تحریک کو برباد کر دیں!

اوّل الذکر طبقہ کے راس و رئیس حضرت علی مرتضیٰؑ تھے اور اس طبقہ میں وہ صحابہ شامل تھے جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے تاریخ اسلام کو انتہائی شاندار اور تابناک بنا دیا ہے، سلمان و ابوذر اسی مومنین خالصین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، مقداد، عمار یاسر، ابی ابن کعب، حذیفہ یمانی، جابر بن عبداللہ، مالک بن نویرہ، خزیمہ بن ثابت، بلال حبشی، ابوایوب انصاری، اور دوسرے سیکڑوں صحابہ کے نام اس زرّین فہرست میں شامل ہیں، یہ وہ حضرات تھے جن کے سامنے اس انقلاب کی ایک جامع اور مکمل تصویر موجود تھی جو پیغمبر اسلام کا منشاء و مقصود تھا،

اور وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قربانی پیش کرنے پر تیار تھے، وہ نظام کہن کو مٹانا بھی چاہتے تھے اور نظام نو قائم کرنے کے بھی آرزومند تھے، وہ ایک منزل پر تخریب چاہتے تھے، اور دوسرے موقع پر تعمیر ——

تخریب نظام کہن کیلئے چونکہ تلوار کی ضرورت تھی اس لئے وہ میدان جنگ میں شمشیر بکف نظر آئے، اور قیام نظام نو کے لئے چونکہ تبلیغ و اشاعت کی ضرورت تھی اس لئے بعد رسولؐ یہی حضرات جو ساری دنیا سے اپنی تلواروں کی کاٹ اور اپنے بازوؤں کی قوت منوا چکے تھے، پرامن اور خاموش تبلیغ میں مصروف ہو گئے!

دوسرا طبقہ زیادہ تر انصار مدینہ اور چند مہاجرین پر مشتمل تھا، یہ لوگ نظام کہن کو ختم کرنے کی حد تک تو بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن جیسے ہی نظام نو کے قیام کا سوال پیدا ہوا، ان کا سارا جوش جہاد اور عزم انقلاب سرد پڑ گیا، خلافت کے نام پر جو نظام بھی ان کے سر تھوپ دیا گیا اسے انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا، انہیں نہ اس سے دلچسپی تھی کہ خلیفہ کون مقرر ہو رہا ہے اور نہ اس سے بحث تھی کہ اس سلسلہ میں کون سے اصول وضع ہو رہے ہیں؟ اجماع کا فیصلہ ہوا تو ان کو قبول، نامزدگی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو ان کو منظور، شوریٰ کی ٹھہری تو وہ راضی، غرض ان کی نہ تو اپنی کوئی رائے تھی، نہ کوئی اصول تھا نہ کوئی مقررہ راہ عمل تھی، جو کچھ "چند بڑے" کہہ دیتے تھے اکابر قریش کا جو فیصلہ ہو جاتا تھا، یہ اسے مان لیتے تھے، ان کو نئے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کے دلوں سے زندگی، ان کے خون سے حرارت اور ان کے قلوب سے گرمی بالکل ختم ہو چکی ہے، عہد رسالتؐ میں

یہی لوگ تھے جنہوں نے کفار قریش اور یہودیوں کے دانت کھٹے کرا دیئے تھے، لیکن بعد رسولؐ یہ طبقہ اسلامی سیاست میں ایک ایسا مفلوج، بے حس اور بے جان عنصر بن گیا تھا جس کا تصور بھی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا طبقہ مفاد پسندوں کا تھا، ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ جب نظام کہن کے خلاف میدان جہاد آراستہ ہوتا تھا تو یہ فرار پر فرار کرتے تھے، اور جب سکون کی فضا ہوتی تھی تو نظام نو میں اپنے لئے مناسب جگہ پیدا کرنے کے جوڑ توڑ میں مصروف رہتے تھے، رسول اللہ مکہ میں تھے تو یہ حضرات جہاں ایک طرف پیغمبرؐ کے پہلو میں نظر آتے تھے وہیں دوسری طرف کفار سے بھی میل جول رکھتے تھے، رسولؐ شعب ابوطالبؑ میں نظربندی کے شدائد جھیلتے رہے، اور یہ کفار مکہ کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہے، رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو یہ حضرات وہاں بھی جلوہ فرما ہو گئے، تاکہ فتوحات ملکی اور مال غنیمت میں حصہ بٹا سکیں، ان کو نہ انقلاب سے دلچسپی تھی اور نہ اس کے اصولوں سے محبت، ان کی دلچسپی کا مرکز صرف ان کی ذات تھی اور وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے انقلاب کے اہم اور بنیادی اصولوں کو بھی قربان کر سکتے تھے، اپنے ذاتی فائدہ کے لئے پرانے نظام کے شیدائیوں اور انقلاب دشمنوں سے بھی دوستی کر سکتے تھے، اور حصول مقصد کے لئے ہر قسم کے جوڑ توڑ سے کام لے سکتے تھے، یہی وہ طبقہ تھا جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی برسر اقتدار آ گیا، اور چونکہ اسے اپنے اقتدار کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون درکار تھا، اس لئے اس نے اسلامی تحریک کے اس سب سے بڑے دشمن ابوسفیان سے بھی دوستی کر لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جس کی انقلاب دشمنی پر بدر و اُحد کے معرکے گواہ ہیں۔

یہ طبقہ اکابر قریش پر مشتمل تھا، اور ہمیں یہ سن کے تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ اس میں اکثریت مہاجرین کی تھی:

یہ تھا طبقہ ان مشرکین پر مشتمل تھا جو پہلے تو پیغمبرؐ اسلام کے مقابلہ میں تیغ و سناں کی تمام قوتیں استعمال کرتے رہے لیکن جب فتح مکہ نے ان کی کمر توڑ دی، پورے عربستان پہ اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور ان کی فتح کی امیدیں یاس و ناکامی میں تبدیل ہو گئیں تو اپنی جنگ کا رُخ موڑنے اور کھلم کھلا جنگ کے بجائے اسلام کا لبادہ اوڑھ کے تحریک اسلام کو اندر اندر سے کھوکھلا کرنے پر تیار ہو گئے، ان لوگوں نے بظاہر تو اسلام قبول کر لیا تھا لیکن بباطن یہ اسی جاہلی نظام کے پرستار تھے جس کے لئے وہ ——— آگ اور خون کا کھیل کھیل چکے تھے، مسلمان بننے سے ان کا مقصد بس اتنا تھا کہ انقلابیوں کی صفوں میں داخل ہو کر ان کا شیرازہ درہم برہم کر دیا جائے، ان کا نظم برباد کر دیا جائے، اور موقع ملتے ہی اسلام کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے، وہ جنگ میں مسلمانوں سے ہار چکے تھے، مکر و فریب، سازش، اندرونی بغاوتوں اور داخلی انتشار کا سہارا لے کر مسلمانوں کو مات دینا چاہتے تھے ——— لیکن یہ کھیل آسان نہیں تھا، اس میں شدید احتیاط کی ضرورت تھی، اور مسلمانوں کی جمی ہوئی طاقت پر اچانک حملہ کر دینے میں شدید خطرات کا سامنا ہو سکتا تھا اس لئے یہ طبقہ وفاتِ رسولؐ تک بالکل خاموش رہا لیکن پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی جیسے ہی حالات بدلے، اس نے اپنے مقاصد کے حصول کی جد و جہد شروع کر دی ——— اس کے سامنے اس وقت حصولِ مقصد کی دو ہی راہیں ہو سکتی تھیں ———

(۱) وہ ایک تو یہ کہ برسر اقتدار طبقہ کو جو مفاد پسندوں پر مشتمل تھا، سچے انقلابیوں کے مقابلہ میں صف آرا کر دیں، اور اس طرح مدینہ میں خانہ جنگی چھڑ جائے اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ اسلامی تحریک کے سچے شیدائی اور پیغمبر آخر الزماںؐ کے انقلابی تصورات کے اصلی امین قتل ہو جاتے اور اس طرح اس انقلاب کا خاتمہ ہو جاتا جو حضرت سرور کائناتؐ وجود میں لانا چاہتے تھے،

(۲) اور دوسرے یہ کہ اگر خانہ جنگی نہ کرائی جا سکے تو مفاد پرستوں سے دوستی اور مفاہمت کر کے رفتہ رفتہ خود اپنی طاقت اتنی بڑھالی جائے کہ بالآخر اقتدار حکومت اسی طبقہ کے ہاتھوں میں آجائے اور پھر وہ سچے انقلابیوں کو کچل کے دوبارہ اپنا پسندیدہ نظام جاہلیت قائم کر دے۔

اس طبقہ کا سرغنہ ابوسفیان تھا۔

رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ابوسفیان نے یہ کوشش شروع کر دی کہ انقلاب اسلامی کے علمبرداروں اور ان کے حریف مفاد پرستوں میں جنگ چھڑ جائے۔ ایک طرف علیؑ اور ان کے ساتھی ہوں اور دوسری طرف خلافت کے مسند نشین، مسلمان آپس میں لڑیں۔ اور اس رجعت پسند طبقہ کی تمنا پوری ہو جائے جو نفاق کی ردائیں اوڑھے اسلام کی بربادی کی تمنائیں کر رہا تھا! —— ابوسفیان جانتا تھا کہ علیؑ اور ان کے ساتھی، جو نظام جاہلی کے سب سے بڑے دشمن اور تحریک انقلاب اسلامی کے سچے شیدائی تھے، اقلیت میں تھے، اس لئے اگر جنگ ہوتی تو یہ سب لوگ مارے جاتے اور اس طرح انقلاب اسلامی کا ہر نقش دنیا سے فنا ہو جاتا، رہ جاتے مفاد پرست طبقہ کے لوگ، تو ان کے متعلق ابوسفیان کو یقین تھا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لئے کوئی لگن نہیں ہے اس لئے اگر سچے انقلابیوں کا خاتمہ ہو گیا تو یہ طبقہ خود ہی کچھ عرصہ کے بعد جاہلی نظام کی طرف واپس ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں وقت کی بہترین سیاست یہ تھی کہ نام نہاد مفاد پرست مسلمانوں کے ذریعہ سچے مسلمانوں کا خاتمہ کرا دیا جائے، چنانچہ اس نے خلافت کا فیصلہ ہوتے ہی حضرت علیؑ کو ٹٹولا، ان کو اپنی امداد کا یقین دلایا۔ مدینہ کو لشکروں سے پاٹ دینے کا سبز باغ دکھایا۔ اور یہ چاہا کہ علیؑ حاکم وقت کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں۔ یہ ایک خوب صورت کھیل تھا، سچے مسلمانوں کو مفاد پرست مسلمانوں سے پٹوا دینے کا۔ لیکن بنو امیہ کے سردار کی یہ چال ناکام ہوئی۔

امیرالمومنینؑ نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے ابوسفیان کو دھتکار دیا۔ اور انقلاب اسلامی کے سچے پرستاروں کو قتل کرا دینے کی یہ شیطانی سازش ناکام بنا دی گئی۔ وفات سرورِ کائناتؐ کے بعد الٰہی اور شیطانی قوتوں کا یہ پہلا ٹکراؤ تھا جس میں حق کامیاب ہوا۔ اور باطل ناکام، بنی امیہ کی شیطانی چال ناکام ہوئی اور تحریک اسلامی کا علمبردار کامیاب، سچے مسلمانوں کو قتل کرا دینے کی مکروہ سازش ناکام بنا دی گئی، اور ان لوگوں کو موت کے چنگل سے بچا لیا گیا جن کے سہارے آئندہ دنیا کو دعوتِ اسلام سے روشناس کرایا جا سکتا تھا!

رجعت پسند طبقہ جب اس سازش میں ناکام رہا تو اس نے دوسری راہ اختیار کی، اب وہ مفاد پسندوں کی جانب مائل ہوا۔ تاکہ ان کی طاقت اتنی مضبوط کر دی جائے کہ سچے انقلاب پسند اور نظامِ الٰہی کے داعی برسرِ اقتدار نہ آ سکیں۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ ایوانِ حکومت میں داخل ہو کر خود اپنی طاقت مستحکم کر لی جائے اور موقع ملتے ہی مفاد پرست مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کے حکومت پر قبضہ کر لیا جائے رجعت پسند طبقہ یہ یقین رکھتا تھا کہ اگر حکومت اس کے ہاتھوں میں آ گئی تو وہ انقلابِ اسلامی کا قلع قمع کر دیگا۔ اور دنیا سے اسلام کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ اور حکومت حاصل کرنے کی واحد تدبیر اس کے نزدیک یہی تھی کہ حکمران طبقہ کو اپنے تعاون کا یقین دلا کے اس کا اعتماد حاصل کر لیا جائے، وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اس نے برسرِ اقتدار طبقہ کے مقابلہ میں سر اٹھایا اور وفاتِ رسولؐ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کی راہ اختیار کی تو سارے مسلمان اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور مفاد پسند طبقہ اپنے اقتدار کی بقا کے لئے سچے انقلابیوں اور نظامِ کہن کے دشمنوں کا تعاون حاصل کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رجعت پسند اور اسلام دشمن عناصر کچل ڈالے جائیں گے، اور سچے مسلمان

جن کو مفاد پسندوں نے پس پشت ڈال دیا تھا، دوبارہ اسلامی سیاست میں نمایاں ہو جائیں گے، ابوسفیان اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ مسلمانوں کو اس پہ یا اس کے اسلام پہ اعتماد نہیں ہے اور اس کی سابقہ روش کے نتیجہ میں عام مسلمانوں میں اس کیخلاف ایک نفرت موجود ہے ایسی حالت میں وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے بغاوت کی راہ اختیار کی اور کھلم کھلا اسلام پر ضرب عائد کرنا چاہی تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی بیداری کی شکل میں برآمد ہوگا۔ اور یہ چیز اس کے مقاصد کے خلاف تھی اس لئے اس نے حکمران طبقہ کو اپنے تعاون کا یقین دلانا شروع کر دیا تاکہ

(۱) مفاد پسند طبقہ رجعت پسندوں کی مدد سے اتنا طاقتور ہو جائے، کہ سچے مسلمان اسکے مقابلہ میں بے بس ہو جائیں۔

(۲) عام مسلمان رجعت پسندوں کی جانب سے غافل ہو کر جمود اور بے حسی کا شکار ہو جائیں۔ اور ان میں سرکار دو عالمؐ نے نظام کہن کے خلاف جو جذبۂ جہاد بیدار کر دیا تھا وہ رفتہ رفتہ فنا ہو جائے۔

(۳) اور ایوانِ حکومت میں داخل ہو کر اپنی طاقت اتنی مستحکم کر لی جائے کہ وقت آنے پر سلطنتِ اسلامی کا تختہ الٹ کے عربستان پر دوبارہ اسلام دشمن طاقتوں کا قبضہ کرا دیا جائے!

ابوسفیان اپنی اس چال میں کامیاب رہا، مفاد پسند حکمران چونکہ خود خوفزدہ تھے اور ان کے دلوں میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں سچے انقلاب پسند علیؑ کے پرچم تلے متحد ہو کر ان کی بساطِ حکومت نہ الٹ دیں اس لئے انہوں نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کی پوری پذیرائی کی، ابوسفیان کے بیٹے کو شام کی گورنری دیدی گئی، اور اس طرح گویا رجعت پسند عناصر کو "خرید" لیا گیا، لیکن حکمران اکابر قریش کے مقابلہ میں ابوسفیان کہیں زیادہ دانشمند اور بساطِ سیاست کا تجربہ کار کھلاڑی تھا، اکابر قریش اس خیال میں

تھے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی شام کی گورنری پر مطمئن ہو جائیں گے اور پھر وہ ہمیشہ سلطنت کے وفادار رہیں گے، ان کی مدد سے مہاجرین قریش ہمیشہ عربی مملکت پر راج کرتے رہیں گے لیکن ابوسفیان کی تدبیر دوسری تھی، وہ ایوان حکومت میں اس لئے نہیں داخل ہو رہا تھا کہ بنی تمیم اور بنی عدی کی غلامی کرتا رہے اور اپنی طاقتیں انکے استحکام پر صرف کرتا رہے، بلکہ اس لئے داخل ہو رہا تھا کہ رفتہ رفتہ حکمران اکابر قریش کی طاقت کو اندر سے کھوکھلا کر کے خود سلطنت اسلامی پر قابض ہو جائے، یہ صرف غرض کی دوستی تھی جس میں مفاد پسند اور رجعت پسند دونوں اس لئے ایک ساتھ نظر آرہے تھے کہ اپنی اپنی غرض کی تکمیل کرلیں۔ اس سیاسی کھیل میں فتح بالآخر ابوسفیان کو نصیب ہوئی چنانچہ اسلامی سلطنت کے قیام کے صرف ستره ۱۷ سال بعد دنیا نے ابوسفیان کو مسند نشین خلافت سے یہ جملہ کہتے سنا کہ ______

"میرے پیارے بھتیجے عثمان! بڑی مشکل سے حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں آئی ہے، اسے بنی امیہ کے ذریعہ مضبوط کرلو؛ اس سے گیند کی طرح کھیلو اس لئے کہ جنت و نار سب ایک ڈھکوسلہ ہیں!"

اور پھر اسی ابوسفیان کو دنیا نے دیکھا کہ وہ اسد الرسول حضرت حمزہ کی قبر مبارک کو ٹھکرا ٹھکرا کے یہ تاریخی جملہ کہہ رہا ہے،

"بنی ہاشم! تم نے اسی حکومت کے لئے ہم سے نزاع کی تھی اب دیکھو کہ امیہ کے فرزند اس سے کس طرح کھیل رہے ہیں!"

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے منصوبہ کا ایک جزو پورا ہو گیا تھا، حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں آگئی تھی، لیکن رجعت پسند طبقہ یہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی قوت مستحکم نہیں ہے، ابھی مسلمانوں میں انقلاب اور زندگی کی چنگاریاں موجود تھیں۔ اس لئے اگر رجعت پسند طبقہ حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر اسلام پر وار کرنا چاہتا تو وہی مسلمان جو اپنے

جمود اور بے حسی کے نتیجہ میں بنی امیہ کے ایک رکن کی بیعت کرنے پر تیار ہو گئے تھے اس حرکت کو ہرگز برداشت نہ کرتے بلکہ تڑپ کے رجعت پسندوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے، ان کا سویا ہوا جذبۂ جہاد جاگ اٹھتا اور اسلام کی شہ رگ پر وار ہوتے دیکھ کے ان میں وہی زندگی اور بیداری پیدا ہو جاتی جس کا مزہ رجعت پسند طبقہ بدر و احزاب کے میدانوں میں چکھ چکا تھا ـــــ اس لیے حکومت ہاتھ میں آتے ہی یہ کوشش شروع کی گئی کہ مسلمانوں کے نفوس کو بگاڑ دیا جائے، ان کی ہمت توڑ دی جائے، ان سے زندگی اور انقلاب کے جوہر چھین لئے جائیں، ان کا نظم برباد کر دیا جائے، ان کی قوت پریشان کر دی جائے۔ اور جب عام مسلمان سیاسی اور روحانی اعتبار سے بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو جائیں تو سچے انقلابیوں کی اس جماعت پر وار کیا جائے جو آج تک رسول اکرم کے مقدس مشن کو کلیجے سے لگائے اس نظام نو کی خاموش تبلیغ کر رہی تھی جسے سرکار دو عالم قائم فرمانا چاہتے تھے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے۔

(۱) اسلامی سلطنت کے ہر صوبہ کی گورنری بنی امیہ کے سپرد کر دی گئی تاکہ وہ ظلم و ستمرانی کی قوتوں سے سچے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلا دیں اور ان میں نظام کے قیام کی جو خواہش موجود ہے وہ افسردہ اور پامال ہو جائے۔

(۲) اسلامی بیت المال کو بنی امیہ کی "گھریلو املاک" بنا دیا گیا، تاکہ جہاں ایک طرف رجعت پسند طبقہ مالی اعتبار سے قوی ہو جائے، وہیں عام مسلمان افلاس و تنگدستی کے نتیجہ میں زندگی کی حرارت سے محروم ہو جائیں!

(۳) جن مسلمانوں کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ انقلاب اسلامی کے سچے داعی اور نظام کے قیام کے سچے خواہش مند ہیں ان پر مظالم

شروع کر دیئے گئے، چنانچہ عمار یاسر اور ابوذر کے ساتھ خلافت ثالثہ میں جو سلوک روا رکھا گیا۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے!

(۴) مقتدر اور صاحب اثر صحابہ کو مدینہ سے دُور دُور بھیج دیا گیا تاکہ عام مسلمانوں کی ہمت شکستہ ہو جائے۔ اور ان میں حکومت وقت کی کارفرمائیوں کو چیلنج کرنے کی قوت باقی نہ رہے۔

(۵) قریش کے وہ ممتاز اکابر جو سابقہ حکومتوں کے دور میں بڑے اقتدار کے مالک تھے بکلی طور پر نظر انداز کئے جانے لگے تاکہ عوام پر ان کا جو اثر ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

اموی سیاست کی یہ تدبیر بڑی حد تک کامیاب ہوئی چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چند ہی سال میں مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ ان کا نظم برباد ہو گیا، ان کی جرأت سلب ہو گئی، ان کا عزم حیات مردہ ہو گیا، ان کی ایمانی حرارت اور ان کا انقلابی ولولہ سرد پڑ گیا، اور وہ ایک ایسی مفلوج سراپا جمود اور مُردہ جماعت میں تبدیل ہو گئے جو کسی اصولی جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں کہی جا سکتی، جسے انقلاب اور اس کے اعلیٰ مقاصد سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ جو اس بلند تر نظام حیات کا تصور بھی کھو بیٹھی جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، اور جو اخلاقی اور اجتماعی اعتبار سے ایک ایسی مردہ اور فنا پذیر جماعت بن گئی جو ایک انقلابی تحریک میں معاونت کرنا تو درکنار، کسی ایسی تحریک کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، — یقین نہ ہو تو حضرت عثمان کے دَورِ حکومت کے آخری ایّام پہ ایک سرسری نظر ڈال لیجئے حالت یہ تھی کہ خلیفہ وقت کا مکان مٹھی بھر مصریوں نے گھیر رکھا تھا، اور وہی مدینہ کے لوگ جنہوں نے ایران، مصر و شام کی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے تھے، جن کی تلواروں کی کاٹ سے ساری دنیا لرز رہی تھی اور جنہوں نے قیصر کا غرور اور کسریٰ کی نمکنت خاک میں ملا دی تھی ان مٹھی بھر مصریوں سے خائف گھروں میں زنجیریں دیئے بیٹھے تھے، اور

ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خلیفۃ المسلمین کی کوئی مدد کر سکیں، اسی سے ان کے عزم و ہمت کی شکستگی اور ان کے عسکری نظم کے خاتمہ کا اندازہ کر لیجئے۔ اور پھر سوچئے کہ بنی امیہ کے دس سالہ دورِ حکمرانی نے مسلمانوں کو کس حد تک مُردہ اور ان کی سیرت کو کس حد تک مسخ کر دیا تھا!

بنی امیہ مسلمانوں کو مسخ کر چکے تھے، لیکن ابھی اسلام پر وار کرنا ان کیلئے ممکن نہیں تھا۔ اس کے لئے ابھی کچھ اور وقت درکار تھا، کہ اچانک ایک ذرا سی غلطی نے ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ محمد بن ابی بکر اور مصریوں سے وعدہ خلافی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں بنی امیہ کے اقتدار کا محل لرز اٹھا۔ معاملہ چھوٹا سا تھا، چنگاری معمولی تھی لیکن اسی معمولی سی چنگاری سے ایک عظیم انقلاب کے شرارے بھڑک اٹھے، حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے۔ اور عنانِ اقتدار ان سچے انقلاب پسندوں کے ہاتھوں میں آگئی جو پیغمبرِ اسلامؐ کے دوش بدوش اسلام کے ذہنی روحانی اور الٰہی انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے جان و دل کی بازی لگا چکے تھے اور آج بھی اس الٰہی نظام کے قیام کے شدت سے آرزو مند تھے جسے نبی کریمؐ وجود میں لانا چاہتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام خلیفہ بنا دیئے گئے اور اس طرح اسلامی سیاست میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا!

اسلامی دنیا کے لئے یہ انتہائی نازک وقت تھا۔ اور مسلمان اس موقع پر پانچ طبقوں میں بٹے ہوئے تھے:۔

(۱) اسلامی انقلاب اور الٰہی نظامِ زندگی کے سچے پرستار جو اسلامی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے پر تیار تھے۔
اس طبقہ کی قیادت وفاتِ رسولؐ کے بعد سے آج تک ہمیشہ حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ اور یہی رسول اللہؐ

کے اس عظیم روحانی ورثہ کے امین تھے جن پر الٰہی نظام کی کامیابی کا انحصار تھا!

(۲) وہ مہاجرین و انصار جو سابقہ حالات سے بددل ہو کر اپنا ذوقِ جہاد اور اپنا ولولہ انقلاب بڑی حد تک کھو چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جاہلی نظام کی بازیابی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

(۳) شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمان جو نہ انقلاب پسندوں کے ساتھ مل کے بقائے اسلام کی جدوجہد کرنے پر تیار تھے اور نہ رجعت پسندوں کے مقابلہ میں لب کشائی کی جرأت رکھتے تھے۔ یہ طبقہ ابوموسیٰ اشعری اور ان کے امثال کا تھا جو "کھڑے رہنے کے مقابلہ میں بیٹھنے کو، بیٹھنے کے مقابلہ میں لیٹنے کو، اور لوہے کی تلوار کے مقابلہ میں لکڑی کی تلوار" کو ترجیح دینے لگے تھے۔

(۴) زر پرست اور مفاد پرست طبقہ جسے حق و باطل کی کسی اصولی کشمکش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کو صرف اپنے ذاتی اقتدار اور حصول دولت سے دلچسپی تھی، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسلام کا کیا حشر ہونا ہے، ان کی ساری جدوجہد کا مرکز خود ان کی ذات تھی طلحہ و زبیر وغیرہ اسی طبقہ کے لوگ تھے۔ جن کو کوفہ اور بصرہ کی گورنری حاصل نہیں ہوئی تو وہ اس کا لحاظ کئے بغیر کہ دمشق کے گوشوں سے اسلام کے خلاف ایک زبردست طوفان اٹھ رہا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے، ان کا یہ اقدام بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان کو اسلام کی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ان کی ساری سرگرمیوں کا محور خود ان کا ذاتی اقتدار اور نفع تھا!

(۵) اسلامی انقلاب کے دشمن رجعت پسند عناصر جو پرانے جاہلی نظام کو واپس لانے کے خواہشمند تھے اور امیر معاویہ کی سرکردگی میں شام کو اپنا سب سے طاقتور مورچہ بنا چکے تھے، امیر معاویہ وہی بزرگ تھے جو بدر و اُحد واحزاب وغیرہ میں اپنے والد ابو سفیان کے ساتھ پیغمبر اسلام کے مقابلہ میں صف آرا ہو چکے تھے، اور اسلامی تحریک انقلاب کو مٹا ڈالنے کا وہی جذبہ اپنے دل کے اندر رکھتے تھے، جو خود ان کے والد اور انکے خاندان کے دوسرے افراد کے دلوں میں موجزن تھا۔

خلافت عثمانی کا خاتمہ ہوتے ہی رجعت پسند اور انقلاب دشمن طبقہ کے سامنے تین راہیں آئیں۔

(۱) جمہور مسلمین کے فیصلہ کے مطابق امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام کی بیعت کر لی جائے۔ لیکن ایسا کرنے کے معنے یہ ہوتے کہ اسلامی نظام نہ صرف یہ کہ قائم ہو جاتا بلکہ اتنا مضبوط بھی ہو جاتا کہ پھر اسے مٹا نا محال ہو جاتا۔ ایسی حالت میں رجعت پسندوں اور ان کے پسندیدہ اصولوں کا ختم ہو جانا یقینی تھا۔ جسے ظاہر ہے کہ وہ قبول نہیں کر سکتے تھے،

(۲) کچھ عرصہ تک خاموشی اور انتظار کی پالیسی پر عمل کیا جاتا، لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ نظام اسلامی کے داعیان کے قدم جم جاتے، عوام میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ جاتا، سوئے ہوئے مسلمان بیدار ہو جاتے، کھوئی ہوئی ہمت بازیاب ہو جاتی اور اسلامی نظامِ حکومت و معاش کی عملی تصویر نگاہوں کے سامنے آجانے کے بعد مسلمان دوبارہ اس جاہلی نظام سیاست کو ہرگز قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے جسے بنی امیہ

اور رجعت پسند دنیا پر نافذ کرنا چاہتے تھے،

(۳) تیسرا راستہ صرف یہ تھا کہ حضرت عثمان کے قتل اور حضرت عائشہؓ کی مخالفت کے نتیجہ میں مسلمانوں میں ذہنی اور سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوری طور پر امیر المومنین حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کر دی جائے، اور اس طرح اسلامی انقلاب کے داعیان کو اپنے قدم مضبوط بنانے سے روک دیا جائے! سیاسی اعتبار سے یہی تیسرا طریقہ صحیح اور مفید ہو سکتا تھا، چنانچہ امیر معاویہ نے قصاص خون عثمان کا نعرہ بلند کر کے سلطنت اسلامی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ـــــ سچے مسلمان اور نظام اسلامی کے شیدائی سمجھ گئے کہ امیر معاویہ کا مقصد حضرت عثمان کے خون کا انتقام لینا نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اسلام کی انقلابی تحریک کو فنا کر دینا ہے، چنانچہ انہوں نے وہی کیا جو اسلام کے دشمنوں کے مقابلہ میں دورِ رسالتؐ میں کیا جاتا تھا، وہ معاویہ شاہی کے مقابلہ میں سروں سے کفن باندھ کے میدان میں کود پڑے اور صفین کے میدان میں حق و باطل، الوہیت و سلطنت کا وہی معرکہ گرم ہو گیا جس کی مثال بدر و احد کے میدانوں میں مل چکی تھی، اس معرکہ میں امیر المومنینؑ کو مہاجرین و انصار کے اس طبقہ کا پورا تعاون حاصل ہوا۔ جو دورِ عثمانی میں بے عملی کا شکار ہو چکا تھا، لیکن نظام باطل کا غلبہ برداشت کرنے پر تیار نہیں تھا، اس طرح مسلمانوں کے اوّل الذکر دو طبقے امیر المومنینؑ کے پرچم تلے متحد ہو گئے باقی رہے تین طبقے، تو ان میں سے ایک تو کٹر رجعت پسندوں کا طبقہ تھا جو حکومت الٰہیہ اور نظام اسلامی کے تمام تصورات کو مٹا دینے کا آرزومند تھا۔ وہ تمام تر امیر معاویہ کیساتھ تھا، نہ ریاستی کی مدد سے امیر معاویہ نے زر پرست مسلمانوں کو بھی خرید لیا۔ اور شکست خوردہ ذہنیت کے بزدل لوگ شامیوں کا پلہ بھاری دیکھکر رفتہ رفتہ خود ہی امیر معاویہ کے ساتھ ہو گئے! ـــــ امیر معاویہ کے عروج کیساتھ اسلام میں بادشاہت، جاگیرداری زراندوزی عشرت پسندی غرض ایام جاہلیت کی تمام برائیاں عود کر آئیں اور بنی امیہ کی حکومت انقلاب اسلامی کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن گئی ـــ یہ تھے مختصراً وہ حالات جنہیں آلِ رسولؐ کے محترم ارکان کو بقائے اسلام کی سعی و جہد کرنا تھی۔ اور ان کے عظیم مجاہدات کا مطالعہ کرتے وقت اس پس منظر کو نگاہ میں سلہ

آلِ رسولؐ کا مقصد

تاریخ اسلام کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ آلِ رسولؐ کی تحریک کو بادشاہوں کی سعی کشورکشائی کے پیمانہ سے ناپا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام سریر آرائے خلافت نہیں ہوئے، امام حسن علیہ السلام تخت حکومت چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے یا امام حسین علیہ السلام کے مقابلہ میں تاج شاہی یزید کے سر پہ جگمگاتا رہا۔ تو.... ہم یہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ آلِ رسولؐ کو ناکامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنا پڑی، چودہ سو سال تک شاہی وسلطانی کے نظام میں زندگی بسر کرتے رہنے کے نتیجہ میں، ہماری یہ کچھ عادت سی ہو گئی ہے کہ ہم آلِ رسولؐ کے ہر اقدام کو حصول سلطنت کی ایک کھلی یا ڈھکی، علانیہ یا خفیہ کوشش تصور کرنے لگے ہیں، یہی وہ غلطی ہے جس کے نتیجہ میں ہم نہ صرف یہ کہ اسلامی تحریک کے حقیقی خدوخال سے ناآشنا رہتے ہیں بلکہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح تاریخ اور ان کے عظیم کارناموں کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔

ہمارے لاشعور میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ حکومت بنی ہاشم کا حق تھی، اور وہ اپنے اس حق سے محروم کر دیئے گئے۔ انہوں نے چند مرتبہ یہ کوشش بھی کی کہ تاج خلافت

ان کو نصیب ہو جاتے ۔ لیکن بنی امیہ نے روپے اور تلوار کے بل پر ہر کوشش ناکام بنادی اور ان پیہم ناکامیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر آئمہ اہلبیتؑ اس باب میں قطعاً مایوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے ۔ لیکن ظالموں نے ان کو پھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا ، وہ بار بار اسیر کئے گئے ، نشانۂ ستم بنائے گئے اور ایک ایسی حسرت انگیز و یاس آگین زندگی بسر کرتے رہے جو تاریخ درد والم میں اپنی نظیر آپ ہے !

یہ تصور بجائے خود آل رسولؐ پر ایک ہولناک ظلم کے مترادف ہے واقعہ یہ ہے ، کہ آل رسولؐ کے مقدس افراد کو بادشاہی کے ملعون تصور سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ سرے سے اس انسانی حاکمیت کے قائل ہی نہیں تھے جس کا ایک نمونہ بادشاہت ہوا کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب بنی امیہ کو بنی عباس کے ہاتھوں شکست ہوئی اور حکومت آل ہاشم کے ہاتھوں میں آگئی تو اس ہاشمی حکومت سے بھی جسے بنی عباس کی حکومت کہا جاتا ہے آئمہ آل رسولؐ کا اسی طرح تکراؤ جاری رہا جس طرح آل امیہ سے جاری رہ چکا تھا ، اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض امام زادوں نے حصول حکومت کی کوشش کی لیکن ہمارے آئمہ نے ان کی کوئی امداد نہیں کی ، ان مواقع پر آئمہ کی خاموشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بنی امیہ یا بنی عباس کے مظالم سے خائف تھے بلکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ جو امام زادے حصولِ حکومت کے لیے جنگ کر رہے تھے وہ بھی انسانی حاکمیت کے داعی تھے ، اور چونکہ آئمہ اہلبیتؑ کو اس اصول سے قطعاً اختلاف تھا اس لیے وہ ان لوگوں سے بھی اسطرح علیحدہ رہے جس طرح انسانی حاکمیت کے ان علمبرداروں سے دور رہے جن کو بنی امیہ یا بنی عباس کے نام یاد کیا جاتا ہے !

یہ صحیح ہے کہ آئمہ علیہم السلام خلافت الٰہیہ کے دعویدار رہے اور اس دعوے پر وہ شدت سے اٹل تھے کہ سخت سے سخت مظالم کے باوجود انہوں نے اپنے اس دعوے کو ترک نہیں کیا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ یاد

رکھنا چاہئے کہ الٰہیہ اور دنیاوی بادشاہت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی فرق جتنا کہ تاجور مامون الرشید اور بوریہ نشین امام رضاؑ میں تھا۔ خلافت ایک منصب دینی ہے جس میں صاحب امراللہ کی جانب سے معاشرۂ اسلامی کی تنظیم، سرحدوں کی مدافعت، واجبات الٰہیہ کی وصولیابی، شریعت حقہ کی حفاظت اور دین الٰہی کی تبلیغ و اشاعت کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ انسانوں پر "حکومت" نہیں کرتا، اس لئے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے، وہ صرف شریعت کی راہ پر انسانوں کی "قیادت" کرتا ہے، جس کیلئے وہ مامور ہوتا ہے، وہ بادشاہ نہیں ہوتا، قائد یا امام ہوتا ہے۔ آل رسولؐ کو یہ منصب من جانب اللہ حاصل تھا۔ اسے ان سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ اس لئے اس مسئلہ پر ان کو کسی سے کوئی تنازعہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، ان کو بنی امیہ یا بنی عباس سے خلافت الٰہیہ کے مسئلہ پہ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لئے کہ مادی قوت اور ظاہری شوکت کے باوجود یہ سلاطین ان سے ان کا الٰہی منصب نہیں چھین سکتے تھے۔ اختلاف تھا تو اس سوال پہ کہ ان سلاطین نے مسلمانوں پر انسانی حاکمیت کا اصول نافذ کر کے ان کی آزادی کو غلامی میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں کے سچے قائدین اس صورت حال کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے وہ لڑنے تھے مسلمانوں کی حقیقی آزادی کے لئے، شریعت کی بقا کے لئے، اسلامی نظام کے قیام کے لئے اور اس حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانے کے لئے جس کے قیام کی خاطر خاتم المرسلینؐ نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی، وہ اسلامی تحریک، انقلاب کے داعی تھے اور ان کا ہر قدم اسی انقلاب کے تکملہ کے لئے اٹھا کرتا تھا، ایسی حالت میں نہ تو ان کے کردار پر ایک ٹکا ر سلطنت کے

کردار کی حیثیت سے نظر ڈالی جا سکتی اور نہ جہاد زندگی میں ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اس حیثیت سے کیا جا سکتا ہے!

آلِ رسولؐ کے محترم ارکان کی حیثیت اسلامی تحریکِ انقلاب کے قائدین کی ہے۔ اور ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ان کی اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے!

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام کو اغیار کی دستبرد سے محفوظ رکھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی؟ اسلام کے سیاسی معاشی اور تمدنی نظریات کو لٹ جانے سے کہاں تک محفوظ رکھا؟ حکومتِ الٰہیہ کے جس تصور کو شیطان مٹا دینا چاہتا تھا اسے سلاطین کی دستبرد سے بچانے میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟ شریعت اسلامی کو اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ برقرار رکھنے کا فریضہ کہاں تک انجام دیا؟ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے فرائض کس حد تک انجام دیئے؟ تبلیغ و اشاعت اسلام میں کس حد تک معاون ہوئے؟ اور اسلامی تحریک انقلاب کو پروان چڑھانے میں ان کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی؟ ـــــ اور انہیں امور کا اندازہ کرنے کے بعد ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ آلِ رسولؐ کے محترم ارکان جہادِ حق و باطل میں کامران و بامراد ثابت ہوئے یا ناکام و نامراد!

بدقسمتی سے اسلامی تاریخ کبھی کسی اصول کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی بلکہ اسے محض چند بادشاہوں کی کہانی بنا دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشی، اخلاقی اور تمدنی تحریکات کو سمجھنا آسان نہیں رہا ہے۔ آلِ رسولؐ کا کردار چونکہ ایک خاص اصول اور

ایک خاص روحانی، اخلاقی اور انقلابی تحریک سے وابستہ تھا۔ اس لئے بادشاہوں کی کہانی میں اس کا صحیح موقف تلاش کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے اور جب تک تاریخ پر گہری نگاہ نہ ڈالی جائے حالات کی پوری چھان بین نہ کیجائے۔ واقعات کے پس منظر پر نظر نہ رکھی جائے، ذہنی اور سیاسی، کیفیات کا تجزیہ نہ کیا جائے۔ پس پردہ عوامل اور نفس انسانی کے محرکات کا پتہ نہ چلایا جائے۔ تب تک آل رسولؐ کا حقیقی کردار، تاریخ اسلام میں ان کا صحیح مقام اور اسلامی معاشرہ میں ان کا اصلی موقف معلوم کرنا قطعاً ناممکن ہے:

تاریخ کا ہر واقعہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کی پشت پر کچھ عوامل ہوتے ہیں۔ کچھ خاص محرکات ہوتے ہیں، ایک مخصوص ذہنی پس منظر ہوتا ہے، ایک خاص طرز فکر اس کا خالق ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک کسی دور کے فکری رجحانات کا اندازہ نہ ہو، سیاسی معاشی، تہذیبی اور فکری پس منظر معلوم نہ ہو، تاریخی شخصیتوں کی ذہنی کیفیات اور ان کے مقاصد کا پتہ نہ چلایا جائے، ان کی نفسیاتی کیفیت پر نظر نہ رکھی جائے اور ان عوامل کو معلوم نہ کیا جائے جو اس وقت کارفرما تھے تب تک کسی واقعہ کی حیثیت یا تاریخ میں اس کے مقام کا فیصلہ کرنا قطعاً فضول سی بات ہے، آل رسولؐ کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ غلطی اور زیادہ شدت سے نمایاں ہے اس لئے کہ کچھ تو دور تقیہ کے اثرات کے نتیجہ میں اور کچھ ذہنی انحطاط کی بدولت آل رسولؐ کی تاریخ مرتب کرتے وقت ان امور کا بہت کم لحاظ رکھا گیا، اور یہی وجہ ہے کہ نسل انسانی کے ان منصوص من اللہ قائدین کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے

تھی، ان کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کا جو احساس ہمارے قلوب پر ہونا چاہیئے تھا، اور ان کی امامت کبرای کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کو جو عدیم النظیر فوائد نصیب ہوئے ان کا جو نقش ہمارے ذہنوں پر ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بہت کم نظر آتا ہے!

یہ صحیح ہے کہ ہم ان کی محبت کو سرنامۂ ایمان اور ان سے عقیدت کو پروانۂ نجات تصور کرتے ہیں لیکن عشق و عقیدت کی وادی سے ذرا دور ہو کر ان کی جو فکری عظمت ہمارے دلوں میں ہونا چاہیئے اس سے کم از کم ہمارے عوام قطعاً بے بہرہ ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آل رسول کی تاریخ کو آج تک صحیح طور پر مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس مقالہ میں ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم آل رسولؐ کی تاریخ مرتب کرنے کا ایک ڈھنگ بتادیں، ایک راستہ تیار کردیں، جس پر چل کے دوسرے ارباب فکر و قلم آل رسول کی مکمل تاریخ مرتب کریں اور ہمیں امید ہے کہ اگر اس طریقہ پر تاریخ از سرِ نو ترتیب ہو گئی تو نہ صرف یہ کہ آلِ رسول کی عظمت کے ہزاروں نئے گوشے دنیا کے سامنے آجائیں گے بلکہ جہاد حق و باطل میں حق پرستوں کی شاندار کامیابیوں کی یہ داستان خود ہماری نسل میں حق پرستی کا وہ ولولہ اور وہ عزم پیدا کردے گی جس سے باطل کا قصر لرزہ براندام ہو جائے گا!۔

سیاستِ علویہ کا پہلا مظاہرہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے دوران ہی اسلام کا پیغام عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن ایک عالمگیر دین کی حیثیت سے اسلام کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک مختصر سی زندگی میں ساری دنیا کو مسلمان بنا دینا ناممکن تھا، چنانچہ حضرت سرور کائنات ؐ نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے مستقبل میں بقا و اشاعت اسلام کا ـــــــــ نیز خود عربستان میں منافقین کے مقابلہ میں اسلام کے تحفظ کا ضروری بندوبست فرما دیا۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر غدیر خم کے میدان میں اپنے وصی و جانشین کی نامزدگی فرمادی، تاکہ آپ کے بعد اسلام کی دعوت انقلاب افراتفری کا شکار ہو کر تباہ نہ ہو جائے۔ اور کاروان حق ایک ایسے قائد کی سرکردگی میں برابر آگے بڑھتا رہے جس کی عظیم صلاحیتوں کا خود دور رسالت میں کافی شاندار اور کامیاب تجربہ کیا جا چکا تھا۔ میدانِ غدیر میں مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ کے تاریخی ارشاد کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ

" سرور کائنات ؐ کے بعد اسلام کی انقلابی تحریک کو اندرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک اس تحریک کو عام کرنے کی صلاحیت علی ؑ کے علاوہ اور کسی دوسرے شخص میں نہیں ہے۔ اس لئے بادشاہت کا تاج خواہ کسی کے سر پر جگمگائے، لیکن جہاں تک اسلامی تحریک کا تعلق ہے اسلام کی دعوت انقلاب کا تعلق ہے، شریعت اسلامیہ کو اس کی تمام خوبیوں کے ساتھ قائم رکھنے کا تعلق ہے۔ اور قومی یا عربی سیاست سے

قطع نظر خود دین اسلام کے مفاد کا تعلق تھا، مسلمانوں کی قیادت وامامت کا مستحق علیؑ کے سوا کوئی دوسرا نہیں، وہی سفینۂ اسلام کا ناخدا ہوگا، وہی ملت کے دینی مفاد کا پاسبان ہوگا، اور دین کا مستقبل اسی کی ذات گرامی سے وابستہ ہوگا۔"

اسی ارشاد کی روشنی میں حضرت ختمی مرتبتؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی تحریکِ اسلامی کی قیادت کا بار گراں حضرت علی علیہ السلام کے کاندھوں پہ آگیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے اس گرانقدر ذمہ داری کو کماحقہٗ پورا فرمایا جو اللہ، رسولؐ اور اسلام کی جانب سے آپ پر عائد کی گئی تھی!

حضرت علی علیہ السلام نے تحریکِ اسلامی کی قیادت جس وقت سنبھالی وہ تاریخ اسلام کا انتہائی نازک، حوصلہ شکن اور پُرآشوب دور تھا، اس لئے کہ ــــــ

(۱) حضرت ختمی مرتبتؐ کے انتقال کی وجہ سے مسلمانوں کو جو صدمۂ عظیم پہنچا تھا اور اس کے نتیجہ میں ملّت کو ہولناک دھچکا لگا تھا اس نے یقینی طور پر مسلمانوں کے ذہنوں کو پراگندہ، دلوں کو افسردہ اور قلوب کو مضمحل کر دیا ہوگا۔ اس سانحۂ عظمیٰ کا لازمی نتیجہ ایک فکری انتشار اور ایک ذہنی کرب ہی کی صورت میں نمایاں ہو سکتا تھا، چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ مسلمان مرگ رسولؐ کی اطلاع پاتے ہی حواس کھو بیٹھے، اور ان کو مستقبل بالکل تاریک اور غیر یقینی نظر آنے لگا۔ مملکت اسلامی کی شامی سرحدوں سے پہلے ہی وحشت خیز خبریں آچکی تھیں، مقابلہ کے لئے رسولؐ نے جو لشکر تیار کیا تھا اس میں افرا تفری پھیلی ہوئی تھی، ایسی حالت میں مسلمانوں میں جتنی بھی گھبراہٹ نہ پھیل جاتی ۔۔۔ وہ کم تھی، موقع پرستوں نے اسی صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور عین اس وقت جبکہ بنی ہاشم

تدفین رسولؐ میں مصروف تھے، حضرت ابوبکر کی خلافت کا اعلان کر دیا۔
پراگندہ ذہن، افسردہ دل، شکستہ عزم اور خوفزدہ مسلمانوں نے اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور اس طرح ایک حواس باختہ قوم اپنی قیادت کے سلسلہ میں ایک اتنا غلط اور مہلک فیصلہ کر بیٹھی جسکا بھگتان آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے!

(۲) اسلامی حکومت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جو اس حکومت کو اسلامی دعوت کے عام کرنے اور الٰہی انقلاب کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنانے پر تیار نہیں تھے بلکہ اس حکومت کے نتیجہ میں عربی شہنشاہیت وجود میں لانے کے خواہشمند تھے!

(۳) عرب میں ارتداد کا فتنہ سر اٹھا رہا تھا اور مرتدین کی فوجیں مدینہ کی طرف کوچ کر رہی تھیں۔

(۴) شام میں قیصر کی فوجی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں، اور مسیحی قوتوں سے مسلمانوں کے ٹکراؤ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

(۵) سعد بن عبادہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا تھا اسکے نتیجہ میں انصار کے ایک بڑے طبقہ میں حکومت وقت کی جانب سے ایک عام بددلی اور افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے، تھے، ابھی اس بددلی کا محض آغاز تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ اتنی بڑھی، کہ انصار اسلامی سیاست سے قطعاً بے تعلق ہو گئے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ کے بعد ہمیشہ مہاجرین اور قریش سلطنتِ اسلامی کے کرتا دھرتا بنے رہے اور انصار کا یہ حیثیت مجموعی سیاسی مسائل سے تعلق صفر سے زیادہ نہیں رہا۔ ملّتِ اسلامیہ

کے اتنے بڑے اور پرجوش حصّہ کا مسائل ملی سے کنارہ کش ہوجانا تاریخ اسلامی پر جتنے ہولناک اثرات چھوڑ سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں!

(۶) ابوسفیان اور اس کے اسلام دشمن ساتھی خود مدینہ میں موجود تھے اور اس موقع کے منتظر تھے کہ مرتدین کو ذرا بھی غلبہ نصیب ہو تو مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں!

(۷) انقلاب اسلامی کے سچے شیدائی اور دعوت الہیہ کے حقیقی نقیب بہت کم تھے اور زمانہ نے ایک ایسی پرآشوب کروٹ لے لی تھی کہ وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے!

(۸) حکومت جن مفاد پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی وہ اپنے استحکام کیلئے رجعت پسندوں کا تعاون بھی قبول کر سکتے تھے اس لئے حکومت اسلامی کی اصولی اساس متزلزل ہوگئی تھی۔

(۹) خلافت کے سلسلہ میں ایک غلط اصول وضع کر لئے جانے کا نتیجہ یہ تھا کہ خود مسلمانوں کے گمراہ ہوجانے کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا تھا، ایسی حالت میں غیر ممالک میں تبلیغ اسلام کرنے کے مقابلہ میں یہ ضروری ہوگیا تھا کہ خود ان ان مسلمانوں پر احقاق حق کر دیا جائے، جو مفاد پسندوں کی کوشش کے نتیجہ میں خلافت الہیہ کو عربی ملوکیت سمجھ کے دین کے باب میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے!

امیرالمومنینؑ طلبگار سلطنت ہوتے تو اس نازک موقع پر تلوار نکال کے قسمت آزمائی کیلئے میدان میں اُتر آتے، لیکن آپ کو سلطنت عزیز نہیں تھی، آپ "بادشاہ" نہیں تھے جو حصولِ حکومت کے لئے قوم کے مفاد کو نظرانداز کر دیتے، آپ امام تھے، قوم کے منصوص من اللہ قائد، دین کے پاسبان، اور ملت کے محافظ، آپ کی توجہ سلطنت

پر نہیں تھی، بلکہ اس دین کی بقا پر مرکوز تھی جسکی کامیابی کے لئے آپ شب ہجرت چار سو ننگی تلواروں کے سائے میں آرام کی نیند سو گئے تھے، یا جس کی خاطر آپ نے اپنی جوانی کے پُر بہار ایام خیبر و خندق کے خون فشاں مورچوں کی نذر کر دیئے تھے! —— آپ نے حالات کا مدبرانہ جائزہ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ

" مسئلہ خلافت پر نہ صرف یہ کہ جنگ نہ کیجائے بلکہ حکمران طبقہ سے محدود تعاون کی پالیسی اختیار کیجائے "

آپ کے اس مدبرانہ فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ——

(۱) ابو سفیان اور اسکے اسلام دشمن ساتھی مسلمانوں میں جس خانہ جنگی کا خواب دیکھ رہے تھے وہ وجود میں نہیں آئی اور رجعت پسندوں کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

(۲) مفاد پسند حکمران طبقہ کو آپ کی جانب سے جنگ کا جو خطرہ تھا وہ دور ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں اس نے جیش اسامہ کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔ اس طرح قیصر کی جانب سے مسلمانوں کو جو دھڑکا لگا ہوا تھا وہ دور ہو گیا، اور اسلام کے لئے بیرونی دشمنوں کی جانب سے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ دفع ہو گیا!

(۳) مسلمانوں نے اپنی حکومت کے باب میں جو فیصلہ کر دیا تھا وہ چاہے کتنا ہی غلط سہی، مگر چونکہ اسے چیلنج نہیں کیا گیا اس لئے مسلمانوں کو سکون کے چند لمحات میسر آ گئے، ان کو ایک طاقتور حکومت بن جانے کا احساس پیدا ہو گیا جسکے نتیجہ میں ان کی گھبراہٹ، ان کا انتشار، ان کا خوف اور سرور کائناتؐ کے اچانک انتقال کے نتیجہ میں پھیلی ہوئی سراسیمگی دور ہو گئی۔ ان میں پھر ایک بار ہمت، خود اعتمادی، جراُت اور جہد للبقا کے جوہر بیدار ہو گئے اور قوم کے نظم (MORALE) پر جو خراب اثرات پڑ رہے تھے ان کا خاتمہ ہو گیا۔

(۴) حکومت وقت سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں پیغمبرؐ اسلام کے بلند مرتبت شاگردوں

تحریک اسلام کے سچے علمبرداروں، الٰہی نظام نو کی حقیقی معرفت رکھنے والوں، اور دعوت انقلاب کے صحیح مفہوم کو جاننے اور سمجھنے والوں کی وہ مختصر سی جمعیت قتل ہو جاتی جس پر آئندہ اسلامی تصورِ حیات کو عام کرنے کا انحصار تھا۔ امیرالمومنینؑ نے خاموشی برت کے اس جماعت کو بچا لیا۔ اور اس طرح مستقبل میں حقیقی اسلام کی اشاعت کا بندوبست کر دیا۔

(۵) خانہ جنگی وجود میں نہ آنے کی وجہ سے حکمران طبقہ آسودہ ہو کر مرتدین کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا اور اس طرح عربستان کے اندر اسلام کو جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا استیصال ہو گیا۔ مسلمانوں کے اتحاد کے نتیجہ میں جہاں مرتدین کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ وجود میں آ گیا وہیں ان منافقین کی ہمت بھی شکستہ ہو گئی جو مرتدین کو غلبہ پاتے دیکھ کر مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے کی فکروں میں مشغول تھے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس موقع پر اسی سیاست کا مظاہرہ فرمایا جس کی تعلیم آپ نے جناب رسالت مآبؐ سے حاصل فرمائی تھی!

حضرت ختمی مرتبت کا یہ دستور تھا کہ آپ منافقین اور مؤلفۃ القلوب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، تاکہ یہ لوگ مال غنیمت اور دولتِ دنیوی کے لالچ میں کفار سے رزم آزما رہیں۔ اور اسلام کو فتح و ظفر نصیب ہو، امیرالمومنینؑ نے بھی یہی کیا۔ آپ نے "سلطنت کے شیدائی مفاد پسندوں" کو ملک و مال پر قبضہ کئے رہنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ "اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے" مرتدین سے جنگ کریں۔ اور اسلام کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا وہ دُور ہو جائے!

مرتدین کا استیصال دراصل سچے مسلمانوں کا کام تھا، لیکن امیرالمومنینؑ نے یہی کام مفاد پسندوں سے لے لیا اور دولت یا حکومت کی خواہش میں مسلمان

ہونے والوں کے ذریعہ دشمنان اسلام کی کمر توڑ دی، مرتدین سے سچے مسلمانوں کی جنگ ہوتی تو اسلامی دعوت انقلاب کا حقیقی مفہوم جاننے والے بھی کافی تعداد میں مارے جاتے اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد کم ہو جاتی جن پر حقیقی اسلام کی اشاعت کا دارو مدار تھا۔ سیاست علویہ نے ان سچے مسلمانوں کو جنگ سے بھی محفوظ رکھا اور مرتدین کا قلع قمع بھی کرا دیا۔ سیاست، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور اعلیٰ حکیمانہ قیادت کا اس سے بہتر مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ سیاست کی اس سے اعلیٰ مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ مرتدین کی طاقت مفاد پسندوں کے ہاتھوں ختم کرا دی گئی اور جن دونوں طبقوں کو اسلام کے مقابلہ میں متحد ہونا چاہیے تھا ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا کے اسلام کے سر سے ایک بلا دور کر دی گئی!

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس زمانہ میں مرتدین کے خلاف جنگ جاری تھی تو حضرت علی علیہ السلام راتوں کو مدینہ کا پہرہ دیتے تھے اور طلایہ پھرتے تھے۔ بعض کوتاہ بین اور بصیرت ناآشنا حضرات اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اس دور کے مسند نشین خلافت سے پورا اتفاق رکھتے تھے اور آپ کا یہ "تعاون" مسلمانوں کی خانہ ساز تعمیر خلافت کا ایک جواز تھا ۔۔۔۔۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا!۔ واقعہ یہ تھا کہ تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت سے مرتدین کا استیصال اور قلب اسلام یعنی مدینہ کی حفاظت دراصل امیر المومنینؑ کا فرض تھا اور آپ نے یہ فرض اس طرح پورا فرمایا کہ نام نہاد مسلمانوں کے ذریعہ مرتدین کا استیصال بھی ہو گیا اور مدینہ کی تاراجی کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ بھی آپ کے نام کی ہیبت اور آپ کی شب گشت کے نتیجہ میں ختم ہو گیا ۔۔۔۔۔ اب اسے چاہے یوں کہہ لیجئے۔ کہ امیر المومنینؑ حکمران وقت سے تعاون کر رہے تھے اور چاہے یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح کفار کے مقابلہ میں رسولؐ مولفۃ القلوب کا تعاون حاصل کئے رہتے تھے

اسی طرح مرتدین کے مقابلہ میں علیؑ مفاد پسندوں کا تعاون حاصل کئے رہے، اور جس طرح رسولؐ نے منافقین اور مولفتہ القلوب کو اپنے ساتھ رکھ کے کفار میں ایک دہشت پیدا کر رکھی تھی اسی طرح امیرالمومنینؑ نے دولت اور حکومت کے شیدائی عربوں کی طاقت سے مرتدین کا سر کچل دیا!

امیرالمومنینؑ مسئلہ خلافت پر خاموش نہ رہتے تو سلطنت کے شیدائی محض اپنی حکمرانی باقی رکھنے کے لئے مرتدین سے مل جانے میں بھی باک نہ رکھتے اور منافقین جب یہ صورت دیکھتے تو وہ بھی اس اتحاد میں شامل ہو کر اسلام کی موت کا سامان فراہم کر دیتے، امیرالمومنینؑ نے اپنی خاموشی کے نتیجہ میں ان تینوں طبقوں کا اتحاد ناممکن بنا دیا۔ اسلئے کہ سلطنت کے شیدائی جو کچھ چاہتے تھے وہ ان کو مل گیا وہ "دُنیائے اسلام" کے مالک قرار پا گئے، اور اب ان کو مرتدین سے لڑنا ضروری ہو گیا۔ جو ان کے اقتدار کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے، رہا ابوسفیان اور اس کا گروہ منافقین تو وہ مسلمانوں کا اتحاد دیکھ کے اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ ان کو مرتدین کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں ہو سکی، اور اس طرح سلطنت کے شیدائیوں، مرتدوں اور منافقوں کا جو اتحاد ثلاثہ وجود میں آسکتا تھا اس کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا۔

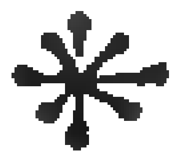
حسن تدبر کے اس بے مثل مظاہرہ کو حکمت ربانی کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے!

اور پھر اس "فتح مبین" کی امیرالمومنینؑ کو قیمت کیا ادا کرنا پڑی؟۔ صرف وہ "بادشاہت" جس کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ "انسانی حاکمیت" جو خود آپ کے اصول کے خلاف تھی! وہ دنیاوی طمطراق شاہانہ جس کا ذات بوترابؑ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا!

رہی وہ امامت کبریٰ وہ خلافت الٰہیہ اور وہ قیادت تھی، جو قدرت نے آپ کو عطا فرمائی تھی، وہ نہ کوئی چھینے جانے والی چیز تھی اور نہ چھینی جاسکتی وہ آپ کو بدستور حاصل رہی۔ اور اسی کا ایک مظاہرہ یہ حسن تدبر تھا، کہ آپ نے مرتدین اور منافقین کی یلغار سے اسلام اور مسلمانوں دونوں کو بچالیا ——— بلاشبہ امیر المومنینؑ کو دنیاوی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا، اس حکومت سے جو بجا طور پر آپ کا حق تھی یہ ایک عظیم قربانی تھی جو آپ کو دینا پڑی لیکن اس قربانی کے نتیجہ میں ——— ——— مرتدین ختم ہو گئے اور عرب میں اسلام کا آفتاب اس شان سے چمکا کہ آج بھی ریگزار عرب کے ذرات اس کی رحمت پاش کرنوں سے جگمگاتے نظر آرہے ہیں!

منافقین کی آخری امیدیں بھی ٹوٹ گئیں، اور وفات رسولؐ سے فائدہ اٹھا کے چمن اسلام کو تاراج کر ڈالنے کے جو منصوبے دلوں کے پردوں میں پروان چڑھ رہے تھے ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئے! ——— مسلمانوں کے لرزتے ہوئے دل اور خوف سے کانپتے ہوئے قلب ٹھہر گئے۔ ان میں ہمت اور خود اعتمادی کے جوہر بیدار ہو گئے وہ جوہر جن کے نتیجہ میں مسلمان قوم اس شان سے ابھری کہ سات سو سال تک اقوام عالم پر اس کے اقتدار کا پرچم لہراتا رہا اور آج کے اس مٹے ہوئے عالم میں بھی دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر وہ داد حکمرانی دے رہی ہے ——— اسلام کی تباہی اور الٰہی دعوت انقلاب کے فنا ہو جانے کا جو خطرہ وفات حضرت ختمی مرتبت کے وقت پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا، اسلام کا ننھا سا پودا کفر و ارتداد کی تیز و تند سموم کے ہولناک جھونکوں سے بچ گیا۔ امیر المومنینؑ نے اسے گر جانے سے بچالیا۔ آپ کی اولاد امجاد نے اسے اپنے لہو سے سینچ کر ایک تناور درخت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

یہ تھی ایک "خاموشی" کی قیمت جو تحریک اسلامی کے قائد امیر المومنین علیؑ نے وصول کی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ دنیاوی حکومت کے مقابلہ میں یہ قیمت کم تھی!



احقاقِ حق

حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے وقت دو قسم کے خطرات اُبھرے تھے :-

(۱) ایک خطرہ شامیوں، مرتدوں اور منافقوں کا تھا، جو ملّت اِسلامیہ کی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔

(۲) اور دوسرا خطرہ مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں ایک غلط اصول وضع کر لیئے جانے کا تھا، جس سے خود اسلام کے اصول برباد ہو جانے کا خوف تھا۔

ملتِ اسلامیہ کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے ملّت اسلامیہ کے قائدِ اعظم اور قوم کے منصوص من اللہ امام نے دُور کر دیا۔

رہا اصول اسلام کے لیے خطرہ، تو اُسے دُور کرنا امامت کا نہیں رسالتؐ کا کام تھا۔ چنانچہ اصول کی حفاظت و اشاعت کے لئے ذات آگے بڑھی۔ جسے خود رسولؐ جزو رسالت (بضعۃ منی) قرار دے کے اسی دن کیلئے چھوڑ گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے دوران میں بار بار مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح فرمادی تھی کہ آپ کے بعد آپ کا وصی اور جانشین کون ہوگا، دعوتِ عشیرہ سے لیکر میدان غدیرخم تک علیؑ کی خلافت و وصایت کا بار بار اعلان کیا جا چکا تھا، لیکن وصایت کے باب میں آپ کے احکام کا نفاذ چونکہ آپ کی وفات کے بعد ہی ہو سکتا تھا، اور یہ خطرہ شدت سے موجود تھا کہ آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کمزور عقیدہ مسلمان اس اہم منصبِ شریعت کے باب میں شدید غلط روی کا شکار ہو جائیں گے اسلئے سرکارِ دوعالمؐ نے اپنے بعد ایک ایسی شخصیت کو چھوڑا جو ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے آپ کا جزو تھی اور مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں حق اور باطل کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی ——— یہ شخصیت تھی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی، جو حیاتِ رسولؐ میں بھی اس اعتبار سے شریکۃ الرسول رہ چکی تھیں کہ عورتوں سے متعلقہ احکام شریعت کی توضیح و تشریح آپ ہی کی ذات بابرکات سے متعلق تھی، مردوں سے متعلق شرعی احکام کی عملی تفسیر خود حضرت ختمی مرتبتؐ پیش فرما دیتے تھے، لیکن عورتوں کے مخصوص احکام پر عمل کرنا چونکہ حضور اکرمؐ کے لئے ممکن نہیں تھا اسلئے ان احکام کی عملی توضیح کے لئے ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو معصومہ ہو، تاکہ مسلمان خواتین اس کی تاسی کر سکیں۔ معصومہ عالمؑ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وجود میں آئی تھیں اور دورِ حیاتِ رسولؐ میں اپنے عظیم المرتبت والد کے فرائض میں اُن کا ہاتھ بٹاتی رہیں ——— لیکن ابھی آپ کو ایک فریضہ انجام دینا تھا، وہ فریضہ جس میں آپ کو عورتوں کے ساتھ ہی مردوں کی قیادت بھی فرمانا تھی، جس میں آپ کو شریعت اسلامیہ کے ایک اہم رُکن یعنی مسئلہ خلافت اسلامیہ کی توضیح و تشریح فرمانا تھی، جس منزل پر آپ کو احقاقِ حق و ابطالِ باطل کے لئے ایک عدیم النظیر جہاد فرمانا تھا ——— ایسا جہاد جس کے نتیجہ میں حق اور باطل ایک

دوسرے سے اس طرح ممتاز ہو گئے کہ آج تک تلبیس و تدلیس کا کوئی حربہ اس باب میں سچے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کر سکا ہے!

خلافت کے باب میں حضرت سرور کائناتؐ نے جتنی بھی ہدایات فرمائیں مسلمانوں نے ان کی مختلف توجیہ و تشریح کر کے انہیں اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا، حتیٰ کہ غدیر کے کھلے ہوئے اعلان وصایت کے سلسلہ میں بھی طرح طرح کے مطالب پیدا کر دیئے گئے۔ اور اس طرح حق پہ باطل کے اتنے غلاف چڑھا دیئے گئے کہ حق اور باطل میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا، اس سلسلہ میں حاشیہ آرائیوں، غلط بیانیوں اور جھوٹے دلائل کا اتنا طومار باندھا گیا کہ خود حضرت امیر المومنینؑ پر یہ تہمت عائد کر دی گئی کہ آپ نے رسولؐ کے بعد منصب خلافت پر قبضہ کر لینے والوں کی بیعت فرمائی تھی، حق پر یہ ایک انتہائی مہلک وار تھا جو باطل کی جانب سے عائد کیا گیا تھا، اور شیطان کی اس ضرب نے ملت اسلامیہ کو گمراہی، اور شریعت کے ایک اہم رکن کے متعلق شدید غلط فہمی کا شکار کر دیا تھا، حق و باطل کا یہ انتہائی اہم ٹکراؤ تھا جو وفات رسولؐ کے بعد ہی وجود میں آیا، اس موقع پر رسولؐ زادی حق کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئی اور اس نے اپنے خاموش مجاہدہ کی مدد سے باطل کو وہ دندان شکن شکست دی کہ پوری ملت اسلامیہ کو گمراہی کا شکار کر دینے کا شیطانی خواب ہمیشہ کے لئے مسمار ہو گیا!

معرکہ حق و باطل میں خاتون جنتؑ کی اس بے عدیل کامیابی کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عبرت خیز بھی!

دنیا جانتی ہے کہ شاہزادی ایک انتہائی دولت مند ماں کی اکلوتی وارث تھی، اور اس اعتبار اسے دنیاوی دولت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن یہ ساری دولت اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کر دی گئی، اور شاہزادی اس پر خوش تھی کہ

اس کی وہ دولت کی بدولت دنیا دولت اسلام سے مالا مال ہو گئی، شاہزادی اس رسولؐ کی پارۂ جگر تھی جو امت کا شفیق باپ اور رحمتِ عالم تھا، اور اس علیؑ کی شریکِ حیات تھی جو اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کے بھی فقرائے مدینہ کی امداد کرنا ضروری تصور کرتا تھا، خود شاہزادی کا کردار یہ تھا کہ اس نے شبِ عروسی پیوند دار لباس میں بسر کی اور بابا کا دیا ہوا لباس تو ایک فقیر کو عطا کر دیا ـــــــ شاہزادی کے اس کردار کو نظر میں رکھیئے اور پھر یہ سوچیئے کہ یہی عورت ایک جائداد کے لئے ایوان خلافت میں مقدمہ دائر کرتی ہے، گواہ پیش کرتی ہے، اور جب اس کا دعوای خارج کر دیا جاتا ہے تو خلافت مآب اور ان کے مشیر خاص سے اس حد تک ناراض ہو جاتی ہے کہ ان سے گفتگو بند کر دیتی ہے اور یہاں تک ہدایت کر دیتی ہے کہ اس کی میت پر بھی یہ لوگ نہ آنے پائیں ـ!

عمومی حالات ہوتے تو شاید شاہزادی کو اس کی پروا بھی نہ ہوتی کہ مسلمانوں نے آپ کی ایک جائداد لے لی ـ ممکن ہے کہ اگر کوئی غریب مسلمان آپ سے اس جائداد کا سوال کر لیتا تو آپ یقیناً یہ زمین اُسے عطا فرما دیتیں، ایسی حالت میں جس عورت نے اپنی ماں کی بے شمار دولت مسلمانوں پر قربان کر دی تھی وہ ایک ادنیٰ سی جائداد کے لیے مسلمانوں سے ہرگز تنازعہ نہیں کر سکتی تھی ـــــــ واقعہ یہ ہے کہ شاہزادی نے فدک کا سوال اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ آپ اس جائداد کو مسلمانوں سے عزیز رکھتی تھیں، یا خدانخواستہ اسے اپنی روزی کا ذریعہ خیال فرماتی تھیں، ایسا خیال بھی کفر کے مترادف ہے اس لئے کہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے آپ فدک کو اپنے رزق کا سہارا نہیں مانتی تھیں بلکہ رزق کے باب میں صرف اللہ پر توکل فرماتی تھیں، ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے فدک کا سوال کسی اور غرض سے اٹھایا تھا! ـــــ اور وہ غرض تھی باطل کو بے نقاب کر دینا!

آپ نے فدک کا دعویٰ دائر کیا تو اس میں آپ کی حیثیت مدعیہ کی تھی، اور حاکم وقت مدعا علیہ تھے، قانون اور انصاف کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ کہہ دے گا کہ مقدمہ کا فیصلہ ہمیشہ ایک غیر جانب دار عدالت کو کرنا چاہیئے۔ لیکن باب فدک میں ہم یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ خود مدعا علیہ جج کے فرائض انجام دے رہا ہے چنانچہ خلافت مآب نے جو مدعا علیہ کی حیثیت رکھتے تھے اپنی جانب سے کوئی ثبوت یا شاہد پیش کئے بغیر مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر دیا، اور اس طرح "تاریخ عدل و انصاف میں ایک ایسے باب کا اضافہ فرما دیا جس پر شاید انصاف قیامت تک ماتم کناں نظر آئے گا!

خلافت اسلامیہ کا بنیادی اصول عدل ہے لیکن مسلمانوں نے جس شخص کو خلیفہ منتخب کیا تھا وہ عدل و انصاف کے اس بنیادی اصول سے بھی ناواقف تھا، کہ کسی مدعا علیہ کو مقدمہ فیصل کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ ہر مقدمہ کا فیصلہ ایک غیر جانب دار ثالث ہی کر سکتا ہے!

اور پھر عدل و انصاف کا یہ کرشمہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ مدعیہ تو اپنے دعوے کے حق میں گواہ پیش کرتی ہے اور وہ گواہ نا قابل قبول قرار دے کے مسترد کر دیئے جاتے ہیں ——— اور مدعا علیہ اپنے حق میں کوئی گواہ بھی پیش نہیں کرتا بلکہ صرف ایک ایسے قول کی اساس پر جسے اس کے سوا اور کسی نے نہیں سنا تھا، مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر دیتا ہے!

اگر انصاف یہی ہے تو شاید قانون اور عدل کی ساری کتابیں دریا بُرد کر دینا پڑیں گی اور یہ بات مان لینا پڑے گی کہ مطلق العنان بادشاہوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون، اور آمریت کی ہر جابرانہ خواہش کا نام انصاف ہے!

معصومۂ عالمؑ کے اس اقدام نے ہمارے سامنے یہ صاف اور سیدھا

نا سوال پیش کر دیا کہ آیا وہ شخص بھی جو انصاف کے مبادی تک سے ناواقف ہو منصبِ خلافت کا اہل کہا جا سکتا ہے؟ — اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ ہے — "نہیں!" — اور یہیں سے ہر سلیم العقل انسان پر حق واضح ہو جاتا ہے!

سیدۂ عالم نے ابطالِ باطل کے معاملہ میں اسی پر اکتفا نہیں بلکہ باطل پر ایک اور ضرب بھی عائد کی!

آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے اپنی ناراضی کا اعلان کر دیا اور ان حضرات پر ایسی غضبناک ہوئیں کہ ان کو اپنے جنازہ تک پر آنے کی ممانعت کر دی!

دنیا جانتی ہے کہ سرکار دو عالمؐ یہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ فاطمہ میری پارۂ جگر ہے، جس نے اسے ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی، جس نے مجھے ایذا دی اس نے خدا کو ایذا دی، اور جس نے خدا کو ایذا دی وہ کافر ہو گیا! — اب اس اعلان رسالت کی روشنی میں یہ دیکھئے کہ فاطمہؑ مذکورہ بالا حضرات سے ناراض ہیں، اتنی ناراض کہ اپنی میت پر بھی ان کا آنا گوارا نہیں کر سکتیں، اب ایسی حالت میں ان حضرات کا خلیفہ رسولؐ کہلانا [redacted] کہاں تک تسلیم کیا جا سکتا ہے!

معصومۂ عالمؑ کے اس احتجاج کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ خلیفۂ وقت کی ذات اس منصبِ عظمیٰ کے لائق نہیں ٹھہری بلکہ وہ اصول بھی مہمل قرار پا گئے جن کے نتیجہ میں منصبِ خلافت ان حضرات کو حاصل ہوا، اس لئے کہ جن اصول کے نتیجہ میں خلافت ان حضرات کو نصیب ہو سکتی ہو جن کا ایمان بھی بہ نصِ رسولؐ مشتبہ قرار پائے وہ ہرگز صحیح اور اسلامی نہیں کہے جا سکتے!

ایک جائداد کا سوال اٹھا کے مسلمانوں کی خود ساختہ خلافت کا قصر منہدم کر دینا، جہاد حق و باطل کی تاریخ کا ایک ایسا نادر روزگار کارنامہ ہے جس پر آلِ رسولؐ کی تاریخ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے!

معصومۂ کونینؑ کی فتح مبین سے بھلا کسے انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے؟

آلِ رسولؐ کی دُور رس نگاہیں یہ تماشا بھی دیکھ رہی تھیں کہ آگے چل کے یہ دعویٰ کیا جائے گا کہ امیر المومنینؑ نے خلفائے وقت کی بیعت کر لی تھی اور اس طرح امامت حقہ پر پردے ڈال کے باطل کو فروغ دیا جائے گا، شریکۃ الرسولؐ نے اس فتنہ کا بھی خاتمہ کر دیا، اور وہ اس طرح کہ دنیا کا کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جناب فاطمہؑ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی —— اب سوال یہ ہے کہ جب معصومۂ عالمؑ نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تو پھر آپ کسے امام تصوّر فرماتی تھیں؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا یہ ارشاد متفق علیہ ہے کہ مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِيْتَةً الْجَاهِلِيَّةِ (جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کئے بغیر مر گیا وہ کفر کی موت مرا) اس ارشاد گرامی کی روشنی میں یہ لازمی ہے کہ سیدۂ عالمؑ جو مسلمان ہیں، سچی مومنہ ہیں، خاتون جنت ہیں، سیدۂ زنان بہشت ہیں ضرور اپنے امام زمانہ کی معرفت کامل رکھتی ہوں گی —— لیکن اسکے ساتھ ہی یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی بلکہ ان سے ناراض رہیں، ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں ——

(۱) یا تو جناب سیدہؑ کے ایمان سے ہاتھ دھو لیا جائے اس لئے کہ آپ نے خلیفۂ وقت کی بیعت نہیں کی تھی، اور

(۲) یا پھر یہ مان لیا جائے کہ وہ شخص سرے سے امام زمانہ تھا ہی نہیں جس کی بیعت سے آپ نے احتراز فرمایا تھا بلکہ امام زمانہ کوئی اور شخص تھا اور آپ اسی کی بیعت میں تھیں !

ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان جناب سیدہ ؑ کے ایمان سے انکار نہیں کر سکتا بلکہ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ سیدۂ زنان بہشت ہیں، ایسی حالت میں صرف دوسری ہی صورت صحیح قرار پاتی ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ حضرت ابو بکر کی خلافت کا مزعومہ ختم ہو جاتا ہے بلکہ امیر المومنینؑ کی امامت حقہ کا بھی ناقابل انکار ثبوت مل جاتا ہے اس لئے کہ وہ ذاتِ پاک جو شریکۃ الرسول تھی، معصومہ تھی، سیدۂ زنان بہشت تھی، آپ ہی کو امام تسلیم کرتی تھی، اور صرف آپ ہی کی بیعت کو جائز قرار دے رہی تھی !

جناب فاطمہ ؑ سے زیادہ منشائے رسالت کو جاننے اور سمجھنے والا بھلا اور کون ہو سکتا ہے ؟ ایسی حالت میں جب یہ عارف منشائے رسولؐ، بضعۃ الرسولؐ، شریکۃ الرسول، علیؑ کی امامت کو حق قرار دے رہی ہے تو پھر اس کے حق ہونے سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے؟

استقرار حق کے سلسلہ میں معصومہؑ کی یہ سعی بلیغ معرکہ حق و باطل کی تاریخ کا ایسا سنہرا باب ہے جس پر خود حق بجا طور سے ناز کر سکتا ہے !

جناب سیدہ ؑ نے تیغ و سنان سے جنگ نہیں کی اس لئے کسی نے اس "جنگ" میں آپ کی فتح مبین پر غور نہیں کیا جس میں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حق کو فتح نصیب ہوئی اور باطل کی شہ رگ کاٹ دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ معصومہ کا یہ مجاہدہ بھی حق و باطل کی جنگ کا ایک جزو تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ یہ خونیں جنگ نہیں تھی "سرد جنگ"، یا "اعصابی جنگ" تھی، جس میں آل رسولؐ نے فتح مبین حاصل کی، اور اس قرآنی اعلان کو سچ کر دکھایا کہ حق ہمیشہ مظفر و منصور ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ ناکام

و نامراد !

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوتے ہی آلِ رسول کو دو مورچے سر کرنا پڑے، ایک بیرونی حملہ آوروں کا مورچہ، جسے تحریک اسلامی کے قائدِ اعظم نے مفاد پرستوں کو مرتدین کے مقابلہ میں صف آرا کر کے ختم کر دیا۔ اور دوسرا اندرونی خطرہ جس میں مسلمانوں کے عقائد برباد ہونے کا احتمال تھا، اسے رسول زادی نے اپنے خاموش مجاہدہ سے دُور کر دیا !

مسلمان بھی بچا لیے گئے اور اسلام کو بھی بچا لیا گیا۔ شیطان کے دونوں وار خالی گئے۔ اور حق کی اتنی بڑی جنگ جیت لی گئی !

اور مزہ کی بات تو یہ ہے کہ اس "جنگ" میں نہ تلوار چلی، نہ خون بہا، نہ قربانیاں پیش کرنے کی نوبت آئی، نہ حق پرستوں کو جان دینے کی ضرورت محسوس ہوئی ____ بلکہ صرف امیر المومنینؑ کی خاموشی اور معصومہؑ کے آنسوؤں نے یہ دونوں مورچے سر کر لئے !

اللہ اللہ ! آلِ رسولؐ کی کیا شان ہے کہ ان کا ایک مرد چپ رہتا ہے تو حق کے پرچم کھل جاتے ہیں اور ایک عورت پکار اٹھتی ہے تو قصرِ باطل کے کنگرے منہدم ہو جاتے ہیں !

حق پرستی کی تاریخ کتنی ہی شاندار کیوں نہ سہی، لیکن اس پایہ اور اس شان کے فاتحین پیش کرنے سے بہر حال قاصر ہے۔ اور یہ عظمت و شرف صرف خاتم النبیینؐ کی آل ہی کو نصیب ہے کہ ان کی لب کشائی میں بھی حق کے لئے ظفر ہے اور ان کی خاموشی میں بھی حق کی فتح !



تبلیغ اسلام

مرتدین، منافقین اور مفاد پسند مسلمانوں کے سلسلہ میں سیاست علویہ کو بے پناہ کامیابی نصیب ہوئی لیکن ابھی دوسرے عظیم مسائل موجود تھے اور تحریک اسلامی کے قائد کو ان امور میں بھی اپنی بصیرت، معاملہ فہمی اور حکمت وسیاست کا امتحان دینا تھا۔ مرتدین کے استیصال کے ساتھ اندرون ملک کا خطرہ دفع ہو گیا تھا لیکن سلطنت اسلامی کی سرحدوں پر طوفان اٹھتے نظر آرہے تھے۔ ایران کا کسریٰ اور روم کا قیصر اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت سے خائف تھے، اور اسے کچل دینے کے آرزومند، ایران اور شام کی سرحدوں سے جنگی باجے بجنے کی صدائیں آنا شروع ہو چکی تھیں اور یہ یقینی تھا کہ آج نہیں تو کل، مسلمانوں کی نئی سلطنت کو دنیا کے ان قدیم حکمرانوں سے ضرور ٹکر لینا پڑے گی ——— ملت اسلامیہ کا ناخدا، اور دعوت اسلامی کا قائد اس صورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، اسے معلوم تھا کہ قیصر اور کسریٰ ریگ زار عرب سے ابھرتی ہوئی اس نئی طاقت کا وجود برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا پر اسلام کا اثر اسی وقت غالب ہو سکتا ہے جب ان قوتوں کو شکست دیکر مسلمان صف اول کی بین الاقوامی طاقت بن جائیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھا کہ عربستان کے باہر اسلام کی آواز تبھی پہنچائی جا سکتی ہے جب قیصر وکسریٰ کی تیار کردہ سد سکندری جس نے جزیرہ نمائے عرب کو گھیر رکھا تھا توڑ ڈالی جائے، اور انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرا کے اللہ کی عبدیت میں دے دینے کا اسلامی تصور اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب انسانی حاکمیت کے ان دونوں سب سے بڑے بتوں کو جنہیں دنیا قیصر وکسریٰ کے نام سے یاد کرتی تھی پاش پاش

کر ڈالا جائے ـــــ یہ تھی وہ صورتِ حال جو مرتدین کے استیصال کے بعد انقلاب اسلامی کے داعی کے سامنے تھی اور اُسے اس حکمت ربانی کے ساتھ اس کا بھی مقابلہ کرنا تھا، جس کا مظاہرہ وہ مرتدین کے باب میں کر چکا تھا!

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مرتدین کے خاتمہ کے بعد امیرالمومنین؏ نے حصول خلافت کے لیۓ جنگ کیوں نہیں کی؟ ـــــ لیکن یہ اعتراض دراصل تاریخ اسلامی اور خود امیرالمومنین؏ کے صحیح موقف کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ امیرالمومنین؏ کو بھی انہیں دعویداران خلافت و طلبگاران سلطنت کی سطح کا انسان تصوّر کرتے ہیں جنہوں نے ہر ہر قدم پر حصول حکومت کے لیۓ بغاوتیں کر کے مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا جنازہ نکال دیا، ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر ڈالا، اور ان کی اس عظیم سلطنت کو خانہ جنگیوں کا لامتناہی سلسلہ جاری کر کے برباد کر ڈالا، جس کی سرحدیں بنگالہ سے لیکر مراقش تک پھیلی ہوئی تھیں! ـــــ دراصل یہ لوگ امیرالمومنین؏ کی حیثیت، آپ کے مقاصد، آپ کے طریق کار، تاریخ اسلام میں آپ کے موقف اور اسلامی تحریک سے آپ کے تعلق کو قطعاً نہیں سمجھتے اور آپ کے افعال و اعمال پر ایک معمولی طلبگار سلطنت کے افعال کے زاویہ سے نظر ڈالتے ہیں، چودہ سو سال تک شاہی و سلطانی کے مکروہ نظام میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے انکے فکر و نظر کے سانچے ہی بگڑ گئے ہیں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہی غلط ہو گیا ہے اور وہ مقام علوی کی عظمت و رفعت سمجھنے کی اہلیت ہی کھو چکے ہیں، وہ اس حقیقت کو سرے سے نظر انداز کرتے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام بادشاہت کے آرزومند نہیں تھے بلکہ وصی رسولؐ تھے، اور اس لحاظ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مشن کی تکمیل آپ کا مقصد حیات تھی، آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تحریک اصلاح و انقلاب کے مسلمہ قائد تھے، اور اس اعتبار سے اس تحریک کو

کامیاب بنانا آپ کی زندگی کا نصب العین تھا، آپ اشاعت اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست راست رہ چکے تھے، اس لئے آپ کو اگر کچھ فکر تھی تو اسلام کا پیغام عالم گیر بنا دینے کی ——— آپ خلافت کا دعویٰ ضرور فرماتے تھے لیکن حکومت آپ کے لئے مقصود بالذات نہیں تھی، صرف منہاج مقصد کی حیثیت رکھتی تھی، آپ کو حکومت سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ اسکے ذریعہ سے آپ ایک طرف تو مسلمانوں کی اعلےٰ اخلاقی و روحانی تنظیم قائم رکھ سکتے تھے، اور دوسری طرف اس کی مدد سے اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ خلافت سے آپ کا مقصد نہ ذاتی عیش تھا اور نہ حصول شہرت، ایسی حالت میں آپ تمام معاملات پر اپنے مشن اور اسلام کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے غور فرماتے تھے اور وہ راہ عمل اختیار فرماتے تھے جو دعوت اسلامی کو عام کرنے کے لئے ضروری اور سود مند ہوا کرتی تھی، اس موقع پر بھی آپ نے وہی کیا جو آپ کے مقصد حیات کے اعتبار سے ضروری تھا۔ اور جس سے ان مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی تھی جو آپ کو دل وجان سے عزیز تھے!

اگر اس موقع پر آپ حصول خلافت کے لئے شمشیر بکف ہو جاتے تو اس کے دو ہی نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو شکست ہو جاتی، اور وہ مقدس ہستیاں شہید ہو جائیں جن پر تبلیغ واشاعت اسلام کا انحصار تھا، اور دوسرے یہ کہ آپ کامیاب ہو جاتے اور تخت خلافت آپ کے قدموں تلے آجاتا، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کا مجموعی نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے ——

ظاہر ہے کہ اگر مومنین صالحین کی یہ جماعت ختم ہو جاتی تو اسلام مجرد رہ جاتا، منافقین کا، ان سابق مرتدین کا جن کو ابھی ابھی بزور شمشیر مسلمان بنایا گیا تھا اور ان جاہل عربوں کا جنہوں نے صحیح طور پر اسلامی دعوت انقلاب کو سمجھا ہی نہیں تھا، ان لوگوں سے یہ توقع کرنا

کہ وہ دنیا کو اسلام کے صحیح تصور سے آگاہ کرانے یا اسلامی نظام کو دنیا میں قائم کرتے قطعاً مہمل سی بات تھی اور یہ لازمی تھا کہ امیر المومنین کی شہادت کے ساتھ ہی اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ ایسی حالت میں شہادت کا مقصد ہوتا اسلام کی موت اور ظاہر ہے کہ امیر المومنین اس صورت حال کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے ——— رہا یہ امر کہ جنگ میں آپکو کامیابی ہوتی۔ تو اول تو بظاہر اس کی کوئی امید ہی نہیں تھی اور دوسرے اگر آپ کامیاب بھی ہو جاتے تو آپ ایک ایسی قوم پر حکمران ہوتے جو اصولی اور بنیادی طور پر آپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی، جو تلوار کی نوک پر آپ کی اطاعت تو کرتی لیکن تبلیغ اسلام کی مہم میں آپ کا ساتھ نہ دیتی جو آپکو بادشاہ تو مانتی لیکن امام کی حیثیت سے قبول نہ کرتی۔ جسکے سر اسلام کے سامنے جھکتے اور دل صنم کدوں کا طواف کرتے، اور جس پر آپ ساری دنیا کو مسلمان بنانے کے لئے تو کیا، خود سرحد اسلامی کی مدافعت کے لئے بھی اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی حالت میں آپ کو اپنی تمام تر توجہ خود عربوں میں اسلام حقیقی کی اشاعت پر مرکوز رکھنا پڑتی اور قیصر و کسریٰ کو شکست دے کر ساری دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام دھرا رہ جاتا ...... ایسی حالت میں آپ نے وہی کیا جو حکمت ربانی کے امین کو کرنا چاہئے تھا، جو صرف سیاست الٰہیہ کے وارث عمل میں لا سکتے تھے اور جس حسن تدبر کی مثال اولیاء اللہ کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتی:

آپ نے حکومت کے باب میں اپنی خاموشی جاری رکھی اور ایسا طرز عمل اختیار فرمایا جس کے نتیجہ میں فرمانروایان سلطنت اسلامی میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اب یہ سلطنت ان کی "اپنی" ہے انکی طاقت کو اب کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے اس مملکت کے تحفظ کی ذمہ داری اب خود انہیں پر ہے!

اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے "اپنی مملکت" کو قیصر و کسریٰ کے خطرہ سے محفوظ رکھنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور جن اسلام دشمن قوتوں کا استیصال خود امیر المومنینؑ اور مومنین صالحین کا فرض تھا، ان کو ختم کرنے، انکے مقابلہ میں تیغ آزما ہونے کی ذمہ داری ان مفاد پسند مسلمانوں پر ڈالدی گئی جو سلطنت کے لئے تو کفار سے لڑ سکتے تھے، لیکن ایک مجرد اصول کی خاطر میدان جنگ میں بھیجے جاتے تو وہی منظر پیش کرتے جو اُحد اور حنین میں پیش کر چکے تھے!

امیر المومنینؑ نے تخت و تاج کے شیدائیوں کو سلطنت کا کھلونا دے کے جو فائدہ اٹھایا وہ سیاست علویہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہے، آپ کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ

(۱) ان عرب فوجوں نے جو منافقین، سابق مرتدین، مال غنیمت کے شیدائیوں، دولت کے پرستاروں، اور عربی مملکت کے فداکاروں پر مشتمل تھیں توسیع سلطنت اور حصول دولت کے جذبہ میں ان قیصر و کسریٰ کی کمر توڑ دی جن سے اسلام کو شدید خطرہ تھا، حکمران خوش تھے کہ ان کو "فاتح اعظم" کا لقب حاصل ہو گیا، سپاہی مسرور تھے کہ ان کو کافی مال غنیمت میسر آگیا اور تحریک اسلامی کا قائد علیؑ خوش تھا کہ مومنین صالحین کی قربانی دیئے بغیر دعوت اسلام کے محترم ارکان کو آگ اور خون کی بھٹی میں جھونکے بغیر، اور سچے مسلمانوں کو تلوار کی آنچ سے محفوظ رکھتے ہوئے اسلام کے دو خطرناک دشمنوں کا خاتمہ کرا دیا گیا!

(۲) ایران، مصر، شام، فلسطین اور عراق پر عربوں کا پرچم فتح لہرانے لگا، جس کے نتیجہ میں ان ممالک میں اس صحیح اور سچے اسلام کی

تبلیغ آسان ہو گئی جس کے علمبردار حضرت علیؑ مرتضےٰ تھے، کفر کی
قوت ٹوٹ گئی اور سچے مسلمانوں کو ان علاقوں میں دعوت اسلام
عام کرنے کا پورا موقع حاصل ہو گیا!

(۳) قیصر و کسرےٰ کے مقابلہ میں جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں ہزاروں
مسلمان مارے گئے لیکن حضرت علی علیہ السلام کی ذہانت کے نتیجہ
میں وہ حقیقی اور سچے مسلمان جو اسلام کے مقصود حقیقی کو سمجھتے تھے
جو رسولؐ کی دعوت انقلاب کا سچا نمونہ تھے، جو اسلام کی اعلیٰ اخلاقی،
وروحانی قدروں کے امین تھے، اور جنہوں نے لسانِ فیضِ ترجمان
رسالت سے اسلام کی حقیقی تفسیر و تشریح معلوم کی تھی، ان جنگوں
سے دور رہے اور اسطرح وہ لوگ بچ گئے جو مفتوحہ علاقوں میں
اسلام کی تبلیغ کے حقیقی معنوں میں اہل تھے،

(۴) قیصر و کسرےٰ کی ذلّت آمیز شکست نے ساری دنیا کی نگاہیں اسلام
کی طرف موڑ دیں اور پہلے جس دین کا مذاق اڑایا جاتا تھا اسی کو اب
دنیا بڑی سنجیدگی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی، غیر ممالک کے لوگوں کو
بھی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی فکر
پیدا ہو گئی، اور مسلمانوں کے سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت
بن جانے کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ دنیا بھر میں اسلام کو جاننے کا
شوق بیدار ہو گیا ـــــــ اس طرح اسلام کے پیغام کو عام کرنے
کے لئے زمین تیار ہو گئی، اور ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو گئی جو
تبلیغ میں بے حد معاون ہوا کرتی ہے ۔

(۵) امیر المومنینؑ اور دوسرے علمائے امت کو منافقین کی سازشوں سے

آزاد ہو کر مدینہ میں قرآن و حدیث اور شریعت کی تعلیم عام کرنے کا موقع حاصل ہو گیا، تاریخیں شاہد ہیں کہ امیرالمومنینؑ اور دوسرے علمائے اُمّت اس زمانہ میں جبکہ فرمانروایان وقت تسخیر ملکی کی مہم میں مصروف تھے مدینہ میں وعظ و تبلیغ و ہدایت کا کام پوری سرگرمی سے انجام دیتے رہے ـــــ اور اس ترتیب کا یہ نتیجہ تھا کہ مدینہ علوم اسلامی کا گہوارہ بن گیا، مدینہ کو فقہ اور حدیث میں جو مرکزیت حاصل ہوئی وہ دوران فتوحات ملکی میں امیرالمومنینؑ کی انہیں علمی کاوشوں کا نتیجہ تھی، منافقین مکہ اور مدینہ میں موجود رہتے تو وہ اسلامی علوم کی اشاعت میں ہمیشہ رخنہ اندازی کرتے رہتے اور ہرگز اسے پسند نہ کرتے کہ اس دین کا علم عام ہو، جسے وہ اپنے دل کے پردوں میں ناپسند کرتے تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ مال غنیمت کی تمنا میں مدینہ سے دور ایران و مصر میں مصروف جنگ تھے اس لئے امیرالمومنینؑ کو یہ موقع مل گیا کہ صدر اسلام کو مستحکم کر دیں اور مکہ اور مدینہ کو جو مفاد پسندوں کے اثرات کے نتیجہ میں عربوں کی سیاسی اور عسکری قوت کے مرکز بن گئے تھے۔ اپنے اثرات کے ماتحت علوم و تمدن اسلامیہ کا مرکز بنا دیں؛

(۶) اندرون عربستان میں اسلام کی تبلیغ مکمل کر لی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ حیات میں عربوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس قبولیت اسلام کی حقیقت بس اتنی تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کا انتقال ہوتے ہی عربوں کا بیشتر حصہ مرتد ہو گیا تھا، ان مرتدین کو دورانِ خلافت اوّل دوبارہ بنوک شمشیر مسلمان بننے پر

مجبور کیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہونے والے سچّے مسلمان نہیں کہے جا سکتے، ضرورت اس کی تھی کہ عربوں میں اسلام کی صحیح تبلیغ کیجائے، فرمانروایان وقت چونکہ تسخیر ممالک میں مصروف تھے، اس لئے وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے امیرالمومنینؑ پر چونکہ حکومت یا جنگ کی ذمہ داریاں نہیں تھیں اس لئے آپ اور آپ کے ساتھی خاموشی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربستان میں اسلام کے قدم ہمیشہ کے لئے جم گئے!

مفتوحہ ممالک میں جو اسلام پھیلا وہ ان مسلمان فوجوں کی بدولت نہیں پھیلا جو ان علاقوں کو فتح کرنے گئی تھیں اس لئے کہ ان فوجوں میں چاہے کتنے ہی اچھے تیغ زن کیوں نہ شامل ہوں لیکن اسلام اور اُس کے اعلیٰ نظامِ زندگی کو جاننے والے بہت کم تھے، پھر اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ عرب سورماؤں کی تلواریں سروں کو تو جھکا سکتی تھیں لیکن دلوں کو نہیں جھکا سکتی تھیں، دلوں پر قبضہ شمشیر کی نوک سے نہیں ہوتا، علم، اخلاق، محبت اور روحانیت کی طاقتوں سے ہوا کرتا ہے، یہ کام جنگ آزما سپاہیوں کا نہیں ہے، پُرامن مبلغین اور علمائے اُمّت کا ہے، امیرالمومنینؑ ایک اعلیٰ درجہ کے مبلغ اور نفسیاتِ انسانی کے ایک بے پناہ ماہر کی حیثیت سے اس حقیقت کو خوب جانتے تھے، چنانچہ آپ نے تلوار کی فتح کو محبّت کی فتح میں اور سروں کے جھکاؤ کو دلوں کی تسخیر میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اُدھر مسلمان ایک مُلک فتح کرتے تھے ادھر صلحائے اُمّت اس ملک میں تبلیغ کرتے پہنچ جاتے تھے اور آج اسی سیاست کا یہ کرشمہ ہے کہ ایران و مصر و شام سیکڑوں سیاسی انقلابات کے باوجود اسلام کے حلقہ بگوش نظر آرہے ہیں!

امیرالمومنین علیہ السلام اِس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ جن علاقوں پر مسلمان نوک

شمشیر قبضہ کریں گے وہاں کے لوگوں میں فطری طور پر مسلمانوں کی مخالفت پیدا ہو جائے گی، اس لئے کہ ان میں یہ احساس عام ہو گا کہ مسلمانوں نے ان کی سلطنت اور آزادی کا خاتمہ کر دیا ہے، ان کے تہذیب و تمدن کو فنا کر دیا ہے، ان کے معابد کو ویران اور ان کے مذہب کو تاراج کیا ہے، اور محض قوت کے بل پر ان کو عرب سلطنت کا غلام بنا دیا ہے، اس احساس کے نتیجہ میں وہ اپنے دل کے پردوں میں مسلمانوں کے دشمن رہیں گے، مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہیں گے اور جیسے ہی ان کو موقع ملے گا وہ مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر کے عربوں کے ساتھ ہی اسلام کو بھی اپنے ملک سے بے دخل کر دیں گے، عرب فاتحین اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے، چنانچہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ اگر امیرالمومنینؑ نے مفتوحہ ممالک میں تبلیغ کا بندوبست نہ کر دیا ہوتا تو عربوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان علاقوں سے اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا!

ہمارے اس دعوے کا ثبوت خود اسلامی تاریخ ہے،

تلوار کی فتح اتنی بے اثر اور عارضی ثابت ہوئی کہ مصریوں نے محض چند ہی سال کے اندر تیسری خلافت کا خاتمہ کر کے حجازی عربوں کے طمطراق کو خاک میں ملا دیا، اور وہی مصری جن کو ابھی پندرہ سال قبل عربوں نے شکست دی تھی مدینہ کے سیاہ و سفید کے مختار بن گئے! —— یہی نہیں بلکہ مصریوں نے "فاتحین" کے پورے گروہ کو جو مصریوں کے خوف سے گھروں میں کنڈیاں لگائے بیٹھا تھا نظر انداز کرتے ہوئے اس شخص کو تخت خلافت سونپ دیا جسے یہ جماعت پورے پچیس سال تک اپنے مقاصد کی راہ میں سنگ گراں تصور کرتے ہوئے ٹھکراتی رہی تھی، اور نام نہاد عرب "فاتحین" کا یہ عالم تھا کہ ان کو چار و ناچار اسی شخص کی بیعت کرنا پڑی جسے وہ اپنے شہنشاہیت پسندی کے عزائم کا سب سے

بڑا دشمن تصور کرتے تھے!

شامیوں نے تلوار کی فتح کا جو بدلہ دیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی خونچکاں افسانہ ہے، دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ وہی شامی جن کو مدینہ والوں کی شمشیر برق تاب نے اپنا محکوم بنایا تھا محض تیس سال کی مختصر مدت میں خود مدینہ کے حاکم ہو گئے، اسلامی سیاست کا مرکز مدینہ سے دمشق منتقل ہو گیا اور مکہ اور مدینہ کو شامیوں کی شمشیر انتقام کی بدولت بار بار تاراجی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایرانیوں نے اپنی شکست کا انتقام اس طرح لیا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر بنی عباس کے پردہ میں عربوں پر ایرانیوں کا تسلط قائم ہو گیا!

ان تاریخی حقائق سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے؟

یہ واقعات بجائے خود اس کا ثبوت ہیں کہ امیر المومنینؑ نے حالات کا بہت صحیح اندازہ لگایا تھا، اور آپؑ کا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا کہ تلوار کی فتح چونکہ عارضی اور بے اثر ہے اس لئے اخلاقی، علمی، روحانی اور ذہنی فتح حاصل کی جانا چاہیئے تاکہ مفتوحہ ممالک پر اسلام کا اثر قائم رہ سکے، آپ ہمیشہ اسی کوشش میں مصروف رہے، چنانچہ آپ کی کاوشوں کا جو نتیجہ نکلا وہ آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے!

عرب فاتحین نے قادسیہ، نہاوند اور یرموک میں خون کی ندیاں بہا کے ایران و مصر و شام و عراق پر جو پرچم فتح لہرایا تھا وہ تو چند ہی سال میں سرنگوں ہو گیا، لیکن امیر المومنینؑ نے روحانی، ذہنی اور مذہبی میدان میں جو پرچم فتح نصب کیا تھا وہ آج تک پوری شان سے جلوہ گر ہے، چنانچہ ایران چلے جایئے، آج وہاں سعد بن وقاص کی فتح کا کوئی نشان باقی نہیں ہے، نہاوند کے میدان میں جو خون بہا تھا وہ مدتیں ہوئیں خشک ہو چکا، نہ معلوم کتنی سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں چودہ سو برس میں نہ معلوم کتنے بادشاہ آئے اور گئے لیکن ایران پر امام علی رضا

کی حکومت بدستور قائم ہے، اور امیرالمومنینؑ کے اس فرزند کو وہ دائمی حکمرانی حاصل ہے جو صرف دلوں کی تسخیر سے حاصل ہوا کرتی ہے! ——— عراق پر مثنٰی بن حارث شیبانی کی لشکر کشی اور خالد بن ولید کی یلغار آج تاریخ کا ایک ورق پارینہ ہے اور اسلامی تاریخ کے طلبہ کے علاوہ اس عارضی ملک گیری کی داستان بھی کسی کو معلوم نہیں، لیکن نجف، کربلا کاظمین اور سامرہ علوی فتح روحانی کے وہ نقشِ جمیل ہیں جو آج بھی دنیا کو آل رسولؐ کی فتح مبین کے مشاہدہ کی دعوت دے رہے ہیں، آل رسولؐ کے ان مآثر متبرکہ کے علاوہ سلمان، جابر بن عبداللہ انصاری اور حذیفہ یمانی کے مزارات اپنی مرجعیت کے ذریعہ امیرالمومنینؑ کی اصابت فکر کی گواہی دے رہے ہیں!

شام میں یرموک کی فتح بھلائی جا چکی، خالد کی تلوار کسی عجائب گھر میں بھی موجود نہیں لیکن زینبؑ و ام کلثومؑ کے ناموں سے منسوب مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں، اور امیرالمومنینؑ کی حقانیت کا اعلان کر رہے ہیں، آج شام میں جا کے دیکھ لیجئے کہ اس ملک میں جو آل رسولؐ کے دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز کہلاتا تھا، اسلام کے مآثر کس ذاتِ پاک سے تعلق رکھتے ہیں؟ آج شام پر مدینہ کی قرشی حکومت نہیں، مدینہ والوں کی سلطنت کا کوئی عکس موجود نہیں، تلوار کی فتح کی کوئی نشانی موجود نہیں۔ لیکن آل رسولؐ کی مظلومانہ تبلیغ کے آثار چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ حضرت زینبؑ، حضرت ام کلثومؑ، حضرت سکینہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت مقداد، حضرت حجر بن عدی، حضرت بلالؓ، حضرت ابی بن کعب، حضرت رقیہ بنت الحسینؑ، حضرت عبداللہ ابن جعفر، حضرت عبداللہ بن امام زین العابدینؑ، حضرت فاطمہ بنت الحسینؑ، اور حضرت عبداللہ بن امام جعفر صادقؑ کے مزارات، قیدخانہ شام، مشہد راس الحسینؑ، منبر سید سجادؑ، بازار شام کا پھاٹک اور سرہائے شہدائے کربلا کا مدفن آج بھی شام

میں اسلام کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں، تلوار کی فتح کے آثار مٹ گئے لیکن امیرالمومنینؑ اور خانوادۂ رسالت کی روحانی فتح شام کو اسلامی ممالک کا گہوارہ بنائے ہوئے ہے!

لبنان میں محض ایک تاریخی عمارت ہے اور وہ ہے امیرالمومنینؑ کے صاحبزادے حضرت محمدؐ بن حنفیہ کا روضہ، جو لبنان کے مسیحی ماحول میں بھی اسلام کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔

مصر میں مشہد راس الحسین کو جو مرجعیت حاصل ہے وہ کسی دوسری عمارت کو حاصل نہیں۔

یمن تلوار سے فتح نہیں ہوا، امیرالمومنینؑ کی تبلیغ سے فتح ہوا۔ لیکن علوی تبلیغ کا اثر کچھ اتنا گہرا تھا کہ اسے اسلام سے وابستہ رکھنے کے لئے سرزمین یمن پر نہ تو کوئی قربانی دینا پڑی اور نہ علیؑ کے بعد کسی دوسرے کو اس علاقہ میں تبلیغ کی ضرورت محسوس ہوئی، آج یمن میں اسلام کی بقا اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے، کہ اسلام کو کسی عسکری فتح کی ضرورت نہیں تھی، اسلام پرامن طریقہ پر ہی پھیل سکتا تھا اور پھیلا، شام و ایران و عراق اگر آج مسلمان ہیں تو اس لئے نہیں کہ ان علاقوں کو بزور شمشیر اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا، بلکہ ان علاقوں میں اسلام کا وجود آل رسولؐ کے روحانی اور تبلیغی مجاہدات اور ان کی بے مثل قربانیوں کا صدقہ ہے، یمن چونکہ تبلیغ سے مسلمان ہوا تھا اس لئے وہاں کسی قربانی کی ضرورت نہیں تھی، عراق، ایران اور شام تلوار سے فتح ہوئے تھے، اسلئے وہاں دلوں کی تسخیر ضروری تھی، یہ کام فاتحین نے نہیں کیا، خانوادۂ رسالت نے انجام دیا۔ چنانچہ آج اگر یہ ممالک اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور عرب سلطنت کے خاتمہ کے ساتھ ہی دوبارہ اپنے آبائی مذاہب کی طرف نہیں پلٹ گئے تو یہ فیض ہے اس دلوں کی فتح کا، اس

روحانی اقتدار کا، اور اس سچی مظلومانہ تبلیغ کا جس کے علمبردار امیر المومنینؑ تھے!
مزید یقین کی ضرورت ہو تو اندلس پر نظر ڈال لیجئے، صیقلیہ کو دیکھ لیجئے، قبرص
روڈس کی بنیز کو ملاحظہ فرما لیجئے، جنوبی اطالیہ کے حالات پر نگاہ ڈال لیجئے، ان علاقوں
میں صرف تلوار کی فتح ظہور میں آئی، تبلیغ علوی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ہی
مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت میں زوال پیدا ہوا، ان علاقوں سے اسلام کا بھی
خاتمہ ہو گیا، شام و ایران و عراق و مصر کا بھی یہی حال ہوتا، لیکن آل رسولؐ نے دلوں
کی فتح کا جو بندوبست کیا تھا اسی کے نتیجہ میں یہ علاقے سیکڑوں سیاسی انقلابات کے
باوجود مسلمان ہیں اور اس خاموش سعی وجہد کی گواہی دے رہے ہیں جو امیر المومنینؑ
اسلام کے لئے فرما رہے تھے،
امیر المومنینؑ کی فتح مبین کا اس سے زیادہ کھلا اور روشن مظاہرہ اور کیا ہو
سکتا ہے کہ جن ممالک کو ان لوگوں نے فتح کیا تھا جو امیر المومنینؑ کو مسند خلافت سے دور
رکھ کے آل رسولؐ کو گوشہ گمنامی میں پھینک دینا چاہتے تھے انہیں ممالک کے عوام
آل رسولؐ کے مزارات انور کی خاک کو توتیائے چشم بنا رہے ہیں اور آج جبکہ عرب
فاتحین اور ان کے سرداروں کے نام صرف ارباب تاریخ کو یاد رہ گئے ہیں،
عوام نجف و کربلا، و خراسان کی روحانی عظمت کے سامنے سرنگوں نظر آ رہے ہیں۔
یہ ہے دلوں کی اس فتح کا مظاہرہ جو امیر المومنینؑ نے حاصل فرمائی اور جس کے نقوش
انتہائی ظلم وستم کے باوجود آج تک اسلامی عالم میں ہیرے کی طرح جگمگاتے نظر آ رہے ہیں!
تحریک اسلامی کے قائد کے عظیم تدبر اور اس کی بے پناہ تبلیغی صلاحیتوں کا اس
سے شاندار مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے تحریک اسلامی کے جواہر پاروں اور اسلام
کے پر امن مبلغوں کو خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا اور چند سال تک تخت خلافت
سے محروم ہونے پر صبر فرما لیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت اور سلطنت کے پروانوں نے

قیصر و کسریٰ کے سے دشمنان اسلام کی کمر توڑ دی، دور دراز ممالک اسلام کے ظاہری ڈھانچہ سے واقف ہو گئے اور آل رسول کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے خاموش مجاہدات اور پُر امن تبلیغ سے ان علاقوں کو ہمیشہ کے لئے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیں!

اگر تحریک اسلامی کا قائد اعظم دور فتوحات میں مسلمانوں سے ظاہری تعاون کا مظاہرہ نہ کرتا تو تبلیغ اسلام کے یہ زریں مواقع اسے ہرگز نصیب نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بطل اسلام نے اس کا لحاظ نہیں کیا کہ تاج شاہی کس کے سر پر جگمگا رہا ہے یا تاریخ کن شخصیتوں کے ساتھ فاتح ایران وشام کے الفاظ استعمال کرے گی؟ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر چھوٹے قلب ودماغ کے لوگ کرتے ہیں۔ حکمت ربانی کے امین ایسی ادنیٰ باتوں پر نظر نہیں ڈالتے۔ ان کو صرف اپنے اعلیٰ مقاصد کی فکر رہتی ہے اور وہ ان مقاصد کے اعتبار سے ہی اپنے اقدام تجویز کرتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ کے سامنے غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ کا سوال تھا، قیصر و کسریٰ کی سی اسلام دشمن قوتوں کو ختم کر دینے کا مسئلہ تھا۔ اسلامی سرحدوں کو محفوظ بنا دینے کی ضرورت تھی، اور آپ کو وہ طرز عمل اختیار کرنا تھا جو آپ کے ان مقاصد کو پورا کر سکے، چنانچہ آپ نے ایک دوربین قائد کی حیثیت سے تخت خلافت کے حصول میں اپنی قوتیں ضائع نہیں کیں، بلکہ وہ انداز اختیار فرمایا جس کے نتیجہ میں آپ کے تمام مقاصد خود بخود حاصل ہو گئے، مومنین کو آگ اور خون کی ہولی نہیں کھیلنا پڑی، سلمان وابوذر تلوار کی آنچ سے بھی محفوظ رہے۔ سچے انقلابیوں کو قیصر و کسریٰ سے ٹکراؤ بھی نہیں لینا پڑا اور دنیا نے دیکھا کہ دشمنان اسلام کی قوت پارہ پارہ ہو گئی، اسلام کی سرحدیں ان لوگوں نے جن کو انقلاب اسلامی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو صرف دولت کے لئے لڑ رہے تھے قائدہ اُٹھایا، تحریک اسلامی کے ان شیدائیوں نے جو جنگ سے دور، امن کی فضا میں زندگی بسر کر رہے

لڑنے والے سلطنت کے لئے مرتے رہے، اور صلحائے اُمت بقائے اسلام کے لئے جیتے رہے۔ اس سے زیادہ مدبرانہ قیادت اور تحریک اسلامی کی حیرت افروز لیڈرشپ اور کیا ہو سکتی ہے؟

امیرالمومنین علیہ السلام کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مفتوحین میں ہمیشہ فاتحین کے خلاف نفرت کا ایک جذبہ موجود رہتا ہے، اور یہ نفرت صرف فاتحین کی ذات تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ان کے مذہب، تمدن، تہذیب اور روایات تک سے مفتوحین کو شدید نفرت ہوا کرتی ہے، یہ اور بات ہے کہ فاتحین کے رعب و دبدبہ کے نتیجہ میں مفتوحین خاموش رہیں لیکن یہ خاموشی رضامندی کا ثبوت نہیں ہوتی، مصر، عراق و ایران و شام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے، ان ممالک میں بسنے والی قومیں بھی علم الاقوام کے اس دستور سے الگ نہیں چل سکتی تھیں، وہ بھی اس نفسیاتی ردعمل کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھیں، اور بہت ممکن تھا کہ ان ملکوں میں بھی اسلام کا وہی حشر ہوتا جو اسپین میں ہوا، لیکن آلِ رسولؐ نے اپنی مظلومیت، حق پرستی، تبلیغ اور روحانی برتری کے سہارے اس ردعمل کو وجود میں آنے سے روک دیا۔ اور ان ممالک پر یہ حقیقت آشکار کر دی کہ اسلام فاتحین کی خونریز تلواروں کا نام نہیں ہے، کربلا کی داستان مظلومی کا نام ہے، اسلام حرص کشور کشائی کا مظاہرہ نہیں ہے، ایک بلند تر اخلاقی اور روحانی نظام کا نام ہے، اور اسلام کا مقصد مفتوحین کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا نہیں ہے، خود بھوکے رہ کے غریبوں کا پیٹ پالنا اسلام کی تعلیم ہے، عراق ایران مصر و شام کی مفتوح قوموں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام کے حقیقی نمائندے یہ آسودہ فاتحین نہیں تھے، جنہوں نے ان ممالک کو روند ڈالا تھا، بلکہ اسلام کی سچی تصویر وہ آلِ رسولؐ تھی جس نے خود اپنے خون میں نہا کے عروس اسلام کے رخ پرنور کو نکھار دیا تھا۔ اسپین اور قادسیہ کے لوگوں کو یہ تجربہ نہیں تھا،

انہوں نے صرف بنی امیہ کی تلواریں دیکھیں، آلِ رسول کی قربانیوں اور ان کی محبت آفرین تبلیغ کا منظر نہیں دیکھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے موقع ملتے ہی مسلمانوں کے ساتھ ہی اسلام کا بھی خاتمہ کر دیا، لیکن عراق و ایران و مصر و شام نے آلِ رسول کو دیکھا، سیاست علویہ کے بے پناہ کمال کو دیکھا، یعنی سچے اور نکھرے ہوئے اسلام کو دیکھا اور یہی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے مدینہ والوں کی فرمانروائی کا جال توڑ ڈالا وہیں اسلام کی حبل المتین میں خود اس طرح جکڑ گئے کہ آج تک وہاں آفتاب اسلام کی ضیا پاشیاں جاری ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے جن عظیم مصالح کی بنیاد پر کوفہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا ان میں ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ عراق اور ایران کے لوگ جنکے دلوں میں اپنی سلطنت اور عجمی تہذیب کی بربادی پر غم و غصہ کے شرارے بھڑک رہے تھے، اور جو اسلام کو عرب شہنشاہیت کا مترادف سمجھ رہے تھے، ان کے پیکرِ حقیقی کو امیر المومنینؑ اور آلِ رسولؐ کی شکل میں دیکھ لیں، ان لوگوں نے اب تک مسلمانوں کی تلوار کو دیکھا تھا اور حرص کشور کشائی کو اسلام سمجھا تھا، اب ان کے سامنے آلِ رسول کے محترم افراد پیش کئے گئے تاکہ وہ سمجھ لیں کہ اسلام نام ہے اس اعلیٰ اور برتر ذہنی، روحانی، علمی اور انقلابی تحریک کا جس کا مظہر اتم علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کے ساتھی ہیں، اسلام کا یہ رُوپ پیش ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں کے دل اسلام کے لئے جیت لئے گئے اور مسلمان فاتحین کی عارضی شہنشاہیت اسلام کی دائمی فتح میں تبدیل ہو گئی۔

شام کا معاملہ البتہ بہت ٹیڑھا تھا!

یہ صحیح ہے کہ شام خلافت دوئم کے ابتدائی عہد میں فتح کر لیا گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں تھی کہ ابتدائے

ہی شام اس آل ابوسفیان کے ہاتھوں میں دیدیا گیا تھا جسے اسلام ظاہری تک سے دلچسپی نہیں تھی، اور جس نے خود مسلمانوں کی تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا ایسی حالت میں شام میں حاکم اور محکوم، راعی اور رعایا دونوں وہ تھے جو اسلام سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے خواہش مند تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ جسطرح مسلمانوں نے ان کے اقتدار، ان کی سلطنت، ان کے تمدن اور ان کے مذہب کو مٹایا ہے اسی طرح وہ اسلام اور اس کے تمام آثار کا خاتمہ کر دیں، شامی آل ابوسفیان کے محض اس لئے فدائی تھے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ابوسفیان نے خلافت ثالثہ قائم ہوتے ہی جنت و نار کا مضحکہ اڑایا ہے اور حاکم شام کا فرزند کھلم کھلا وحی کا مذاق اڑاتا ہے ایسی حالت میں شامی یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ آل ابوسفیان کے پردہ میں اسلام اور مسلمانوں سے اپنی شکست کا پورا پورا انتقام لے سکیں گے، اسی طرح امیر معاویہ کو شامی عزیز تھے اس لئے کہ موصوف یہ جانتے تھے کہ کفار مکہ کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اب شامی لشکروں کی مدد سے ہی اسلام کی انقلابی تحریک کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اسی حالت میں راعی اور رعایا دونوں کا مفاد، دونوں کا مقصد اور دونوں کا نصب العین ایک تھا، دونوں اسلام دشمنی کے مسئلہ پر متحد تھے، یہ صحیح ہے کہ دونوں کے چہروں پر اسلام کی نقاب پڑی ہوئی تھی لیکن دلوں کا حال تو بس خدا ہی کو معلوم تھا، شامی عیسائی محض تلوار کے بل پر اسلام کو حق نہیں مان سکتے تھے اس لئے پیشانیوں پر ہلال آویزاں کر لینے کے باوجود ان کے دل کے کنیسا صلیب سے معمور تھے، ان کی زبانوں پر توحید کا کلمہ ضرور تھا، لیکن دل تثلیث کے پرستار تھے، وہ ظاہر میں بہ خوف شمشیر اسلام لے آئے تھے لیکن باطن میں مسیحیت کے شیدائی تھے، اس لئے کہ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ جبر سے دل یا مذہب تبدیل نہیں ہوا کرتا، عقائد نہیں بدلا کرتے، تلوار کی طاقت زبان سے چاہے کچھ کہلوا لے، لیکن تصورات

کی دنیا پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، عربوں کی تلوار نے شامیوں پر اسلام "مسلّط" کر دیا تھا، لیکن ان کے دلوں سے مسیحیت ختم نہیں کی تھی، امیر معاویہ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے، چنانچہ انہوں نے شامی عیسائی کی دلجوئی کے لئے ہی وہ رویہ اختیار کیا تھا جس پر حضرت عمر کو یہ تاریخی جملہ ادا کرنا پڑا تھا کہ "معاویہ عرب کا قیصر ہے"! امیر معاویہ کے صلیب گلے میں ڈال کے مرنے میں بھی یہی رمز پوشیدہ تھا، موصوف خوب جانتے تھے کہ آپ کی رعایا کا اصلی مذہب کیا ہے اور ایک ہوشیار سیاستدان کی حیثیت سے رعایا کے جذبات سے کھیلنا بھی خوب جانتے تھے، آپ نے اپنی ان تدابیر سے شامیوں پر اچھی طرح سے یہ حقیقت واضح فرما دی کہ آپ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے شام کی مسیحی سلطنت، مسیحی تہذیب، قدیم شامی زبان اور مسیحی تمدن کو مٹایا ہے بلکہ آپ بھی دراصل انہیں لوگوں کے زخم خوردہ ہیں، اور صرف اسی حد تک مسلمان ہیں جس حد تک تلوار نے شامیوں کو مسلمان بنا دیا ہے، ایسی حالت میں بنی امیہ اور شامیوں میں جس حد تک بھی اتحاد نہ ہو جاتا وہ کم تھا، اس اتحاد نے پہلے تو یہ کیا کہ خلافت دوم و سوئم کے زمانہ میں اسلام حقیقی کے علمبرداروں کو شامی سرحدیں داخل ہونے سے روکے رکھا، چنانچہ ابوذر شام گئے تو نکالے گئے، اور جو دوسرے ممتاز صحابہ رسولؐ اسلامی نظام زندگی کو سمجھتے تھے ان کو بھی شام سے دیس نکالا دیدیا گیا، تاریخ میں بے شمار واقعات اس قسم کے بھرے ہوئے ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے، اور جب دولت کی فراوانی اور ایمانی جذبہ کی کمی نے مرکز اسلام کو کمزور کیا تو یہی اتحاد شامی و سفیانی اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالنے، صدر اسلام کو فنا کر دینے اور اسلامی انقلاب کا نام و نشان محو کر ڈالنے کے لئے صفین کے میدان میں خیمہ زن ہو گیا!

شام کا مکار عیسائی یہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اسلام کی ردا اتار کے مسیحیت کا جامہ پہن لیا تو سارے مسلمان شامیوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں گے اور اس مرتبہ یرموک سے بھی زیادہ ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا، اسلئے وہ اسلام کی نقاب اوڑھ کے اسلام پر حملہ کرنا چاہتا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے نبیؐ اور آل نبی کو مٹانے کا نام لیا تو مسلمان مشتعل ہو جائیں گے اسلئے اس نے نبیؐ اور خانوادہ نبوت کے بجائے "علیؑ اور آل علیؑ" کا لفظ گھڑ لیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ علی اور ان کی آل سے لڑ رہا ہے، وہ جانتا تھا کہ رسولؐ و آل رسولؐ اور علیؑ و آل علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے، علیؑ و آل علی کو مٹا دیا تو رسولؐ اور ان کے خاندان کا نام تاریخ سے محو کر دیا، لیکن پیغمبر اسلام کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ سارے مسلمان مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے علیؑ و آل علیؑ کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں یہ خطرہ باقی نہیں رہتا تھا بلکہ یہ یقین تھا کہ وہ منافقین، رجعت پسند اور دولت کے بندے جو ہمیشہ علی کو اپنے عزائم کی راہ میں سنگ گراں سمجھتے رہے ہیں، نہ صرف یہ کہ علیؑ کے ساتھ نہیں آئیں گے بلکہ اپنے دل کے پردوں میں شامیوں کی طرف داری کریں گے، اس طرح عرب دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے، اسلام کا درد رکھنے والے علیؑ کے ساتھ ہوں گے، اور بقیہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہیں گے نتیجہ میں علی کو شکست ہو جائے گی اسلام کے شیدائی مارے جائیں گے، اور شامی عیسائی مکہ اور مدینہ میں داخل ہو کر آثار اسلامی کا خاتمہ کر دیں گے، شامیوں کی خوش قسمتی کہ اسی زمانہ میں حضرت عائشہ اور ان کے ساتھیوں نے قصاص خون عثمان کا ڈھونگ ایجاد کر دیا۔ یہ چیز بھی شامی عیسائی کے لئے مفید مطلب تھی اس لئے کہ قصاص خون عثمان کا نام لے کر وہ ان پرستاران دولت کو بھی تحریک اسلامی کے قائد اعظم کا ساتھ دینے

سے روک سکتا تھا جو حضرت عثمان کے ہمنوا اور ہوا خواہ تھے، چنانچہ مکہ کے بت پرستوں کے سردار ابوسفیان کے بیٹے اور شامی عیسائی نے مل کے اس موقع کو اسلام کے مٹا دینے کا بہترین موقع تصور کرتے ہوئے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔

تحریک اسلامی کے قائد اعظم کے سامنے اب مندرجہ ذیل سوالات تھے:۔

(۱) شام کے عیسائی اور وہ بنی امیہ جو بدر و احد و خندق میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کے صرف تلوار کی طاقت سے مسلمان ہوئے اسلام کو مٹا دینے کے لئے متحد ہو گئے تھے۔ اور ایک ایسا لشکر تیار ہو گیا جو اپنے مذہب کا بدلہ لینے کے جذبہ میں آگے بڑھ رہا تھا، ایسی حالت میں ان سپاہیوں کی حالت ان سپاہیوں سے مختلف تھی جو کسی بادشاہت یا دنیوی سلطنت کے لئے لڑتے ہیں، مذہب کے لئے لڑنے والا سپاہی جان پر کھیل جانا ثواب جانتا ہے اس لئے اسکا نظم اعلیٰ ہوتا ہے اور وہ آخری دم تک لڑتا رہتا ہے!

(۲) شامی لشکر نے قصاص خون عثمان کا نعرہ لگا کر اپنی جنگ کا اصلی مقصد مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا، اس کا مقصد اصلی تو تھا اسلام کو فنا کر دینا اور مکہ و مدینہ کو نیست و نابود کر دینا، لیکن اگر یہ مقصد اصلی مسلمانوں کے سامنے آجاتا تو سارے مسلمان خلیفہ وقت کی پشت پر جمع ہو جاتے، اس لئے اس نے قصاص خون عثمان کا نعرہ لگایا تاکہ مسلمان اس دھوکے میں رہیں کہ علیؓ اور معاویہ میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور اس حقیقت کو نہ سمجھنے پائیں کہ صفین کے میدان میں دراصل اسلام اور زخم خوردہ مسیحیت میں جنگ ہو رہی ہے، اس سے شامیوں کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جنگ سے الگ رہا اور اسلام کی حفاظت و صیانت کی ساری ذمہ داری صرف کوفہ اور عراق کے لوگوں پر آ گئی!

(۳) شامی "علیؑ و آل علیؑ" کو اپنا حریف قرار دے کے ان مسلمانوں کو بھی اسلام و کفر کے اس سنگین معرکہ سے علیحدہ کر دینے میں کامیاب ہو گئے جو امیر المومنینؑ کو عرب شہنشاہیت کا مخالف جانتے تھے اور اس اعتبار سے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ اگر یہ سمجھتے کہ شامی عیسائی عربوں کے سیاسی اقتدار اعلیٰ کو چیلنج کر رہا ہے، تو اپنی قومی عصبیت کے نتیجہ میں یہ ضرور میدان میں آجاتے لیکن ان کو یہ سمجھا کے چپ کر دیا گیا کہ لڑائی مدینہ والوں یا عربوں کی سلطنت کے خلاف نہیں ہے صرف علیؑ اور آل علیؑ سے ہے جن کو یہ لوگ خود بھی اپنی شہنشاہیت کا مخالف جانتے تھے،

(۴) شامی لشکروں کو اگر عربستان میں داخل ہو کر جنگ کرنے کی اجازت دیدی تو کعبہ اور قبر رسول کو مٹا دینے کا جذبہ شامی عیسائی میں تیز تر ہو جاتا اور پھر وہ انتہائی خوفناک طریقہ پر جنگ کرتا تاکہ اسلام کے ان مآثر متبرکہ کو مٹا کے اپنے کلیساؤں کی ویرانی کا بدلہ لے، بسر بن ارطاط کی سرکردگی میں مکہ پر شامی چھاپہ ماروں کا حملہ ان کے اس جذبہ کی پوری غمازی کر رہا ہے، اور بعد میں یزیدی فوجیوں نے صدر اسلام کے ان شہروں کے ساتھ جو سلوک کیا، کعبہ پر جس طرح آتشباری کی گئی اور مدینہ کی جو بے حرمتی ہوئی وہ شامیوں کے ان عزائم کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھے!

(۵) مدینہ میں بیٹھ کے شامیوں کا مقابلہ کرنے میں ایک اور قباحت یہ تھی کہ خود مدینہ اور مکہ میں جو منافقین موجود تھے وہ عین اسوقت جبکہ امیر المومنینؑ اسلام اور مسیحیت کی یہ فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہوتے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے سے نہیں چوکتے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان ہار جاتے، تحریک

اسلامی کے سچے علمبردار قتل ہو جاتے، مکہ اور مدینہ کے اسلامی آثار فنا کر دیئے جاتے اور دنیا سے اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔

بعض نافہم حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امیرالمومنین ؑ نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو دارالحکومت کیوں قرار دیا، لیکن اگر وہ ممالک اسلامیہ کے نقشہ پر چند لمحات کے لئے بھی نظر ڈالیں تو ان کو خود یہ احساس ہو جائے گا کہ امیرالمومنین ؑ نے دارالحکومت تبدیل کر کے اسلام پر احسان عظیم فرمایا۔ امیرالمومنین ؑ اگر مدینہ میں موجود رہتے تو شامی لشکر تبوک اور خیبر کے راستوں سے گزرتا مدینہ پر حملہ آور ہو جاتا اور ایسی حالت میں صدر اسلام کو جس تباہی کا سامنا کرنا پڑتا اس کا تصور بھی ہمارے لئے محال ہے، شامی عیسائی اپنی منزل کو قریب دیکھ کے جنگ میں جانیں لڑا دیتے اور ادھر ان کا طوفانی جوش دیکھ کے مکہ اور مدینہ میں جو منافقین اور مفاد پسند موجود تھے وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے، امیرالمومنین ؑ کا لشکر دو طرف سے گھر کے ختم ہو جاتا اور شامی مدینہ اور مکہ کا اس سے بدتر حشر کرتے جو مسلمہ بن عقبہ کی سرکردگی میں ان کی اس دوسری نسل نے کیا جو واقعی مسلمان ہو چکی تھی یا کم از کم مسلمان کہلاتے ہوئے پلی بڑھی تھی! ـــــ آپ کا کوفہ کو دارالحکومت قرار دیدینا اور خود شام کی شمال مشرقی سرحدوں پہ پہنچ جانا شامیوں کے اس عزم کی راہ میں حائل ہو گیا، اور اب شامی مجبور ہو گئے کہ عراق کی سرزمین پر آپ سے جنگ کریں، اس طرح ایک طرف تو منافقین اور قریش کے پٹے ہوئے مہرے شامیوں کی کوئی مدد نہیں کر سکے، دوسرے مراکز اسلام دور ہونے کی وجہ سے شامیوں کا جذبہ انتقام تیز تر نہ ہو سکا، تیسرے آپ کو عراق کے سورما دفاع اسلام کے لئے مل گئے جو مدینہ

میں ملنا محال تھے جس کا ثبوت اسی سے مل جاتا ہے کہ جنگ جمل کے لئے مدینہ سے آپ کو دو ہزار سے زیادہ آدمی نہیں ملے تھے مدینہ کے لوگ تھکن کا شکار تھے اور ان کا جذبہ جہاد سرد پڑ چکا تھا، اس لیئے وہ ایک لاکھ چالیس ہزار شامی لشکر کو دیکھ کے سوا اس کے کہ گھروں میں بیٹھ رہتے اور مسجد نبویؐ کی پامالی کا نظارہ کرتے رہتے اور کچھ کرنے والے نہیں تھے ، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں شکست کے علاوہ اور کچھ نتیجہ نہ نکلتا، مدینہ والوں کی اس بزدلی کے ثبوت کے لئے مدینہ پر یزیدی لشکر کے حملہ کے واقعات کافی ہیں!

آپ نے کوفہ کو دارالحکومت قرار دے کے شامیوں کا سارا نقشہ جنگ پلٹ دیا، مکہ اور مدینہ کو تاراج کرکے شامی کلیساؤں کا انتقام لینے کے خواب دیکھنے والے عراق کے ریگ زاروں میں الجھا دیئے گئے، اور عراقیوں کی مدد سے لیلتہ الہریر کے معرکہ میں ان کو ایسی ہولناک شکست دی گئی کہ انکے دلوں سے مکہ اور مدینہ کو تاراج دیکھنے کا خبط ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا، شمشیر آزمائی کی قوتیں افسردہ پڑ گئیں، اور تیغ و تیر کی جنگ کی جگہ سیاسی جنگ کا آغاز ہو گیا، حکمینؓ مقرر ہوئے، دومتہ الجندل میں حکمین کا قضیہ چلتا رہا اور اسطرح وہ جنگ جو اسلام کو فنا کر دینے کے جذبہ میں شروع ہوئی تھی بے نتیجہ طریقہ پر ختم ہو گئی!

کوفہ کو دارالحکومت قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت تھی کہ شامی عیسائیوں کا سیلاب عربستان میں داخل نہ ہو وہیں اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ شامیوں سے جنگ کے دوران میں عراق، ایران اور مصر پر تسلط قائم رہے اور وہاں کے غیر مسلم مرکز اسلام میں جنگ و جدل دیکھ کے بغاوتیں نہ کر دیں ، فرض

کیجئے کہ اگر امیر المومنین مدینہ میں رہتے اور شامیوں کو تبوک یا خیبر میں روک کے جنگ کرتے تو یہ ڈر تھا کہ عراق یا مصر کے ذریعے اسلامی سلطنت کا راستہ منقطع ہو جاتا اس لئے مصری یا عراقی سلطنتِ اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے عراقیوں کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیتے، ایرانی جو خلیفۂ ثالث کے زمانے میں بھی بار بار بغاوتیں کر چکے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے اور ان کی دیکھا دیکھی مصر میں بھی بغاوت ہو جاتی۔ نتیجے میں اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہو جاتی اور دیانتِ اسلام کا نام و نشان مٹ جاتا۔ امیر المومنین نے کوفہ کو دار الحکومت بنا کے اسلام کو بھی بچایا۔ اسلام کے مقدس آثار کا بھی تحفظ فرمایا اور اسلامی سلطنت کو بھی محفوظ فرما دیا جو سیاستِ علویہ کا ایک عدیم النظیر مظاہرہ تھا!

(۲) شامیوں کو میدانِ جنگ میں شکست دیدینا بازوئے خیبر شکن کے لئے آسان کام تھا لیکن یہ فتح بھی تو وقتی ہوتی اور اسی طرح عارضی ہوتی جسطرح عراقیوں کی ابتدائی فتح عارضی تھی، شامی پھر کوئی بہانہ تراش کے بغاوت کرتے اور اسلام کو مٹانے کے لئے میدان میں آ جاتے، ایسی حالت میں ضرورت اس کی تھی کہ شامیوں کے قلوب پر فتح حاصل کی جائے۔ ان کے سامنے اسلام کے حقیقی خد و خال پیش کئے جائیں ان کو بتلایا جائے کہ اسلام وہ نہیں ہے جسے انہوں نے خالد کی تلوار یا آلِ ابوسفیان کے قیصری کردار میں دیکھا ہے، بلکہ اسلام ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام ہے جس کی علمبرداری رسولِ اللہؐ کی اولاد کر رہی ہے، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں تھا، شامیوں کے دلوں میں بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالنا، مسیحیت کا زنگ دور کر کے ان کے دل کے شیشوں میں اسلام کا رنگ بھرنا، آلِ ابوسفیان کی عیاریوں کا جال توڑ کے

اسلام کی حقانیت کو واضح کرنا اور شامی عیسائی کو اسلام کا علمبردار بنا دینا ــــ اور وہ بھی اس وقت جبکہ نیزے لچک رہے ہوں، تلواریں چمک رہی ہوں، تیر سنسنا رہے ہوں اور موت کا عفریت سروں پر منڈلا رہا ہو، بڑا وقت طلب کام تھا، اس کے لئے قیادت کی ملکوتی اور مافوق البشری قوتیں درکار تھیں، یہ کام عام انسانی سطح سے بہت بالاتر سطح انسان کا تھا، اور اسلام خوش قسمت تھا کہ اُسے اپنی قیادت کے لئے امیرالمومنینؑ کی شکل میں ایسا ہی قائد میسر تھا چنانچہ آپ نے وہ کیا جو صرف حکمتِ ربانی کے امین سے ہی ممکن تھا اور دنیا نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے ہمیشہ قریش کے سلحشوروں کو چند گھنٹوں میں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، جسنے جمل اور نہروان کے معرکے ایک ایک دن میں سر کر لئے، جس نے باب خیبر کی چولیں ہلا کے یہودیوں کا غرور آناً فاناً میں خاک میں ملا دیا، وہی شخص تین چار سال تک شامیوں کے مقابلہ میں خیمہ زن ہے اور فیصلہ کن فتح حاصل نہیں کرتا ــــ وجہ صاف ظاہر ہے اگر فیصلہ کن ٹکراؤ کرکے شامیوں کو ایک دن میں شکست دیدی جاتی (جو امیرالمومنینؑ کے لئے مشکل نہیں تھا) یہ تو فتح تلوار کی ہوتی، علیؑ کی ہوتی، اسلام کی نہ ہوتی، اسکے برعکس جنگ کو طول دیا گیا تاکہ شامی اسلام کا علوی روپ دیکھ لیں شامیوں کو معلوم ہو کہ اسلام اس عظیم اخلاقی اور روحانی تحریک کا نام ہے جس کے مظہر اتم خود علیؑ ہیں، اسلام خونریز شہنشاہیت کا نام نہیں ہے ایک برتر نظام زندگی کا نام ہے، اسلام کا مقصد بنی امیہ کے شاہزادوں کی عیاشی کے لئے عوام کی دولت لٹانا نہیں ہے بلکہ تقسیم بالسویہ کے ذریعہ ایک عادلانہ معاشی نظام کو وجود میں لانا ہے، اسلام وحشی

تیغ زنوں کے مظاہرہ قوت کا نام نہیں ہے بلکہ آلِ رسولؐ کی تہذیب نفس کا نام ہے۔ امیر المومنینؑ نے فیصلہ کُن جنگ نہیں کی، شامی کو تلوار سے زیر نہیں کیا بلکہ آپ نے جنگ کو طول دے کے شامیوں کو اسلامی تحریک کو سمجھنے اور اسلام کے حقیقی خدوخال معلوم کرنے کا موقع دیا۔ اس سیاست کے نتیجہ میں امیر المومنینؑ فاتح شام تو نہیں کہلائے لیکن شامیوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف جو زہر بھرا ہُوا تھا اُسے آپ نے کم کر دیا، علیؑ بہ حیثیت خلیفہ وقت تو جنگ نہیں جیتے لیکن مسیحیت کے مقابلہ میں اسلام ضرور جیت گیا اور یہی امیر المومنینؑ کا مقصود تھا!

امیر المومنینؑ نے صرف یہی کامیابی حاصل نہیں کی کہ شامیوں کو خود ان کی سرحد پر جنگ میں الجھا کے صدرِ اسلام کے مراکز کو محفوظ رکھا یا جنگ کو طول دے کے شامیوں کے سامنے اسلام کا اصلی رُوپ پیش کر دیا، اور اسکے نتیجہ میں ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف جو نفرت تھی اسے بڑی حد تک دُور کر دیا، بلکہ جنگ کو طول دے کے ایک اور عجیب و غریب کامیابی حاصل فرمائی جس پر مورخین کی نظر بالکل نہیں جاتی ہے —— اور وہ کامیابی یہ تھی کہ آپ نے

شامیوں کا مقصد جنگ تبدیل کر دیا!

شامی اور ان کے ہم نوا بنی امیہ دراصل اس لئے میدان میں آئے تھے کہ اسلام کو مٹا دیں امیر معاویہ ہوں یا شامی ان کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ صرف اسلئے لڑ رہے تھے کہ اسلام کی انقلابی تحریک کو مٹا کے پرانا جاہلی نظام واپس لے آیا جائے۔ یہ مقصد تھا وہ جو دلوں کے پردوں میں مستور تھا، زبانوں سے جو مقصد ظاہر کیا جا رہا تھا وہ قتل عثمان کا قصاص تھا لیکن جنگ کو طول دیا گیا اسکا

نتیجہ یہ ہوا کہ

امیر معاویہ نے خلافت کا دعویٰ کر دیا،

بادی النظر میں اسے امیر المومنینؑ کی کامیابی سے تعبیر کرنا بہت عجیب سی بات ہے لیکن جو لوگ سیاست علویہ کے طریق کار اور اس کے مقصد کو سمجھتے ہیں کردہ اسے نہ صرف یہ کہ امیر المومنینؑ کی کامیابی قرار دینے پر مجبور ہیں بلکہ شائد اس امر کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ یہ امیر المومنینؑ کی درخشاں حیات طیبہ کی سب سے بڑی کامیابی تھی!

وفات رسولؐ کے بعد امیر المومنینؑ کو مدینہ کے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا وہ رجعت پسند منافقین کے علاوہ باقی سب کے سب مسلمان تھے یہ صحیح ہے کہ ان میں دولت کے شیدائی تھے، بعض سطحی فکر رکھنے والے جمود پرور تھے، بعض اسلام کے سچے فدائی تھے لیکن تھے سب مسلمان، اور اسلام کی شوکت ظاہری، مسلمانوں کے غلبہ و اقتدار اور کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حفاظت و صیانت کے نام پر سب متحد ہو سکتے تھے، ان لوگوں سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت کا کام لے لینا، ان کے ذریعہ مرتدین کی قوت کا خاتمہ کرا دینا اور ان کو قیصر و کسریٰ کی اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ میں صف آرا کر دینا آسان کام تھا اور محض مسئلہ خلافت، پر خاموشی اختیار کر کے ان سے یہ کام لے لیا گیا لیکن بنی امیہ اور شامی عیسائیوں کی اس قوت کو جو اسلام کو مٹانے کے لئے وجود میں آئی تھی اسلام کے اعلان پر مجبور کر دینا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا تھا جسے اللہ نے عقل و حکمت کی ان مافوق البشری منزلوں پر فائز کر دیا ہو جن تک انسان کی رسائی قطعاً محال ہے، امیر المومنینؑ نے جنگ کو طول دیا جسکے نتیجہ میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ معاویہ خلافت کے مدعی ہو گئے اور ظاہر ہے کہ خلافت اسلامی کا دعویدار

خواہ ذاتی حیثیت سے کتنا ہی غلط اور خراب شخص کیوں نہ ہو، اسلام اور سلطنتِ اسلامی کو فنا کر دینے کا اعلان نہیں کر سکتا وہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر مجبور رہے، اسلام سے ظاہری دلچسپی رکھنے پر مجبور رہے اور دکھاوے کے لئے ہی سہی لیکن ارکان اسلامی کی بجا آوری پر مجبور رہے ——— خلافت کا مطالبہ کر دینے کے بعد امیر معاویہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف تو جنگ جاری رکھ سکتے تھے، لیکن اسلام کے خلاف جنگ کرنے، مآثر اسلامی کو مٹا دینے، قرآن کو (جس کے وحی ربانی ہونے پر بنی امیہ کا جتنا ایمان تھا وہ یزید نے سر حسینؑ دیکھنے کے بعد ظاہر کر دیا تھا) فنا کر دینے یا ارکان وعقائد اسلام کو ختم کر دینے کا اعلان ہرگز نہیں کر سکتے تھے، وہ آلِ رسولؐ پر دشنام طرازی کا سلسلہ جاری کر کے اپنے دل کے پھپھولے تو پھوڑ سکتے تھے لیکن قبر رسولؐ کو مسمار کر کے بدر و اُحد کی شکست کا بدلہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، وہ خانوادۂ رسالت کے حامیوں اور سچے مسلمانوں کو تختۂ ستم کا نشانہ بنا سکتے تھے، اور اس طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رُوح کو تڑپا سکتے تھے لیکن ظاہری طور پر اسلام کو ختم کر کے اپنے آبائی مذہب کو رائج کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے ——— اس لئے کہ وہ "اسلامی خلافت" کے دعویدار تھے، اور اس اعتبار سے اپنے آپ کو دنیا کی نگاہوں میں مسلمان اور اسلام کا ہمدرد ثابت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے! ——— امیر معاویہ کو میدان صفین میں شکست دیدی جاتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ بنی امیہ اور شامی عیسائی پھر مسلمانوں کی تلوار کے سامنے سرنگوں ہو جاتے، لیکن ان میں تخت خلافت کی تمنا پیدا ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ

(۱) شامی عیسائیت اور ابوسفیانی دورِ جاہلیت کے دوبارہ ابھرنے یا اسلام سے ٹکر لینے کا امکان ختم ہو گیا۔

(۷) شامیوں کو مسیحیت کی جانب لوٹ جانے کے بجائے مسلمان بنے رہنا پڑا اور اس طرح آل رسول کو کچھ عرصہ کے بعد یہ موقع مل گیا کہ وہ قید خانہ شام کی مظلومانہ تبلیغ کے نتیجہ میں ان کو ہمیشہ کے لیے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیں اس لئے کہ اسلام کے اندر اسلام کے لئے جو عظیم خطرہ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کی شکل میں موجود تھا اور جس کے نتیجہ میں عرب کے دورِ جاہلیت کے دوبارہ ظہور میں آجانے کا امکان تھا اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ یرموک کا معرکہ سر کرنے والوں نے عارضی طور پر شام کو عربی سلطنت کے لیے فتح کر لیا تھا۔ لیکن شام کو اسلام کے لئے فتح کرنے کا سہرا امیر المومنینؑ کے سر ہے۔ اگر آپ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کو صفین میں اسی طرح شکست دیدیتے جس طرح بدر اور خندق میں دے چکے تھے۔ تو دنیا تاریخ کا یہ تجربہ نہ دیکھتی کہ ابوسفیان کی نسل جو خود دل سے اسلام کی قائل نہیں تھی، اسلام کے نام پر کافروں سے لڑتی رہی اسلام کے لئے ممالک فتح کرتی رہی اور شرک و الحاد کے ان مرکزوں کو مٹانے کا کام انجام دیتی رہی جس کی وہ خود اپنے دل کے پردوں میں علمبردار تھی ——— امیر معاویہ کا دعوائے خلافت خود ان کی شکست تھی اسلئے کہ یہ دعویٰ کر دینے کے بعد ان کو اسلام سے روگرداں ہونے کا موقع باقی نہیں رہا۔ اسی طرح انکے حامی شامی جو اپنے دل کے پردوں میں عیسائی تھے اور مسلمان بن کے تحریک اسلامی کے قائد کے مقابلہ میں جنگ کر رہے تھے اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے چہروں پر اسلام کی نقاب ڈالے رہیں۔ اس طرح بظاہر مسلمانوں اور بباطن اسلام دشمنوں کی وہ نسل جو اسلام کو مٹانے کا تہیہ کر کے میدان میں آئی تھی مسلمانوں کے سامنے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے مسلمان بنی رہی اور انکے بظاہر مسلمان بنے رہنے کے نتیجہ میں انکی اولادیں اپنے آبائی دین کو بھول کے واقعی مسلمان بن گئیں تحریک اسلامی کے قائد کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی اسلئے کہ امیر المومنینؑ بادشاہ نہیں تھے جن کو عسکری فتح کی ضرورت ہوتی، آپ دراصل اسلام کے مبلغ اور اس الٰہی تحریک کے داعی تھے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش کیا تھا، اس لئے آپ کا اصل مقصد لوگوں کو مسلمان بنانا تھا، نہ کہ ان سے اپنی حکومت تسلیم کرانا، صفین کی جنگ طولانی ہو جانے کے نتیجہ میں آپ کا مقصد حاصل ہو گیا۔ شامی مسلمان ہو گئے، اور اس طرح سیاست علویہ کے نتیجہ میں اس شام کو ہمیشہ کے لئے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا گیا جو اسلام دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔

اندرونی اصلاح

تحریک اسلامی کے قائد کو جہاں مرتدین کی شورش، منافقین کی بغاوتوں، اور قیصر و کسریٰ کی یلغار کے سیاسی خطرات کا سامنا تھا وہیں عربوں کے دلوں میں اسلام کی تعلیمات پوری طرح راسخ کر دینے اور صدر اسلام کو آنے والے مذہبی خطرات سے محفوظ کر دینے کی ذمہ داری بھی اسی عظیم المرتبت قائد پر تھی، اسی کی دور رس نگاہیں یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں کہ

(۱) فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کا واسطہ غیر اقوام سے پڑے گا۔ اس لئے ان کے تصوّرات مسلمانوں پر ضرور اثرانداز ہوں گے۔ آپ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے کہ عرب خود ایک جاہل قوم تھے لیکن وہ جن ممالک کو فتح کر رہے تھے وہ علم

اور فلسفہ کا مخزن تھے، ایران، شام اور مصر قدیم علوم کے گہوارے تھے
اور ان ممالک میں داخلہ کے بعد مسلمان ان ممالک کے علوم اور ان کے تصوّرات
سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے، ایسی حالت میں یہ یقینی تھا کہ ایران جانیوالے
مسلمان مزدکیت، مادیت اور نو فلاطونیت کا شکار ہونگے، اور شام کی
سرسبز وادیوں میں گل گشت کرنے والے سیدھے سادے عرب یونانی
اور شامی فلسفہ کے سامنے سربسجود ہو جائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عربوں کے
عقائد متاثر ہونگے ان کا دین مسخ ہو جائے گا، اسلام کی نئی نئی تعبیرات
وجود میں آئیں گی اور مسلمان پہاڑوں کے سے بلند اور مضبوط عقائد رکھنے کی
بجائے عجمی و یونانی فلسفہ کے خشک بیابانوں میں بھٹکنے والی قوم بن جائیں گے۔

(۲) غیر ملکیوں سے اختلاط کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عربی زبان اپنی سابقہ خصوصیات کھو
دے گی، اس میں زبردست تبدیلیاں ہو جائیں گی، اور وہ زبان جس میں
قرآن اترا تھا عربوں کے لئے غریب ہو جائے گی، جس کے نتیجہ میں آئندہ
نسلوں کو قرآن سمجھنا مشکل ہو جائے گا:

(۳) جنگوں کے نتیجہ میں احادیث اور مسائل فقہ کے جاننے والے سیکڑوں صحابہ
قتل ہوتے جا رہے تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ ان علمی جواہر پاروں کو منضبط
نہ کر لیا گیا تو حدیث اور فقہ کا خاتمہ ہو جائے گا، اسلئے کہ جہاں ایک طرف
رواۃ حدیث تلواروں کی چھاؤں میں موت سے ہمکنار ہوتے جا رہے
تھے وہیں دوسری طرف فرمانروایان وقت اس پر مصر تھے کہ حدیث کی کتابت
نہ ہونے دی جائے، روایت حدیث پر لوگوں کو سزائیں دیجاتی تھیں،
اور جو لوگ احادیث کو لکھتے تھے ان کے جمع کردہ صحیفے جلا ڈالے جاتے
تھے، حکمران جماعت کا قول تھا کہ علم کو کتابوں میں قید کرنا حرام ہے، اور

اس مہمل تصور کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی علوم فنا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا،

(۴) حکومت وقت کی جانب سے نشر علوم، تہذیب نفس یا تبلیغ احکام کا کوئی بندو بست نہیں تھا، عوام کو اسلام کے عظیم اخلاقی اور روحانی ورثہ سے مالا مال کرنے کی کوئی سعی نہیں کی جا رہی تھی اور اندیشہ یہ تھا کہ دولت کی فراوانی، سامان عشرت کی کثرت اور علم سے تہی دامنی عربوں کے اخلاق و کردار اور ان کے نظم و ضبط کا خاتمہ کر دے گی،

(۵) حکمران طبقہ قرآن میں تفکر و تعقل کا بھی حامی نہیں تھا، اور بعض حضرات ایسے بھی تھے جو تاویل و تفسیر کو حرام جانتے تھے، اس کا انجام یہی ہو سکتا تھا کہ خدا کی تجسیم تک کا دعویٰ کر دیا جائے، اور مسلمانوں میں ایسے مہمل عقائد پیدا ہو جائیں جن پر

ہزار خندہ کفر ست بر مسلمانی

کا مفہوم صادق آجائے،

(۶) حکمران طبقہ عوام کو اس درجہ جاہل رکھنے پر تلا ہوا تھا کہ تقریباً ایک صدی کے بعد عبدالملک بن مروان کو یہ تاریخی جملہ کہنا پڑا کہ "عجمیوں نے صدیوں حکومت کی لیکن ان کو کبھی عربوں کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی، اور عرب ایک صدی بھی حکومت کا کاروبار عجمیوں کی مدد کے بغیر نہ چلا سکے" سلطنت اسلامی پر عجمیوں کے اس بے پناہ اثر و نفوذ کی وجہ صرف یہی تھی کہ حکمران طبقہ کو فتوحات کی تو فکر تھی لیکن نشر علوم پر اس کی کوئی توجہ نہیں تھی، آگے چل کے اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب تلوار کی جنگ تو جیت گئے، لیکن علم، تہذیب اور فلسفہ کی جنگ اس بری طرح ہارے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے دورِ سلطنت میں مسلمانوں میں نت نئے مذاہب وجود میں آ گئے، اور

عجمی و یونانی فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد تک تاراج کر دیئے!

تحریک اسلامی کا قائد اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسند روحانی کا وارث اسلام کے ان داخلی فتنوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا وہ ایسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان عملی او تہذیبی جنگ ہار جائیں یا مسلمانوں کے نفوس پر دورِ جاہلیت کے کردار و عمل کے پردے پڑ جائیں، چنانچہ دفن رسولؐ سے فرصت پاتے ہی امیر المومنینؑ نے جو پہلا تاریخی اعلان فرمایا وہ یہ تھا کہ ــــ

"میں اس وقت تک اپنے دوش پر عبا نہیں ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لوں"

یہ وہ وقت تھا جب حضرت ابو بکر اور حضرت زید بن ثابت کے سے حضرات تدوین و کتابت قرآن کے متعلق یہ رائے فرما رہے تھے کہ ــــ

"ہم وہ کام (تدوین و کتابت قرآن) کیسے کر سکتے ہیں جسے نبی کریمؐ نے بھی اپنی زندگی میں انجام نہیں دیا"

اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کا برسر اقتدار طبقہ تدوین و کتابت قرآن کی بھی مخالفت کر رہا تھا امیر المومنینؑ نے نہ صرف یہ کہ قرآنِ مجید کو ترتیب تنزیل کے مطابق جمع فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تفسیری ارشادات بھی حاشیہ پر جمع فرما دیئے تاکہ آنے والی نسلوں میں فہم قرآن کے متعلق اختلافات پیدا نہ ہوں، اور

احکام ترے حق ہیں مگر ان کے مفسر
تفسیر سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پاژند

کی نوبت نہ آنے پائے ــــ لیکن ملت اسلامیہ کی بدقسمتی کہ قرآن حکیم کا یہ نادر نسخہ دنیا کے سامنے پیش نہیں ہو سکا، اور تفسیر رسالت گم ہو جانے کے نتیجہ میں مسلمان

فہم قرآن کے سلسلہ میں ان اختلافات کا شکار ہو گئے، جن سے تحریک اسلامی کا قائد ان کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

قرآن پاک کے سلسلہ میں آپ کی دوسری عظیم خدمت یہ تھی کہ آپ نے علم نحو کے اصول مرتب فرمائے، اور اپنے شاگرد ابوالاسود دوئلی کو ان اصولوں کے مطابق کتاب مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی، اس طرح آپ نے عربی زبان اور اس کے قواعد کو جو غیر ملکیوں سے اختلاط کے نتیجہ میں برباد ہو سکتی تھی محفوظ فرما دیا۔ ابوالاسود نے آپکی اسی خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

"آپ نے ہم عربوں کو زندہ کر دیا۔ اور ہماری زبان کو بقائے دوام عطا کر دی۔"

قرآن پاک پر نقطے اور اعراب لگانے کی سعادت بھی ابوالاسود دوئلی کو حاصل ہے!

احیائے معارف اسلامیہ کے سلسلہ میں آپ کی دوسری عظیم خدمت یہ تھی کہ آپ نے احادیث کا ایک صحیفہ مرتب فرمایا تھا جس میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ تمام احادیث جمع کر دیں تھیں جن کی امت کو ضرورت تھی، یہ صحیفہ ۷ گز لمبی پوست آہو پر تحریر کیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ علمی مجموعہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ورنہ شاید حدیث سازی کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جو روز بد دیکھنا پڑا اس سے وہ محفوظ رہتے۔

اس زمانہ میں جبکہ خلیفہ وقت تدوین حدیث پر لوگوں کو سزائیں دے رہا تھا اور جلیل القدر صحابہ تازیانوں کے خوف سے سرمایہ حدیث کو دلوں میں محفوظ رکھنے پر مجبور تھے یہ تحریک اسلامی کے قائد اعظم ہی کا دل جگر تھا کہ اس نے حدیث کے اس گرانقدر سرمائے کو مکتوبی شکل دیدی، جو بعد میں آئمہ آل رسول کے ذریعہ امت تک پہنچتا رہا۔

اسلامیات کا وہ نادر روزگار خزانہ جسے علم فقہ سے موسوم کیا جاتا ہے امیرالمومنین ؑ ہی کی کاوشوں کا طفیل ہے، چنانچہ شیعہ ہوں یا سُنی دونوں کا سرمایۂ فقہ جن حضرات کے ذریعہ فراہم ہوا ہے وہ امیرالمومنین ؑ ہی کے خرمن علم کے خوشہ چین تھے،

اسلامی علم کلام کے موجد بھی امیرالمومنین ؑ ہی ہیں چنانچہ نہج البلاغہ کے نام سے آج بھی اس حکیم ربانی کے ان مفکرانہ ارشادات کا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے جو الٰہیات جبر و قدر، مقصد تخلیق انسانی، معاش و معاد، قضا و قدر اور اسی قسم کے دوسرے سیکڑوں مسائل علمیہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی صحیح ترین ترجمانی کرتا ہے، ابن ابی الحدید معتزلی نے اس مسئلہ پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ اسلام کے تمام فرقے حقائق و معارف دین کے باب میں امیرالمومنین ؑ ہی کے مکتب فکر کے پروردہ اور فلسفہ و حکمت کے سلسلہ میں آپ ہی کے خرمن کے خوشہ چین ہیں!

زمانہ قبل اسلام میں عربی شاعری کو کافی عروج حاصل ہو چکا تھا لیکن نثر پر عربوں کی توجہ بالکل نہیں تھی، حالانکہ علوم و فنون کی تدوین نثر ہی کے سہارے ہوا کرتی ہے، عرب میں فصاحت و بلاغت کا سارا مظاہرہ نظم میں ہوتا تھا، نثر کم سوادی کی دلیل تصور کیجاتی تھی، عربی نثر کی پہلی قابل ذکر کتاب قرآن پاک ہے جس نے عربوں کو شعر و شاعری کے مقابلہ میں نثر کی قوت و صلاحیت سے آشنا کیا لیکن قرآن بہرحال کتاب الٰہی تھا اسلئے عربوں کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ نثر میں عام انسان بھی اپنی صلاحیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر سکتے ہیں، امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے مکاتیب، خطبات، توقیعات اور فرامین کے ذریعہ عربوں کو نثر کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور اس طرح عربی زبان کو جو محض شعری شاعری تک محدود تھی ایک علمی زبان بننے میں مدد دی۔ آپ نے صرف یہی نہیں کیا کہ عربی نثر پر توجہ فرما کے خود چند علمی چیزیں تحریر فرمادیں بلکہ اپنے اصحاب اور شاگردوں کو توجہ دلائی کہ وہ عربی زبان میں کتابیں

تصنیف فرمائیں چنانچہ آپ کے زیرِ اثر دنیائے اسلام میں مصنفین کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہوگئی اور عربی زبان ایک علمی تحریک کا مرکز بن گئی۔ آج یہ عرض کرنا مبالغہ نہیں ہے کہ عربی زبان میں علوم و معارف کا جتنا بھی خزانہ موجود ہے وہ طفیل ہے امیر المومنینؑ کا، اس لئے کہ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جس نے عربوں کی توجہ شاعری سے ہٹا کے نثر پر مبذول فرمائی، خود متعدد چیزیں تصنیف فرمائیں اور عربوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق بیدار کر کے اپنے شاگردوں سے کتابیں لکھوائیں، اس طرح عربی زبان میں علمی تصانیف کا آغاز آپ ہی کا کارنامہ ہے اور یہ آپ ہی کی دکھائی ہوئی راہ کا نتیجہ ہے کہ آج عربی زبان علوم و معارف کی خزینہ دار نظر آرہی ہے۔

ایک طرف وہ مسلمان تھے جو فتوحات ملکی میں مصروف تھے، دولت اور خزانے سمیٹ رہے تھے، مال غنیمت بٹور رہے تھے، اور تحریک اسلامی کو قطعاً فراموش کر چکے تھے، اور دوسری طرف امیر المومنینؑ تھے جو مسجد نبوی کو نشر علم اور تہذیب اخلاق کا گہوارہ بنائے ہوئے تھے، آپ پابندی سے مسجد نبوی میں الٰہیات اخلاقیات، تفسیر، عقاید، اور فقہ وغیرہ پر تقریریں فرماتے رہتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کو ان کا وہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہتے تھے، جسے وہ دولت اور سلطنت کی دھن میں فراموش کر چکے تھے۔

ایک طرف شیطان تھا جو مسلمانوں کو دولت و مملکت کا فریب دے کے دولت ایمان لوٹ لینے پر تلا ہوا تھا، اور دوسری طرف تحریک اسلامی کا قاید تھا، جو علم و معرفت کی نور آگین شمعیں روشن کئے، عربوں کو اس عظیم روحانی اور اخلاقی تعلیم کی جانب دعوت دے رہا تھا، جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو دی تھی، شیطان دولت کی دیواریں کھڑی کر کے جہل کی ظلمت عام کرنا چاہتا تھا، علیؑ علم کا نور پھیلا کے ایمان و معرفت کی دولت لٹا رہے تھے، شیطان اپنی مہم میں ہارا۔

علیؑ جیتے، اسلامی علوم باقی رہ گئے اور حق کو وہ فتح مبین حاصل ہوئی جس کے اثرات آج تک دنیا کے گوشہ گوشہ میں نظر آرہے ہیں۔

نشر علم و تزکیہ اخلاق امیر المومنینؑ کے نزدیک اتنی اہمیت کے مالک تھے کہ اپنی خلافت ظاہری کے زمانہ میں بھی جب آپ کو جمل صفین اور نہروان کے معرکے درپیش تھے، آپ روزانہ مسجد میں صبح کے وقت درس اور موعظہ ضرور فرماتے تھے، اور مسلمانوں کو ان گرانقدر علمی، اخلاقی اور روحانی اقدار سے باخبر رکھتے تھے جن کا احیا ہی اسلام کا منشا و مقصود تھا!

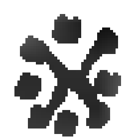
اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ابتدائی خلافتوں کے دور میں مسلمانوں میں جو بھی علمی کاوشیں ظہور میں آئیں وہ امیر المومنینؑ کی مرہون منت تھیں اور علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کا کام تنہا آپ نے انجام دیا، اس طرح آپ نے اندرونی اصلاح کا کام جو بہ حیثیت امام وقت اور بہ حیثیت جانشین رسولؐ آپ ہی کا فریضہ تھا پوری طرح انجام دیا، اور مسلمانوں کو اسلام کی اس صراط مستقیم پر قائم رکھا جسے جہل کی ظلمتیں اور دولت کی فراوانی ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔

اندرونی اصلاح کا کام تبلیغ و ہدایت سے ہی انجام پا سکتا تھا اور اس کی صلاحیت امیر المومنینؑ کے برابر کسی میں نہیں تھیں آپ امت کے بہترین خطیب اور عدیم النظیر مقرر تھے۔ آپ کے خطبات آج بھی مدون شکل میں موجود ہیں اور ان سے آپ کی تبلیغی صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے!

اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ اسلام پر یونانی اور عجمی فلسفہ کے زبردست اثرات مرتب ہوئے، ان غیر اسلامی افکار کے نتیجہ میں مسلمانوں میں متعدد فرقے وجود میں آئے جن میں سے بیشتر اب ختم ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کے عقائد میں بھی ان عجمی و یونانی افکار کا اثر صاف جھلکتا ہے، مسلمانوں کے عقائد، ان کی تفاسیر، ان کے علوم

اور ان کی تصانیف میں ان افکار باطلہ کا بڑا ذخیرہ شامل ہے،

عہد حاضر کے مفکرین اسلام بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بے پروائی اور علم کی جانب سے اس چشم پوشی کا جو دور فتوحات میں برتی جا رہی تھی، مسلمان ملک تو فتح کرتے رہے لیکن ان کی سطح ذہنی میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، ان کا علمی و تمدنی معیار بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور ان علوم اسلامیہ کو مدون و منضبط کرنے پر کوئی توجہ نہیں کی گئی جو عجمی و یونانی افکار کا مقابلہ کر سکتے تھے، نتیجہ میں مسلمان ذہنی حیثیت سے پیچھے رہ گئے، اور مفتوحہ علاقوں کے جاہلی و غیر اسلامی افکار کا شکار ہو گئے۔ امیرالمومنینؑ کی دور رس نگاہیں یہ تماشا دیکھ رہی تھیں، چنانچہ آپ نے اس دور میں جسے آپ کی سیاسی خاموشی کا دور کہا جاتا ہے معارف اسلامی کی اشاعت کا دور قرار دیا، اور آپ کی اسی کاوش علمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آل رسولؐ سے علم دین کی تعلیم حاصل کرنے والے ہمیشہ غیر اسلامی افکار و تصورات کے اثر سے آزاد رہے ـــــ چنانچہ آج ہم پورے فخر کے ساتھ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں صرف فرقہ شیعہ اثنا عشریہ ہی وہ فرقہ ہے جس کے عقائد و افکار پر کبھی غیر اسلامی افکار کا اثر غالب نہیں ہوا، اور یہ فرقہ ہمیشہ اسلام کے اس پاکیزہ اور اصلی روپ پر قائم رہا جو سرور کائناتؐ نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا تھا!



سیاسی خلفشار

مدینہ اسلامی دنیا کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا، اور اسلامی تاریخ میں اس شہر کی اہمیت ناقابل انکار تھی، اسلامی سلطنت کے دار الخلافہ ہونے کے علاوہ یہی وہ شہر تھا جہاں کے لوگوں نے لسان رسالت ؐ سے تعلیم اسلام حاصل کی تھی، یہی وہ شہر تھا جو حدیث اور فقہ کا مرکز تھا، اسی شہر میں قرآن پاک کے وہ احکام نازل ہوئے تھے جن پر شریعت اسلامیہ کا انحصار تھا، اسی لئے یہ ضروری تھا کہ اس شہر اور اس کے رہنے والوں کی پوری حفاظت کی جاتی اور اسے تحریک اسلامی کا سب سے بڑا مرکز بلکہ اس کا گہوارہ باقی رکھا جاتا لیکن پیغمبر اسلام ؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی حکومت کا سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑی، قریش نے سرکار رسالت ؐ سے اپنی قرابت کا نعرہ بلند کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا، انصار پس پشت ڈال دیئے گئے، اور سعد بن عبادہ نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو وہ کسی "جن کے ہاتھوں" موت کے گھاٹ اُتر گئے، تاریخ اسلام میں یہ پہلے دعویدار سلطنت تھے جن کو موت کا شکار ہونا پڑا، اس سے انصار پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے اسلامی سلطنت کے دعوے سے دستبردار ہو گئے، ____ لیکن انصار کی یہ روش راضی خوشی کا سودا نہیں تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا اس سیاسی شکست کا جو ان کو قریش کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی، اور جس کے نتیجہ میں ان کو حکومت کے ساتھ ہی سعد بن عبادہ کی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا، انصار پر مکمل بد دلی طاری ہو جانا اور ان کا اسلامی سیاست سے کنارہ کش ہو جانا مدینہ کی زندگی پر کوئی اچھا اثر مرتب نہیں کر سکتا تھا، اس لئے کہ مدینہ کی اکثریت بہر حال انصار پر مشتمل تھی، اور اس اکثریت کا اسلامی دنیا کے تمام مسائل

سے بے تعلق ہو جانا جو خراب اثرات پیدا کر سکتا تھا، وہ سیاسی بصیرت رکھنے والے کسی فرد سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ـــــ پھر انصار نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ مال غنیمت کی تقسیم میں نیز بیت المال سے تقسیم ہونے والے اموال میں بھی ان سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے چنانچہ خلیفہ دوم نے مہاجرین قریش کا وظیفہ انصار سے زیادہ مقرر فرمایا تھا، ـــــ ان سب واقعات نے انصار کو حد درجہ بددل کر دیا اور وہ طبقہ جس نے پیغمبر اسلام کو ان کی روحانی تحریک کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ مدد دی تھی سیاسی اور علمی دونوں میں ایک عضو مفلوج نظر آنے لگا، بظاہر یہ معمولی سی بات تھی۔ لیکن بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور اقتدار حکومت مہاجرین قریش کے ہاتھوں سے نکل کے اسلام کے دشمن بنی امیہ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا، وہ مہاجرین قریش جو دنیائے اسلام کے تاج بخش بنے ہوئے تھے دولت اور حکومت کے باب میں کتنے ہی آگے کیوں نہ سہی، لیکن دینی جوش اور مذہبی جذبہ میں انصار سے بہت کم تھے، جس کا ثبوت خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے غزوات و سرایات سے مل سکتا ہے۔ جن میں اپنی جانیں دے کے اسلام کو کامران و منصور کرنے کا سہرا ہمیشہ انصار کے سر رہا اور مہاجرین نے بار بار فرار کے ایسے دردناک مظاہرے پیش کئے جن پر آج تک ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ پھر بنی امیہ ان کے رشتہ دار تھے، اس لئے اگر اسلامی حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں جا رہی تھی تو ان کو اس ہولناک سیاسی و مذہبی تبدیلی کی مخالفت کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی، انصار البتہ اس صورت حال کی مخالفت کر سکتے تھے، وہ بدر و اُحد و خندق وغیرہ میں بنی امیہ کے مقابلہ میں تلوار کھینچ چکے تھے، اور اس گروہ کی اسلام دشمنی کا خوب تجربہ رکھتے تھے، ایسی حالت میں وہ مدینہ کی سیاسی اور علمی حیثیت کو بچانے کے لئے میدان میں ضرور آ سکتے تھے لیکن ان کو کچلا جا چکا تھا، مفلوج بنایا جا چکا تھا، اسلامی مسائل سے بیدخل

کیا جا چکا تھا، چنانچہ وہ بھی چپ رہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا مرکز مدینہ سے دمشق منتقل ہوا، اور وہاں سے بغداد منتقل ہو گیا، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کے جاننے والے مدینہ میں تھے لیکن ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ کس مپرسی کا شکار ہو گئے۔ اور اسلام ان عقائد و افکار کا نام بن گیا جو دمشق اور بغداد کے حکمرانوں کو پسند تھے، ان حکمرانوں کی مصلحت ہوئی تو مسلمانوں نے مسئلہ جبر و قدر کو مان لیا اور ان کی خواہش ہوئی تو خلق قرآن کا عقیدہ رائج کر دیا گیا، غرض اسلام مدینہ سے نکل کے سلاطین کا کھلونا بن گیا لسان رسالت سے تعلیم پانے والے افراد مدینہ کا چونکہ عوام پہ کوئی اثر نہیں رہا تھا اس لئے دمشق اور بغداد سے اٹھتی ہوئی ہر صدا عین دین مان لی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام بعد میں یونانی و عجمی فلسفہ اور اسرائیلی خرافات کا نام بن گیا — یہ نتیجہ تھا سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ حکومت کا، انصار کے پس پشت ڈال دیئے جانے کا، اور اسلامی سیاست پر ان مہاجرین قریش کے حاوی ہو جانے کا، جو سیاسی جوڑ توڑ میں باکمال سہی لیکن اپنی بزدلی، حکومت پرستی اور زر طلبی کے لحاظ سے ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ اسلام کی عنان اقتدار ان کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے — سعد بن عبادہ کے "جن کے ہاتھوں" قتل ہونے سے انصار کی کمر تو ضرور ٹوٹ گئی، لیکن دنیائے اسلام میں سیاسی خونریزیوں (POLITICAL MURDERS) کا دروازہ بھی کھل گیا چنانچہ قریش نے جو بویا تھا وہی کاٹا اور چند ہی سال کے اندر قریش کے دو ستونوں یعنی حضرت عمر اور حضرت عثمان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور ایک ایسی قبیح رسم کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجہ میں اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ قتل و خون کی ایک بھیانک داستان بن گئی — رسول اللہ کے انتقال کے بعد دنیائے اسلام کی نئی سیاست کا یہ پہلا رخ تھا جو امیر المومنین کے سامنے آیا لیکن ابھی بہت سی سیاسی کروٹیں باقی تھیں اور امیر المومنین ان سب کا ایک ساتھ تدارک کرنا چاہتے تھے چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ پر احتجاج کر لینے کے بعد آپ خاموش ہو گئے، اور ان حالات کا مطالعہ کرنے لگے جو اس فیصلہ خلافت کے نتیجہ میں دنیائے اسلام میں پیدا ہونے والے تھے

جمہوری فیصلہ

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے قبیلے بنی اوس اور بنی خزرج اس مقصد سے جمع ہوئے کہ آئندہ حکمران کا فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تجہیز و تکفین چھوڑ کے انصار کا اس طرح خاموشی سے مدینہ سے نکل جانا اور دوسرے مسلمانوں کو خبر کئے بغیر مملکت اسلامیہ کے مستقبل کا فیصلہ کرنا اس امر کا ثبوت ہے، کہ انصار کو مہاجرین پر کوئی اعتماد نہیں تھا اور ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر حکومت مہاجرین کے ہاتھوں میں آگئی تو ان سے انصاف نہیں برتا جائے گا۔ انصار یہ جانتے تھے کہ اسلام کو جو کچھ عروج حاصل ہے وہ ان کی جانفشانیوں کا نتیجہ ہے انہوں نے اسلام کے لئے زبردست قربانیاں دی تھیں، مہاجرین کو نہ صرف یہ کہ پناہ دی تھی بلکہ برسوں ان کے آذوقہ تک کا بندوبست کیا تھا۔ خود بھوکے رہ کر قریش کو پالا تھا۔ لیکن وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مہاجرین کا یہ طبقہ قطعاً خود غرض اور مطلب پرست ہے۔ اسکے دل میں انصار کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے وہ اسلام قبول کر لینے کے باوجود اپنی قبائلی عصبیت میں اتنا فرق ہے کہ انصار کے مساویانہ سلوک کرنے پر تیار نہیں ہے، وہ میدان جہاد سے تو گریز پائی اختیار کرتا ہے لیکن مال غنیمت کی تقسیم کے

وقت آن موجود ہوتا ہے، اسے اسلام سے زیادہ خود اپنا قبائلی اقتدار عزیز ہے اور وہ ہر موقع پر یہ چاہتا ہے کہ جوڑ توڑ سے کام لیکر دنیائے اسلام کی قیادت اور حکومت اپنے ہاتھوں میں رکھے، وہ حصول اقتدار کی مہم میں پیغمبر اسلام کی مخالفت کرنے سے بھی نہیں چوکتا ہے، اور نبی کو قدم قدم پر ذہنی اذیت میں مبتلا کرتا رہتا ہے اس نے میدان غدیر کا الٰہی فیصلہ بھی قبول نہیں کیا ہے اور اس حکومت پر قبضہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے، جس کی تعمیر و تشکیل میں اس کا بہت ہی کم حصّہ ہے ——— ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ انصار کے دل مہاجرین کی جانب سے صاف نہیں تھے، اور وہ قریش پر کوئی اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کا اجتماع ان کے اسی جذبہ کی پوری غمازی کرتا ہے!

انصار کی پہلی بدقسمتی تو یہ ظاہر ہوئی کہ ان کے اس اجتماع کی خبر حضرت عمر کو ہو گئی اور وہ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کے سقیفہ روانہ ہو گئے، راستہ میں ابوعبیدہ جراح مل گئے تو ان کو بھی ساتھ لے لیا گیا، چنانچہ قریش کے صرف یہی تین آدمی تھے جو سقیفہ پہنچے، اور انہوں نے پہنچتے ہی انصار کی بازی الٹ دینے کا بندوبست کر دیا۔ انصار کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ ان میں خود بھی اتحاد نہیں تھا، بنی خزرج نے سعد بن عبادہ کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا، اور بنی اوس کے دلوں میں اس تجویز سے حسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بنی اوس کو خوب بھڑکا دیا گیا۔ اور پھر یہ دلیل پیش کر کے کہ

"حکومت رسول اللہؐ کی تھی اس لئے اس کے وارث ان کے اعزہ ہی ہو سکتے ہیں"

سعد بن عبادہ کے حق حکمرانی سے انکار کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ حضرت عمر نے سعد بن عبادہ پر تلوار کا وار بھی کر دیا جس سے حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ بنی خزرج سہم گئے، انصار

دہشت زدہ ہو گئے، اور جب نوبت یہاں تک پہنچا دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی

"وراثت"

کا سوال اٹھا کے حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی، بنی اوس کو چونکہ بنی خزرج کے اقتدار کے خلاف شدید حسد پیدا کرایا جا چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی "وراثت" کے اصول کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی، اور اس طرح سقیفہ کا وہ مایۂ ناز الیکشن ختم ہو گیا۔ جس کی اساس پر آج اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری مذہب قرار دیا جاتا ہے!

اس الیکشن کے سلسلہ میں جو امور خاص طور پر قابل لحاظ ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جس وقت یہ الیکشن ہوا اس وقت حجاز، یمن، نجران، عمان، حضرموت، خیبر اور تبوک وغیرہ کے سارے علاقے مسلمان ہو چکے تھے، سینکڑوں قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے ان میں سے سقیفہ بنی ساعدہ میں مدینہ کے صرف دو قوم انصاری قبائل کے چند افراد اور تین قریش حاضر تھے جن کی حاضری میں خلیفہ کا تقرر عمل میں آیا۔ ایسی حالت میں اسے دنیائے اسلام کا "انتخاب" قرار دینا قطعاً مہمل سی بات ہے!

(۲) ان چند حاضرین میں سے بھی جن پر اس الیکشن کا مدار رکھا جاتا ہے، بنی خزرج اس انتخاب کے مخالف تھے!

(۳) مخالف امیدوار پر تلوار چلا کے حاضرین کو دہشت زدہ کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں اسے آزادانہ انتخاب کہنا غلط ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے اس دہشت زدگی کا جو تیغ آزمائی کے ذریعہ پیدا کر دی گئی تھی!

(۴) اسلام کے دو قبیلوں میں پھوٹ ڈلوا دی گئی اور اس طرح سازش کی مدد سے

کام نکالا گیا جو ایک اچھے انتخاب کی شان نہیں ہو سکتی!

(۵) دلیل یہ تراشی گئی کہ حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی املاک تھی اسلئے ان کے ورثا کو ملنا چاہیئے اور "وراثت" کا فیصلہ یہ ہوا کہ اولاد کے بجائے خسر کو وارث ہونا چاہیئے۔

(۶) اس دلیل کا مقصد یہ ہوا کہ رسولؐ کے گھرانے کے علاوہ اسلامی دنیا پر کبھی کوئی دوسرا شخص حکمران نہیں ہو سکتا۔ یہیں سے اس جمہوریت کا خاتمہ کر دیا گیا جس پر مسلمان بڑا ناز کرتے ہیں اسلئے کہ حق حکمرانی جمہور اسلام کو نہیں دیا گیا بلکہ صرف قبیلۂ قریش کو عطا کر دیا گیا۔

(۷) مدینہ کے علاوہ اسلامی دنیا کے کسی حصّہ کے افراد کو الیکشن میں حصہ لینے کا حق عطا نہیں کیا گیا۔ گویا ووٹ کا حق بھی صرف مدینہ تک محدود کر دیا گیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ سے واپسی پر مدینہ والوں کے سامنے اس "جمہوری فیصلہ" کا اعلان کر دیا گیا اور ان کو بیعت کی دعوت دی گئی!

مہاجرین نے اسلئے بیعت کر لی کہ وہ ابھی ابھی انصار کے افتراق باہمی کا نتیجہ دیکھ چکے تھے، اور یہ جانتے تھے کہ اگر ان میں ذرا بھی پھوٹ پڑی تو حکومت انصار کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ پھر حکومت انہیں کے ایک فرد کے ہاتھوں میں آئی تھی اور یہ شخص ایسا تھا کہ جو قریش کے اجتماعی مفادات کی تکمیل میں پوری طرح معاون ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں مہاجرین کی جانب سے کسی اختلاف کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا۔

انصار میں بنی اوس نے تو بنی خزرج کے حسد میں بیعت کر لی تھی، رہ گئے تھے بنی خزرج، تو ان کو مظاہرہ شمشیر سے حضرت عمر نے دہشت زدہ کر دیا تھا، اسلئے اب ان کی جانب سے بھی مخالفت کا امکان نہیں تھا، سعد بن عبادہ نے البتہ بیعت سے

انکار کیا تو ان کو کسی نامعلوم "جن" نے قتل کر دیا، اور اسطرح راہ کا یہ کانٹا بھی دُور ہو گیا!

امیر المومنینؓ کے لئے یہ وقت نہایت نازک تھا اس لئے کہ اُمت ایک غلط فیصلہ کا ارتکاب کر رہی تھی اور آپ کی دُور رس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ اس فیصلہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بڑے روزِ بد کا سامنا کرنا پڑے گا آپ یہ سمجھ رہے تھے کہ

(۱) اگر آج امت کے چند افراد کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ خلافت کے سے اہم دینی امر کا فیصلہ خود اپنی رائے سے کر لے تو کل افراد امت کو یہ بھی حق حاصل ہو گا کہ وہ قرآن کی جو چاہیں تفسیر کریں، فقہ میں جو چاہیں مسائل وضع کر لیں، شریعت کو جسطرف چاہیں موڑ دیں، عقائد میں جو چاہیں ترمیمات کر دیں، عبادات میں جو چاہیں انداز اختیار کر لیں غرض یہ کہ دین کا وہ سارا ضابطہ جو سرکار دو عالمؐ نے مقرر فرمایا تھا افراد امت کی مرضی کا شکار ہو جائے گا۔ اور ملت اسلامیہ سیکڑوں فرقوں میں بٹ جائے گی!

(۲) اگر آج مدینہ کے چند آدمی جوڑ توڑ، سازش اور دہشت انگیزی کے نتیجہ میں اپنی مرضی کا خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں تو کل جس کا جی چاہے گا وہ انہیں حربوں کو استعمال کر کے خلافت پر قبضہ کر سکے گا۔ اور اس طرح خلافت جو دین اور شریعت کا ایک اہم جزو تھی تخت و تاج کے پروانوں کی باہمی کشمکش کا شکار ہو جائے گی اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خلافت کے نام پر مسلمانوں میں دائمی خانہ جنگی جاری رہے گی جس کا خاتمہ اسی وقت ہو گا جب مسلمان تنگ آ گئے خود خلافت کے تصور ہی کو ختم کر دیں گے، چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، مسلمانوں میں صدیوں خلافت کے نام پر جنگ جاری رہی، اور آخر تنگ آ کے مسلمانوں نے ۱۹۲۳ء میں خلافت ہی کا خاتمہ کر دیا۔

(۳) خلافت کا فیصلہ کسی اصول کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا، سقیفہ میں جو کچھ ہوا تھا، اُسے نہ انتخاب کہا جاسکتا ہے اور نہ وراثت، ——— وراثت اسلئے نہیں کہ رسولؐ اللہ کی وراثت کسی قاعدہ سے حضرت ابوبکر کو نہیں پہنچتی اور الیکشن اس لئے نہیں کہ انصار کے مقابلہ میں قصہ چھیڑ کے حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی بیعت کا اعلان کر دیا تھا جو کسی حالت میں جمہوری انتخاب نہیں کہا جاسکتا۔ خلافت کے سلسلہ میں یہ پہلی بے اصولی بعد میں ہر بے اصولی کو جائز قرار دینے کی دلیل بنی۔ چنانچہ مسلمان اس حد پر پہنچگئے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول مذہب میں داخل کر لیا گیا اور قہر و غلبہ کو دلیل خلافت مان لیا گیا!

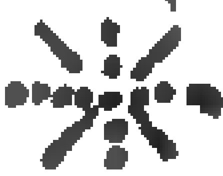
(۴) مسلمانوں نے غدیر کے الٰہی اور رسالت پناہی فیصلہ کے خلاف بغاوت کی اور اسطرح پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلمانوں میں دین کے خلاف، اللہ اور رسولؐ کے خلاف بغاوت کی عادت پیدا ہو گئی۔ بظاہر صرف ایک حکم کی مخالفت کی گئی لیکن جب احکام رسالت کی مخالفت کا مادہ قوم میں پیدا کر دیا گیا۔ تو یہ ایک ہی بات تک محدود رہنے والا نہیں تھا، اس ننھے سے پودے نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کے انتقال کو ایک صدی بھی نہیں گذرنے پائی کہ مسلمانوں کے دارالامارۃ شاہی میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی ناچ رنگ کی محفلیں آراستہ ہو گئیں اور مملکت اسلامیہ میں کھلم کھلا خدا و رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کی جانے لگی!

امیرالمومنینؑ یہ سب کچھ سمجھ رہے تھے، مستقبل آپکے سامنے آئینہ کے مانند موجود تھا، اس فیصلہ کے نتائج سے آپ بخوبی واقف تھے اسلئے آپ نے ملتِ

اسلامیہ کے سامنے جو حق تھا اُسے پیش کر دیا۔ دربار خلافت میں آپ نے بغیر کسی خوف اور جھجک کے احقاقِ حق فرمایا اور ایسے محکم دلائل پیش فرمائے کہ بشیر بن سعد انصاری جن کے سہارے صقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر کو خلافت حاصل ہوئی تھی خود پکار اٹھے کہ

"اگر ہمیں پہلے یہ باتیں معلوم ہو گئی ہوتیں تو ہم آپ ہی کو اپنا امیر منتخب کرتے لیکن اب کیا کریں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا!"

یہی امیر المومنینؑ کی حیثیت تھی، آپ کے جواب میں دربار خلافت کی جانب سے کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکی، خلافت کے ستون اعظم بشیر انصاری نے آپ کے حق کا کھلے الفاظ میں اعتراف کر لیا، اور عامۃ المسلمین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو کچھ ہوا ہے وہ غلط ہوا ہے، اس سے زیادہ امیر المومنینؑ کو کچھ اور درکار بھی نہیں تھا۔ آپ بادشاہت کے تمنائی بھی نہیں تھے، جو اس موقع پر شمشیر بکف ہو جاتے۔ آپ تحریک اسلامی کے قائد تھے۔ اور آپ کو اسلام کا مفاد دیکھنا تھا، خانہ جنگی اسلام کے مفاد کے خلاف تھی اس لئے آپ نے وہ رُخ اختیار فرمایا جو اسلام کے لئے مفید تھا اور اس سیاست علویہ سے قوم کو جو فائدے پہنچے ان کا ذکر ہم سابقہ ابواب میں کر چکے ہیں!



اقتصادی پہلو

"تاریخ کی تشکیل میں سیاست کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے لیکن خود سیاست کی تشکیل میں معاشی اور اقتصادی حالات کا بہت بڑا حصہ ہوا کرتا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں معاملہ کے اس پہلو کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو سمجھنے میں زیادہ تر غلطیاں کی جاتی رہی ہیں!

قریش کا غدیر کے فیصلہ سے انحراف زیادہ تر مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی بیان کیا جاتا ہے

(۱) قریش کے بہت سے سردار امیر المومنینؑ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اس لئے قریش امیر المومنینؑ کے خلاف تھے!

(۲) امیر المومنینؑ قبیلۂ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے!

(۳) امیر المومنینؑ کی فتوحات اور خدمات جلیلہ کے نتیجہ میں لوگ آپ سے حسد کرنے لگے تھے!

(۴) لوگ دنیا کی جانب مائل ہو گئے تھے!

میں یہ عرض نہیں کرتا کہ یہ اسباب سراسر غلط ہیں، بے شک ان میں کافی حد تک صداقت ہے، لیکن محض ان اسباب کی بنا پر امیر المومنینؑ کا خلافت سے محروم کر دیا جانا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ

(۱) چند قریشی کافروں کا امیر المومنینؑ کے ہاتھوں قتل ہونا زیادہ سے زیادہ ان کے قریبی رشتہ داروں کو امیر المومنینؑ کا مخالف بنا سکتا تھا، قریش کی بڑی اکثریت کا اس بنیاد پر آپ کا مخالف ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا!

(۲) آپ کا بنی ہاشم سے ہونا بھی آپ کی مخالفت کی وجہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایسی

حالت میں صرف بنی امیہ آپکے مخالف ہو سکتے تھے جو بنی ہاشم کے دشمن تھے دوسرے قبائل قریش کا اس بنیاد پر آپ کا مخالف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، پھر مزہ کی بات تو یہ ہے کہ خلافت بنی تمیم کے ایک فرد کو ملی تھی، اور خلافت دلانے والے بزرگ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے، ان قبائل کی بنی ہاشم سے کوئی دشمنی نہیں تھی، رہے بنی امیہ تو ان کو اس انتخاب خلافت سے ابتدائی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کا ثبوت ابوسفیان کی وہ گفتگو ہے جو اس نے امیر المومنینؑ سے کی تھی۔ اور جس میں اس نے صاف طور پر بنی تمیم کے ایک فرد کے خلیفہ مقرر ہو جانے پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا۔ ایسی حالت میں آپ کا بنی ہاشم سے ہونا قوم کے اس فیصلہ پر اثر انداز ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ جن لوگوں کو بنی ہاشم سے سخت دشمنی تھی یعنی بنی امیہ ان کا اس فیصلہ کے وجود میں آنے میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اور وہ اس فیصلہ کو پسند بھی نہیں کرتے تھے،؛

تیسری وجہ البتہ کافی حد تک صحیح ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں امیر المومنینؑ کے خلاف حسد کے جذبات موجود تھے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس مرض میں صرف چند ہی افراد مبتلا ہو سکتے تھے، قوم کے بڑے طبقہ کا حسد میں مبتلا ہو جانا درست نہیں کہا جا سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت کے باب میں قریش کا جو فیصلہ تھا، اس میں بڑی حد تک اقتصادی عوامل کارفرما تھے، قریش پیشہ کے اعتبار سے تاجر تھے، چنانچہ قدیمی عربی زبان میں قریش کے معنی ہی تاجر کے تھے، یہ طبقہ نہ صرف یہ کہ اندرون ملک کی تجارت پر حاوی تھا بلکہ غیر ملکی تجارت میں بھی پیش پیش تھا، چنانچہ زمانہ قبل اسلام میں بھی قریش کے تجارتی قافلے غیر ممالک میں جایا کرتے تھے اور ان کی غیر ملکی تجارت اتنے اعلیٰ پیمانہ کی تھی کہ غیر ملکی حکومتیں تک ان کا احترام کرتی تھیں، قیصر اور نجاشی تک سے انکے

تعلقات تھے، اور ان کی اس بین الاقوامی حیثیت کا سارا انحصار ان کی تجارتی ترقی پر تھا!

تاجروں کا مفاد ظاہر ہے کہ نفع اندوزی ہی ہوتا ہے ان کو اپنے مال کے لیئے منڈیاں درکار ہوتی ہیں اور اس مال کی قیمت دوگنی، چوگنی بلکہ ہو تو ملے تو سوگنی بھی درکار ہوتی ہے یہ تاجر کی فطرت ہے اور قریش اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور عرب قوم کی ابھرتی ہوئی طاقتوں نے اس تاجر طبقہ کے لیئے حصول منفعت کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، یہ طبقہ اس حقیقت سے کما حقہ واقف تھا کہ حکومت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں آگئی تو اسے ناجائز نفع اندوزی اور معاشی استحصال کے وہ مواقع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے جن کے وہ دور رسالتؐ میں خواب دیکھتا رہا تھا اس لیئے لازمی طور پہ اسے ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جو اس کے معاشی مفادات کی تکمیل کر سکے، جس کی حکومت میں اسے حصول دولت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں، جو اسے اپنے مال کی کھپت کے لئے زیادہ سے زیادہ منڈیاں دے سکے اور جو ایسی صورتیں پیدا کر سکے جن میں اس کے مال کی قیمتیں دوگنی چوگنی ہو جائیں، یہ مقصد تبھی پورا ہو سکتا تھا جب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے جو اس تاجر طبقہ کے مفادات پورے کر سکیں، چنانچہ جب قریش نے دیکھا کہ تخت خلافت پر ایک ایسا شخص متمکن ہو رہا ہے جو اسی تاجر طبقہ کا ایک فرد ہے تو وہ اس حکمران کے ساتھ ہو گئے اور اس حکومت کی تائید پر متفق ہو گئے جو قریش تاجروں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی تھی!

اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس حکومت سے قریش نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوئیں، وہی لوگ جو دانہ دانہ کو محتاج تھے چند ہی سال میں کروڑپتی بن گئے.

طلحہ، زبیر، سعد بن وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے ارکان سلطنت نے اتنی

دولت جمع کی جس کا جواب طلسم ہوشربا کی داستانوں میں ہی مل سکتا ہے، جھونپڑوں میں رہنے والے محلات و قصور کے مالک بن گئے۔ لوگ ورثہ میں اتنا سونا چھوڑنے لگے جو کلہاڑوں سے کاٹ کے ورثا میں تقسیم ہوتا تھا اور قریش کے گھروں پر دھن برسنے لگا، یہ نتیجہ تھا کہ جنگ کے اس لامتناہی سلسلہ کا جو غیر ممالک کے خلاف جاری کر دیا گیا تھا۔ ان جنگوں کے نتیجہ میں مہنگائی بڑھ گئی، مال کی قیمتیں چڑھ گئیں، ممالک فتح ہوئے تو سرداران قریش کو بڑی بڑی جاگیریں مل گئیں، جگہ جگہ عربوں کی نوآبادیات قائم ہو گئیں، زرخیز علاقوں کی دولت حجاز میں آنا شروع ہو گئی، مفتوحہ ممالک کی شکل میں قریش تاجروں کو نئی اور اچھی منڈیاں حاصل ہو گئیں، شام، عراق اور مصر کے بازاروں پر ان کا قبضہ ہو گیا، فوجی تسلط کے نتیجہ میں ان کو غیر ملکی مقابلہ سے نجات مل گئی، غرض یہ کہ انتفاع کے ہزاروں دروازے کھل گئے۔ اور عربوں نے اس کے نتیجہ میں اتنی دولت کمائی جس کی نظیر ان کی تاریخ میں ملنا محال ہے!

عربوں نے جنگ اور فتوحات سے وہی فائدہ اٹھایا جو ہر شہنشاہیت پسند (IMPERIALIST) قوم اپنی فتوحات ملکی سے اٹھایا کرتی ہے۔ انہوں ــــ نے نہ صرف یہ کہ عراق، مصر اور شام کی دولت پر قبضہ کر لیا بلکہ ان ممالک کو مستقل طور پر اپنی نوآبادیوں میں تبدیل کر دیا۔ ان کی زبان، تہذیب اور رہن سہن کے طریقے تک بدل ڈالے اور ان کو پورے طور پر عرب ملکوں میں تبدیل کر دیا، ایران میں یہ صورت تو نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی ایرانی زبان اور تہذیب پر عربوں نے جو نقوش چھوڑے وہ ایرانیوں کی شدید قومی عصبیت کے باوجود آج تک محو نہیں ہو سکے ہیں!

دولت اور حکومت پر قبضہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اپنے آپ کو حکمران قوم تصوّر کرنے لگے، اور جن ممالک پر انہوں نے قبضہ کیا تھا ان کو اسلام قبول کر لینے

کے باوجود محکوم قوم کا درجہ دیا جانے لگا، عجمیوں کو عرب عورتوں سے شادی کی ممانعت کر دی گئی، غیر عرب بچوں کو میراث کے حق سے محروم کر دیا گیا، اسلام عربوں کو قریشی خواتین سے عقد کی ممانعت کر دی گئی، حکمران نسل کے افراد کو محکوم قوموں کے افراد سے بیگار لینے کا حق عطا کر دیا گیا، اور عبادہ بن صامت نے تو غضب ہی کر دیا کہ خلیفہ دوئم کو یہ سمجھا دیا کہ کسی ذمی کے قتل کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا، اس قسم کی تبدیلیوں نے عربوں کی سامراجی ذہنیت میں زبردست اضافہ کر دیا اور اسلامی دنیا حاکم اور محکوم ممالک میں تقسیم ہو گئی!

آج مسلمانوں کا ایک طبقہ صدر اسلام کے مسلمانوں کی دولت اور خوشحالی پر بڑا فخر کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس فراوانی دولت کے اندر ہی اس سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کی تخریب کے جراثیم بھی پوری قوت کے ساتھ پروان چڑھ رہے تھے، سرمایہ کی زیادتی کے پردہ میں ہی سرمائے کی تباہی کے عناصر بھی ابھر رہے تھے، اور مدینہ کے حکمران جس غلط راہ پر چل کھڑے ہوئے تھے وہی ان کے زوال اور تباہی کا سبب بھی بننے والی تھی، ایران، مصر اور عراق میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، ان ممالک کے عوام اس معاشی لوٹ پر غضبناک ہوتے جا رہے تھے، اور قریشی حکمرانوں کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت کا ایک جذبہ بڑھتا جا رہا تھا، جو آخر ایک دن رنگ لا کے رہا، اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مدینہ کے جس تاج بخش طبقہ کا اقتدار افغانستان کی سرحدوں سے لیکر افریقہ کے ساحل تک مسلم تھا وہ پچیس سال سے زیادہ دنیائے اسلام پر حکومت نہ کر سکا، اور اُسے زوال کا وہ روزِ بد دیکھنا پڑا کہ اس کے دوبارہ ابھرنے کے امکانات ہی ختم ہو گئے!

قریشی تاجروں کی سرمایہ پرستانہ لوٹ اسلامی سیاست پر بھی اپنے اثرات ڈالے بغیر نہ رہ سکی، چنانچہ حضرت ابوبکر نے یہ دیکھتے ہوئے کہ جنگ آزمائی کی پالیسی

نے جہاں گرانی اور فتوحات کے ذریعہ قریش کے اونچے طبقہ کو مالا مال کر دیا ہے وہیں غریب طبقہ میں شدید بے چینی بھی پیدا کر دی ہے، خلافت کے سلسلہ میں انتخاب کا خطرہ مول لینے سے قطعاً انکار کر دیا اور حضرت عمر کو جو قریش کے تاجرانہ مفاد کی حفاظت کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اپنا جانشین مقرر کر دیا،

حضرت ابوبکر یہ جانتے تھے کہ اگر خلافت کو انتخاب پر چھوڑ دیا گیا تو حکومت قریشی تاجروں کے ہاتھوں سے نکل جائے گی، اس لئے کہ جنگ اور گرانی کے نتیجہ میں غریب طبقہ اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ وہ کسی حالت میں سرمایہ دار قریشی سرداروں کو حکومت پر قبضہ کر لینے کی اجازت نہیں دے گا بلکہ اس شخص کو خلیفہ بنا دے گا۔ جو عوام کو جنگ، گرانی اور معاشی لوٹ سے نجات دلا کے سکون کی زندگی عطا کر سکے، ایسی حالت میں امیرالمومنینؑ کے خلیفہ منتخب ہو جانے کا "خطرہ" پوری شدت سے پیدا ہو گیا تھا، عوام میں آپ کا اثر بڑھتا جا رہا تھا، اور سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ کے دو سال کے اندر ہی عوام کو من کنت مولاہ فہٰذا علیؑ مولاہ کی صحت و اصابت کا یقین پیدا ہونے لگا تھا، عام مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان کا مقصد حکومت کو اپنے گھرانے میں محدود رکھنا نہیں تھا ـــــ جیسا کہ قریشی سرداروں نے عوام کو سمجھا رکھا تھا! ـــــ بلکہ اس فرمان رسالت کا مقصد مسلم عوام کی بھلائی تھی! مسلم عوام کے اس بڑھتے ہوئے احساس کا اندازہ حکمران طبقہ کو بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ خلافت کے باب میں الیکشن کے بجائے نامزدگی کا اصول اختیار کرنے میں اپنی عافیت تصور کر رہا تھا!

امیرالمومنینؑ کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ سقیفہ کے فیصلہ کے محض دو سال

کے اندر اندر قریشی حکمران انتخاب کرانے یا عوام کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے، اور انہوں نے اپنی زبان سے نہ سہی، اپنے عمل سے یہ تسلیم کر لیا کہ اگر خلافت کے لئے انتخاب کی اجازت دیدی جاتی تو حکومت قریشی تاجروں کے ہاتھوں میں نہ رہتی، علیؑ کے ہاتھوں میں چلی جاتی جو معاشی استحصال کے مخالف اور عوام کی حقیقی خوشحالی کے علمبردار تھے!

امیر المومنینؑ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ابھی سنہ ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو قریش نے اس نامزدگی کے اصول کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، اور اس کے بجائے الیکشن کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن ۱۳ھ میں ایسا نقشہ بدلا کہ نامزدگی کے اصول کی مخالفت کرنے والے خود اس کے علمبردار بن گئے، اور حضرت عمر کی نامزدگی بے چون و چرا قبول کر لی گئی! —— ظاہر ہے کہ مذہبی حیثیت سے حضرت ابوبکر کو رسول اللہؐ پر فضیلت دینے کی کوئی جسارت نہیں کر سکتا، اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ کو خلافت کے سے شرعی معاملہ میں اپنا جانشین نامزد کرنے کی اس لئے اجازت نہیں دی گئی کہ انؐ کا فیصلہ غلط اور حضرت ابوبکر کا فیصلہ اس لئے مان لیا گیا کہ وہ صحیح تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شریعت نے اپنا جانشین مقرر کرنے کا حق نہیں دیا تھا، اور حضرت ابوبکر کو یہ حق بھی حاصل تھا کیونکہ یہ باتیں تو وہی کہہ سکتا ہے جو اسلام کی بنیادوں کو منہدم کر دے —— اس لئے ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ رسولؐ اللہ کا فیصلہ اسلئے نہیں مانا گیا کہ وہ قریش کے تاجرانہ مفاد کے خلاف تھا، اور حضرت ابوبکر کے فیصلہ کی اسلئے توثیق کر دی گئی کہ اس سے قریشی سرمایہ داروں کے مفادات وابستہ تھے! —

امیر المومنین علیہ السلام کی یہ بھی ایک بڑی کامیابی تھی کہ مسلم عوام نے اکابر قریش کی بے اصولی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اور یہ حقیقت ان کے سامنے آگئی کہ جن لوگوں کو قوم کا ستون اور ملت کا عمود تصور کیا جاتا تھا وہ اتنے بے اصول اور مطلب دوست تھے کہ جس وقت جو بات ان کے مفید مقصد ہوتی تھی وہی کہنا شروع کر دیتے تھے، اور عوام کے مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر موقع پر خود اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتے تھے، جس وقت وہ الیکشن کے نام پر حکومت حاصل کر سکتے تھے، اس وقت انہوں نے رسول اللہؐ کے فیصلہ کی بھی پرواہ نہیں کی، اور جیسے ہی ان کو آزادانہ انتخابات میں اپنے اقتدار کو خطرہ نظر آیا ویسے ہی وہ خود نامزدگی کے دامن میں منہ چھپانے لگے، مسلم عوام کے سامنے اس حقیقت کا آجانا امیر المومنینؑ کی ایک شاندار کامیابی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اصول خلافت کی کھلی ہوئی فتح تھی، جس کا اعلان آپ نے غدیر خم میں فرمایا تھا!

یہ صحیح ہے کہ مسلم عوام کے اس احساس کا کوئی عملی نتیجہ تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتا، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قیصر اور کسریٰ کی قوتیں اسلامی سرحدوں پر موجود تھیں اور ایسے پر آشوب حالات میں مسلم عوام کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مسئلہ خلافت پر حکمران طبقہ سے کوئی اختلاف کر کے دشمن کو قوی اور اپنے آپ کو کمزور بنالیں، یہی وجہ ہے کہ عوام نے اس نامزدگی کو خاموشی سے قبول کر لیا اور مسلمانوں کے اتحاد اور مملکت اسلامیہ کے دفاع کی خاطر قریشی تاجروں کی حکومت چند سال تک اور برداشت کرنے پر تیار ہو گئے ——— لیکن مسلم عوام کی اس خاموشی کو خوشی یا ان کی رضامندی تصور کر لینا غلط ہے، بے چینی کا مظاہرہ بار بار ہوتا رہا ہے، اور اس کا تدارک اس "درۂ فاروقی" سے کیا جاتا رہا ہے۔ جسے خلیفۂ وقت کے "جلال و جبروت" کی فخر آفرین فشانی قرار دیا جاتا ہے!

حضرت خلیفہ دوم کے متعلق یہ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کافی سخت گیر تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آپ عوام کے "محبوب رہنما" اور "جمہوری قائد" تھے تو آپ کو قدم قدم پر اپنے "جلال" کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوا کرتی تھی؟ ـــــــ جلال اور غضب کا مظاہرہ یا تشدد پر عمل وہیں ہوتا ہے جہاں عوام میں حکمرانوں یا ان کے طرز عمل کے خلاف بے چینی ہوا کرتی ہے۔ عرب کی دنیا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھی چنانچہ وہاں بھی جو "مظاہرہ جلال و جبروت" ہو رہا تھا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ مدینہ کے ظاہری سکون کی تہہ میں طوفان کی پرورش ہو رہی تھی، عوام بے چین تھے، قریش تاجروں کے اقتدار کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی اور حکمران طبقہ اسی بے چینی کو دور کرنے کے لئے اس دُرّۂ فاروقی کا سہارا لے رہا تھا جس پر عقیدت کے مارے مسلمان آج تک فخر کی ٹوپیاں اچھالا کرتے ہیں۔

حضرت عمر کو خلافت مل گئی لیکن ایک ہوشیار سیاستدان کی حیثیت سے ان کو اس چیز کا پورا احساس تھا کہ حکومت کی اساس ہل چکی ہے، عوام بے چین ہو رہے ہیں اور قریش کا اقتدار اعلیٰ متزلزل ہو رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے:۔

(۱) قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور مسلمانوں کے لمبے لمبے وظیفے مقرر کر دیئے تاکہ ان کے اثرات سے فائدہ اٹھا کے عوام پر قابو رکھا جا سکے!

(۲) جنگ کے سلسلہ کو طول دیدیا تاکہ عوام کی توجہ لڑائیوں پر مبذول ہو جائے اور وہ فتوحات کی خبروں سے خوش ہو کے اپنی معاشی تباہ حالی اور مملکت پر قریشی سرمایہ داروں کی گرفت کو فراموش کر دیں!

(۳) بنی امیہ کو شام کی گورنری دے کے خرید لیا تاکہ عوام پران کے سابقہ اثرات سے فائدہ اٹھایا جائے!

(۴) درہ فاروقی کی خوب خوب نمائش کی گئی تاکہ عوام دہشت زدہ ہوجائیں، اور وہ حکومت کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کریں!

(۵) عربوں میں شدید قومی عصبیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ قریش کے حکمران طبقہ کو اپنے قومی اقتدار کا مظہر تصور کرتے ہوئے اس کی حکومت پر مطمئن ہوجائیں!

(۶) حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، اور امام حسین علیہ السلام کے بھی بڑے بڑے وظائف مقرر کر دیئے تاکہ عوام اس غلط فہمی کا شکار ہوجائیں کہ وہ جن لوگوں سے اپنی قیادت اور نجات کی آس لگائے بیٹھے ہیں وہ بھی قریش کی سرکاری مشین کا ایک پرزہ ہیں اور اس طرح عوام اپنے انقلابی رجحانات کے لئے کوئی مناسب قیادت نہ پاتے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر ہوجائیں!

(۷) عراق شام اور مصر وغیرہ میں عرب نو آبادیات قائم کر کے عربوں کی آبادی کو کافی حد تک منتشر کر دیا گیا، کوفہ اور بصرہ کے شہر اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں۔

(۸) عوام کی علمی اور ذہنی سطح کو پست رکھنے کی تدابیر پر پوری شدت سے عمل کیا گیا چنانچہ کتابت حدیث پر لوگوں کو سزائیں دی گئیں اور مساجد میں یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ صرف حکومت کے منظور کردہ حضرات ہی خطبہ دیا کریں!

عوام کی بے چینی پر قابو حاصل کرنے کی یہ اور دوسری بہت سی تدابیر اختیار کی گئیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، حالات بگڑتے چلے گئے اور آخر حضرت عمر کو

یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اپنے بعد کے لیے کوئی خلیفہ مقرر کر دیں چنانچہ آپ نے بڑے غور و فکر کے بعد وہ تدبیر اختیار کی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، حکومت پر قریشی تاجروں کا قبضہ بھی قائم رہے اور عوام کی جانب سے اخلاقی صدائیں بلند ہونے کا بھی امکان باقی نہ رہے ——— وہ تدبیر یہ تھی کہ آپ نے چھ آدمیوں کی کمیٹی مقرر فرمادی اور یہ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ آپس میں جس شخص کو منتخب کر لیں وہی اسلامی دنیا کا حکمران ہوگا!

اس کمیٹی میں آپ نے تدبیر یہ کی کہ قریش کے سرمایہ دار طبقہ کے پانچ نمائندے رکھے اور چھٹا آدمی وہ رکھا جو غریب مسلم عوام کی امیدوں کا آخری سہارا تھا۔ کمیٹی کے ارکان میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد ابن وقاص، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف سرمایہ دار طبقہ کے نمائندے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کروڑپتی تھا، ہر ایک کے بڑے بڑے کاروبار تھے، بڑی بڑی جاگیریں تھیں، کئی کئی محلات تھے، ہر ایک کے پاس سونے چاندی کا اتنا انبار تھا کہ ان کی دولت آج کے راک فیلر، فورڈ اور ٹاٹا کو شرم سے آب آب کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ان کی دولت کے ہوشربا افسانے پڑھ کے انسان آج بھی دنگ رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ خلافت ان میں سے جس بزرگ کو حاصل ہوتی وہ اسے قریش کے سرمایہ داروں کے مفاد کے لیئے استعمال کرتا اور چونکہ کمیٹی میں ۵⁄۶ اکثریت انہیں حضرات کی تھی اس لیئے یہ لازمی تھا کہ حکومت انہیں کے ہاتھوں میں ——— بہ الفاظ دیگر قریش کے انہیں تاجروں کے ہاتھوں میں ——— رہے گی جو اسے اپنے قبیلہ کے تاجرانہ مفاد کے لیئے استعمال کرتے رہیں گے!

قریشی سرمایہ داروں کو ۵⁄۶ اکثریت عطا کر دینے پر بھی حضرت عمر مطمئن نہیں تھے، آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی موت کے بعد رائے عامہ کا دباؤ

کمیٹی کے دو تین ممبروں پر اثر انداز ہو جائے اور خلافت اس شخص کے ہاتھوں میں چلی جائے جو قریش کی تاجرانہ لوٹ اور جاگیر دارانہ طمطراق کا سخت مخالف تھا، اسلیئے آپ نے یہ حکم بھی لگا دیا کہ اگر کمیٹی کے ممبران کے ووٹ برابر سے بٹ جائیں، تو وہ فریق کامیاب سمجھا جائے گا جسے عبدالرحمٰن بن عوف کا ووٹ حاصل ہو گا اور اس طرح آپ نے اس طبقہ کی حکومت یقینی بنا دی جسکے آپ خود نمائندے تھے، عبدالرحمٰن بن عوف کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ اپنے خالہ زاد بھائی حضرت عثمان کا ساتھ دیں گے" اس طرح حضرت عثمان اور حضرت ابن عوف کے ووٹ ایک ساتھ ہوں گے اور ان کو کامیابی کے لیئے صرف ایک ووٹ کی ضرورت ہو گی، اسلیئے کہ ایک ووٹ حاصل جانے کے بعد ابن عوف کا ایک ووٹ دو ووٹ کے برابر ہو جائے گا۔ اور قریشی سرمایہ دار طبقہ اپنی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو جائے گا!

حضرت عمر اس حقیقت کو جانتے تھے کہ عوام اب جنگ، گرانی اور معاشی بدحالی سے تنگ آچکے ہیں، اس لئے اگر کمیٹی میں صرف قریشی تاجروں کے نمائندے رکھے گئے تو ان کا فیصلہ عوام کے لیئے قابل قبول نہیں ہو گا اس لئے انہوں نے محض عوام کی اشک شوئی کے لیئے کمیٹی میں حضرت علیؑ کا نام بھی رکھ دیا تھا، لیکن اس کا پورا بندوبست کر دیا تھا کہ ان کو کسی حالت میں خلافت کا تخت دستیاب نہ ہونے پائے، عبدالرحمٰن بن عوف کے ہاتھوں میں خلیفہ سازی کی قوتیں مرکوز کر دینے کا مقصد صرف یہی تھا!

بہرحال اس کمیٹی میں حضرت علی علیہ السلام کے اسم گرامی کی شمولیت جہاں عوامی قوتوں کی ایک بڑی فتح تھی، اور اس کا ثبوت تھا کہ قریشی سرمایہ داروں پر رائے عامہ کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے وہیں یہ امیرالمومنین علیہ السلام

کے اصولوں اور آپ کے طرزِ عمل کی بھی ایک بہت بڑی کامیابی تھی اس لئے کہ آج قریش کے کرد دڑ پتی حکمران اس پر مجبور ہو رہے تھے کہ اس شخص کو جسے ابھی چند سال قبل تشدد سے باب خلافت تک لے جایا گیا تھا جسے اسلامی سیاست سے دور رکھنے کی ہر امکانی سعی کی جاتی رہی تھی، جسکے خلاف خاندانی اور نسلی تعصب کو خوب ابھارا جا چکا تھا۔ جسے فدک کی ضبطی اور خمس سے محرومی کے نتیجہ میں مالی طور پر برباد کیا جا چکا تھا۔ اور جس کے شرف و منزلت پر پردہ ڈالنے کی ہر امکانی تدبیر عمل میں لائی جا چکی تھی۔ اسی کو "مستحقین خلافت کی کمیٹی" میں شامل کیا گیا اور یہ کام خود انہیں حضرت عمر کو انجام دینا پڑا جنہوں نے آج سے محض پندرہ سال قبل اسی شخص کو قصر خلافت سے بیدخل کرنے میں سب سے بڑا کردار انجام دیا تھا۔

تقدیر اور حالات کا یہ کتنا بڑا اعجوبہ ہے کہ انہیں حضرت عمر کو جنہوں نے حضرت کو خلافت سے محروم کرنے میں سب سے نمایاں پارٹ ادا فرمایا تھا، مرتے وقت یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ عوام اگر کسی شخص کی حکومت میں مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو وہ حضرت علیؑ ہی ہیں۔ اور چار و ناچار ان کو علیؑ کا نام اس فہرست میں شامل کرنا پڑا جو آپ نے مستحقین خلافت کی تیار فرمائی تھی :

حضرت عمر کی آنکھ بند ہوتے ہی کمیٹی کے چھ ارکان میں سے چار حضرات دعوائے خلافت سے دستبردار ہو گئے اور اب صرف دو حضرات باقی رہ گئے جن میں سے کسی ایک کا خلافت کے لئے انتخاب ہونا تھا، ان دو میں ایک حضرت عثمان تھے اور دوسرے حضرت علیؑ! بظاہر اسے معمولی بات تصور کیا جائے گا، لیکن واقعات کا یہ رخ اختیار کرنا دراصل اس

عظیم ٹکراؤ کا پتہ دیتا ہے جو قریشی سرمایہ داروں اور عوامی قوتوں میں ہو رہا تھا حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے دلوں میں تمنائے خلافت کا وجود جنگ جمل کے حالات سے بخوبی ظاہر ہے، لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پیچھے ہٹ گئے حالانکہ حصول خلافت کا یہ بہت اچھا موقع تھا، سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ بظاہر ان کے اس اقدام کی مندرجہ ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں ــ

(۱) یہ حضرات عوام کی بے چینی سے کماحقہ واقف تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ عوام زیادہ عرصہ تک ان سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو برداشت نہیں کر سکیں گے، جو قریشی تاجروں اور جاگیرداروں نے پیدا کر دیئے تھے اور جلد یا بدیر حکمران وقت کے خلاف بغاوت ہو گی جس کا ان کو وہی خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو بالآخر حضرت عثمان کو بھگتنا پڑا۔

(۲) ان کو امید تھی کہ اگر حضرت عثمان خلیفہ بنا دیئے گئے تو بنی امیہ کی پوری قوت قریشی سرمایہ داروں کی پشت پر آ جائے گی اور ابوسفیان کو دور جاہلیت میں عوام پر جو اثر و نفوذ حاصل رہا تھا اس کی مدد سے سرمایہ داروں کا راج قائم رہ سکے گا؛

(۳) بنی امیہ اپنی روایتی سخت گیری، ظلم اور سیاسی جوڑ توڑ سے قریشی سرمایہ داروں کے لرزتے ہوئے ایوان حکومت کو انہدام سے بچا لیں گے، اور ان کو جلب منفعت کے جو راستے سابقہ حکومتوں کے دور میں حاصل ہو چکے تھے وہ قائم رہیں گے؛

(۴) حضرت عثمان کی پشت پر سارا برسر اقتدار طبقہ متحد نظر آنے کے نتیجہ میں عوام کا جذبہ انقلاب افسردہ ہو جائے گا۔

بہر حال یہ بھی امیر المومنینؑ کی ایک بڑی کامیابی تھی کہ آج قریش کا سارا برسر اقتدار طبقہ یہ تسلیم کر رہا تھا کہ علیؑ اتنی بڑی قوت ہیں کہ میدان انتخاب سے ان کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا اور ان کو نظر انداز کر کے خلافت کا معاملہ طے کرنا حد درجہ مشکل ہے۔ وہی علیؑ جن کو گذشتہ دو مواقع پر انتہائی بے فکری سے نظر انداز کر دیا گیا تھا آج عوام میں اتنے ہر دلعزیز اور اتنے با اثر ہو چکے تھے کہ ان کو نظر انداز کر کے کام چلانا ناممکن خیال کیا گیا، اور برسر اقتدار طبقہ کو اپنے نمائندہ کے مقابلہ میں چار ناچار ان کا نام رکھنا پڑا، یہاں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کا اختیار عبد الرحمن بن عوف کو کیوں دیا تھا؟ اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حق انتخاب سرمایہ دار طبقہ کے ایک فرد کے ہاتھوں میں نہ سونپ دیا گیا ہوتا بلکہ اسے عوام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو حضرت عمرؓ کے بعد ہی وہ شخص خلیفہ ہو جاتا جو بالآخر حضرت عثمان کے قتل کے بعد خلیفہ بنایا گیا!

یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت عثمان اور ان کے ساتھی قریشی سرمایہ دار تو حصول خلافت کے لئے بے چین تھے لیکن امیر المومنینؑ اس باب میں انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے تھے، اس کی وجہ ظاہر ہے، قریشی سرمایہ داروں کو اپنا ایوان اقتدار متزلزل نظر آ رہا تھا، اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب عوام کو زیادہ دنوں تک دھوکے میں مبتلا رکھ کے ان پر حکومت کرتے رہنا اور اس حکومت کے نتیجہ میں خزانے جمع کرتے رہنا مشکل ہے اور امیر المومنینؑ کو اپنی قوت پر پورا اعتماد تھا، آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ عوام تو اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس

شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے اور وہ الٰہی نظام حکومت کی خوبی نیز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتخاب خلافت کی اصابت کا اعتراف کرنے لگے ہیں، انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جن لوگوں پر وہ اعتماد کر رہے تھے انہوں نے ان کو دھوکہ دیکر ان پر الٰہی حکومت کے بجائے سرمایہ داروں کا راج قائم کر دیا ہے اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں، کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کی خلافت پر جو اصرار کیا تھا وہ حکومت کو اپنے خاندان میں مرکوز رکھنے کی خاطر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ علیؑ ہی اسلامی دنیا میں وہ واحد شخص تھے جو حکومت الٰہیہ قائم کرنے اور ملت اسلامیہ کی عظیم انقلابی تنظیم کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے :——— امیر المومنینؑ عوام کے اس نئے رجحان کا پورا اندازہ رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ یہ چاہتے تھے کہ عوام کو کچھ اور تجربات ہو جائیں تاکہ الٰہی نظام حکومت کی صحت کے باب میں ان کو کوئی شبہ باقی نہ رہے اور آئیڈیم اکا برقراش کو یہ موقع نہ ملنے پائے کہ وہ عوام کو بہکا سکیں، یہی وجہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ آپ کا نام کمیٹی میں شامل کر دیا گیا تھا اور پھر چار امیدوار دستبردار ہو جانے کے نتیجہ میں آپ کے مقابلہ میں صرف ایک امیدوار رہ گیا تھا، جو کسی حالت میں آپ کا مدمقابل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا آپ نے حصول خلافت پر کوئی توجہ نہیں فرمائی، اور عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے کی جو چال چلی تھی اُسے کامیاب ہونے کا موقع دیدیا، یہ سیاست علویہ کا بڑا دلچسپ مظاہرہ تھا اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں

(۱) عوام نے یہ دیکھ لیا کہ حکمران قریشی تاجر طبقہ اپنے اقتدار کی بقا کے لیے کس حد تک سازشی ماحول تیار کر سکتا ہے۔

(۲) عبدالرحمٰن بن عوف کی اسلام دوستی اور ایمانداری کا پول دنیا پر کھل گیا۔

(۳) ایک قریشی سرمایہ دار کے ہاتھوں میں انتخاب خلافت کا حق سونپ دیئے جانے کا نتیجہ عوام نے دیکھ لیا اور ان کو معلوم ہو گیا صحابیت اور رسول اللہؐ سے رشتہ داری کے باوجود ایک قریشی سرمایہ دار کس حد تک عدل اور عوام دوستی کا مظاہرہ کر سکتا ہے!

(۴) نئے خلیفہ کے سلسلہ میں عوام کو یہ تجربہ ہو گیا کہ کسی شخص کا صحابی ہونا یا مہاجر ہونا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ربیب لڑکیوں کا شوہر ہونا بھی ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ الٰہی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال سکتا ہے۔

(۵) جس بزرگ نے خلافت اسلامیہ کی قسمت ابن عوف کے ہاتھوں میں دے دی تھی ان کی دیانتداری، اصابت فکر، عدل پروری، صحت رائے اور مردم شناسی کا بھی اچھا خاصا مظاہرہ ہو گیا!

غرض یہ کہ امیرالمومنینؑ نے اس موقع پر مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں جو بے اعتنائی ظاہر فرمائی اس کے نتیجہ میں آپ نے

(۱) خلیفہ سابق (۲) خلیفہ جدید (۳) خلافت ساز ارکان کمیٹی اور (۴) قریش کے حکمران طبقہ کو ایک ساتھ برانگندہ نقاب کر دیا اور

ان کے چہروں پر صحابیت، عدالت، اسلامیت اور عوام دوستی کی جتنی نقابیں پڑی ہوئی تھیں وہ سب ایک ساتھ نوچ کے پھینک دیں تاکہ عوام یہ سمجھ لیں کہ صحابیت، تقدس، شرف ہجرت اور نسبی بلندی کے سارے افسانوں کے باوجود قریش کا طبقہ اعلیٰ درحقیقت کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور حکومت الہیہ یا خلافت اسلامیہ کے باب میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے انتخاب خلافت کے سلسلہ میں جو اصول وضع فرمایا تھا وہ بھی کافی حد تک دلچسپ اور قریش کے تاجرانہ مفاد کا پورا پورا مظہر تھا، آپ نے حضرت علیؑ اور حضرت عثمان دونوں سے یہ وعدہ چاہا کہ وہ

"کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور سیرت خلفائے راشدین پر عمل کریں گے!"

اس جملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے ٹکڑے تو محض "برائے وزن بیت" تھے، ورنہ اصل سوال تو سیرت خلفائے راشدین کا تھا جو یہ تھی کہ

(۱) قریش کے بڑے بڑے لوگوں کو بیت المال سے جو لمبی لمبی رقمیں ملا کرتی تھیں وہ دیجاتی رہیں گی!

(۲) فتوحات کا سلسلہ جاری رہے گا اور ان ممالک کی زرخیز زمینیں "حسب دستور قدیم" عرب سرداروں کو تقسیم ہوتی رہیں گی!

(۳) قریش کا نسبی تفاخر عام عربوں پر اور عام عربوں کی نسلی برتری غیر عربوں پر قائم رہے گی

(۴) تقسیم بالسویہ کا وہ اصول جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور حکومت میں جاری تھا دوبارہ جاری نہیں کیا جائیگا!

(۵) لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہے گا تاکہ گرانی باقی رہے اور قریشی تاجروں کو نفع اندوزی کا پورا موقع حاصل ہوتا رہے!

(۶) عوام کے انقلابی رجحانات کو کچلنے کی پوری کوشش کیجاگی تاکہ غیر قریشی عربوں اور مفتوحہ ممالک کے مسلمانوں میں قریش کی معاشی لوٹ کے خلاف جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ دبی رہے!

(۷) عوام کو جاہل رکھنے کی پوری کوشش کی جائے تاکہ وہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنے ان حقوق کا مطالبہ نہ کرنے پائیں جو اللہ نے ان کو عطا کیے تھے!

یہ تھی وہ سیرت شیخین جو سرمایہ داران قریش کے مفاد کی تکمیل کرتی تھی اور جس پر عمل کرنے کا عبد الرحمٰن بن عوف نئے خلیفہ سے عہد لینا چاہتے تھے امیر المومنینؑ نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا لیکن حضرت عثمان نے یہ شرط منظور فرمالی، چنانچہ آپ خلیفہ مقرر کر دیئے گئے۔

حضرت عثمان کے خلیفہ ہوتے ہی جہاں عوام کی امیدوں پر اوس پڑ گئی وہیں خود اکابر قریش نے بھی یہ محسوس کیا کہ وہ خود اپنے بنائے ہوئے جال میں پھنس گئے، اس لئے کہ نئے خلیفہ نے منفعت کے وہ تمام راستے جو سارے قریش کے لئے کھلے ہوئے تھے صرف بنی امیہ کے لئے مخصوص کر دیئے، مروان اور سعد بن العاص وغیرہ وزارت کی کرسیوں پر فائز ہو گئے، صوبوں کی گورنری بنی امیہ کے سپرد کر دی گئی، بیت المال ایک مخصوص خانوادہ کی ملکیت قرار دیدیا گیا، طلحہ اور زبیر کے سے عمائد سلطنت

نظر انداز کیے جاتے لگے، بی بی عائشہ کی سی سیاسی قوت کو بھی لپ پشت ڈال دیا گیا، ایوانِ سلطنت دولت کی کنجیوں سمیت ایک مخصوص قبیلہ کے قبضہ میں آگیا، اور مہاجرین قریش نے جس حکومت کو اپنانے کے لیے اللہ اور رسولؐ کے احکام تک سے سرتابی کی تھی وہ حکومت بنی امیہ کی ایک ایسی خاندانی املاک میں تبدیل ہو گئی جس میں قریش کے دوسرے گھرانوں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا!

قریش کو حالات کے اس رُخ پر جتنی مایوسی ہوئی اس کا مظاہرہ خود عبدالرحمٰن بن عوف کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو موصوف نے مرتے وقت ارشاد فرمائے تھے اور جنہیں اس امر پر انتہائی افسوس اور پشیمانی ظاہر کی گئی تھی کہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں حضرت عثمان مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ مقرر ہو گئے!؟

قریش یہ سمجھے تھے کہ انہوں نے علیؑ کے مقابلہ میں عثمان کو خلیفہ بنا کے ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے لیکن واقعات نے یہ ثابت کر دیا، کہ ان کی یہی کامیابی ان کی ایسی عبرت انگیز شکست کا سبب بنی کہ حضرت عمر کے بعد قریش کے کسی قبیلہ کے کسی فرد کو تختِ خلافت نصیب نہیں ہوا، اسلام کی بادشاہت یا تو بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی یا پھر بنی عباس کی شکل میں انہیں بنی ہاشم کو حاصل ہو گئی جن کو ایوانِ حکومت سے دُور رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی، قریش کے دوسرے قبائل ہمیشہ کے لیے حکومت سے محروم ہو گئے —— اور یہ سب نتیجہ تھا اس خوفناک سیاسی غلطی کا جو حضرت عثمان کو خلیفہ مقرر کر کے عبدالرحمٰن بن عوف نے کی تھی، یا پھر عبدالرحمٰن بن عوف کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق دے کر

ان حضرت عمر نے کی تھی جن کے سیاسی تدبر اور دور بینی پر مسلمانوں کا سواد اعظم آج تک ناز کرتا ہے!

قریش کے سیاسی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ انہوں نے جس حکومت کے حصول کے لیے غدیر کے رسالت پناہی فرمان کو ٹھکرا دیا اور جسے باقی رکھنے کے لیے ان کے پاس مذہب کی بے پناہ قوت بھی موجود تھی اسے بھی وہ پندرہ سال سے زیادہ قائم نہ رکھ سکے اور آخر حرص حکومت میں ایسی مہلک سیاسی غلطی کر بیٹھے کہ ہمیشہ کے لیے ان کے اقتدار کا آفتاب غروب ہو گیا، اور چند ہی سال میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مکہ اور مدینہ کا وہ حکمران طبقہ جس کا اقتدار دنیا کے کئی ممالک میں مسلم تھا خود دمشق اور بغداد کے حکمرانوں کا محکوم ہو گیا، اور سیاسی اعتبار ایسا مفلوج ہوا کہ اس کے لئے دوبارہ حصول اقتدار کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس امیر المومنینؑ کا سیاسی تدبر بلاحظہ فرمائیے، کہ قریش اور بنی امیہ کی مشترکہ طاقتوں کے برخلاف آپ کو وہ حکومت مل کے رہی جس سے آپ کو محروم رکھنے کے لیے بے اصولی اور سازش کو جائز قرار دے رکھا گیا تھا، اور خود اس قوم کو آپ سے حکومت کی درخواست کرنا پڑی جو پچیس سال تک آپ کو نظر انداز کرتی رہی تھی!

حضرت عثمان کی حکومت نہ عوام میں مقبول تھی نہ خواص میں، اسلامی تاریخ کا یہ دور صرف بنی امیہ کی لوٹ اور ستم رانیوں کی ایک دردناک داستان ہے، اس دور سلطنت میں مروان بن حکم، یعلیٰ بن منیہ، مغیرہ بن شعبہ، ولید بن عتبہ، عبداللہ بن عامر اور عبداللہ بن ابی سرح کے سے بدترین افراد ملت پر حاکم ہو گئے جنہوں نے اپنی لوٹ، زر اندوزی اور مظالم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو

بے حد مشتعل کر دیا، عوام کا پیمانہ صبر چھلک اٹھا، اصلاح حال کی جو کوششیں کی گئیں ان کو خود خلیفہ وقت نے برباد کر دیا، اس لئے کہ حضرت عثمان کا یہ خیال تھا کہ وہ حضرت عمر کی سی سخت گیری پر عمل کر کے عوام پر قابو رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ عمار اتنے پیٹے گئے کہ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں، ابوذر جلا وطن کر دیئے گئے اچھے اور نیک لوگوں پر ہر قسم کا تشدد روا رکھ لیا گیا اور سمجھا یہ گیا کہ اس تشدد کے نتیجہ میں عوام کو دبا لیا جائے گا لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

سازش اور تشدد کے حربے چند دن تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتے، آخر ان کے خلاف عوام ابھرتے ہیں اور پھر عوامی غصہ کا سیلاب ایسا تیز و تند ہوتا ہے کہ بڑی بڑی طاقتوں کو بہا لے جاتا ہے چنانچہ مصریوں کے ساتھ جو فریب کاری کی گئی اس نے بارود کے اس تودے میں دیا سلائی دکھا دی جو مسلمانوں کے دلوں میں تیار ہو چکا تھا، خلیفہ کا مکان گھیر لیا گیا اور مٹھی بھر مصریوں نے محض اس لئے بساط سلطنت الٹ دی کہ نہ قریش خلیفہ کا ساتھ دینے پر تیار تھے اور نہ انصار فرمانروائے وقت کے حامی، سارے مسلمان خلیفہ کے کردار و عمل سے زچ آچکے تھے اسلئے کوئی ان کی مدد کرنے پر تیار نہیں تھا، اور جو لوگ مدد کر سکتے تھے ان کو دولت اور عشرت نے اتنا ناکارہ بنا دیا تھا کہ ان میں مصریوں کے مقابلہ کی سکت باقی نہیں رہی تھی، آخر حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے اور ان کی نعش کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ ان جذبات کا پورا مظہر ہے جو اس وقت کے مسلمانوں میں آپ کے متعلق موجود تھے!

آج کے مسلمان حضرت عثمان پر عقیدت کے جتنے چاہیں پھول برسائیں

اور بنی امیہ کے دور میں گڑھی ہوئی احادیث کی بنیاد پر ان کی محبت کو جتنا چاہیں ضروری قرار دیں، لیکن اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ دور اوّل کے ان مسلمانوں نے جو صحابہ اور تابعین پر مشتمل تھے نہ صرف یہ کہ حضرت عثمان سے عقیدت و محبت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ان کو یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرکے آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک سرمایہ عبرت اور ایک دعوت فکر چھوڑ گئے! ـــــ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہمارے مقابلہ میں حضرت عثمان کے "فضائل و مناقب"، ان کے کردار و عمل اور ان کے محاسن و مدارج کو زیادہ بہتر طریقہ پر جانتے تھے، اس لئے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت خلیفۂ ثالث کی دستگیری کیوں نہ کی؟ ان کی نعش کی بے حرمتی کیوں قبول کی؟ انکی موت پر اشک غم بہانے کے بجائے گھروں میں کیوں بیٹھے رہے؟ ـــــ اس کا جواب اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عوام موصوف کی حکومت سے تنگ آچکے تھے اور آپ کی حکومت کے جو کوائف عوام کے سامنے پیش ہوئے تھے انہوں نے عوام کو اس درجہ پریشان اور دلگیر کردیا تھا کہ وہ آپ سے اور آپ کی حکومت سے نجات حاصل کرنے میں ہی اپنی سلامتی تصوّر کرنے لگے تھے!

اس موقع پر ایک چیز اور قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان دونوں قتل کئے گئے۔ اگر یہ حضرات قوم میں ہردلعزیز ہوتے تو ان کی موت پر یقیناً عوام کے جذبات بھڑک اٹھتے اور لوگ اس نظام حکومت کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے جسکے وہ علمبردار تھے، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے قتل پر عام مسلمان بالکل خاموش رہے ان کے جذبات میں کوئی تموّج پیدا نہیں ہوا، اور جب بنی امیہ نے اپنے

مخصوص سیاسی مصالح کے پیش نظر انتقام خون عثمان کا شور برپا کرنا چاہا تو سارے سچے مسلمان ان کے مقابلہ میں تیغ بکف ہو کے میدان میں آ گئے اور آخرہ خود بنی امیہ کو یہ احساس ہو گیا کہ اس نام پر ان کا مقصد پورا ہونے والا نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے انتقام خون عثمان کا نعرہ ترک کر کے حصول خلافت کی مہم کا نعرہ بلند کر دیا۔ یہ چیز بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کا قتل مسلمانوں کی نظر میں کوئی اصولی یا مذہبی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی حیثیت عام مسلمانوں کے نزدیک اس قسم کے خالص سیاسی قتل کی تھی، جس کا سابقہ عام طور پر ان بادشاہوں کو پڑا کرتا ہے جو اپنے عوام میں ہر دلعزیزی کھو دیتے ہیں یا ایسی سخت گیریوں سے کام لیتے ہیں جن سے عوام میں ان کے خلاف بیزاری اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں!

اسلامی دنیا کے ان پر آشوب سیاسی حالات میں امیرالمومنینؑ خاموش پالیسی پر عامل رہے اس لئے کہ حالات کا ہر نیا رخ اور سیاست کا ہر نیا موڑ آپ کی کامیابی کی دلیل بنتا جا رہا تھا، مسلمان خود اپنے تجربات کی روشنی میں یہ دیکھ رہے تھے، کہ اجماع سے خلافت بنی تو اس نے گرانی اور جنگ کے دروازے کھول دیئے۔ نامزدگی کا اصول اختیار کیا گیا تو اس نے مسلمانوں کو معاشی بنیادوں پر اونچے اور نیچے طبقوں میں بانٹ دیا، نیز ان میں عربی و عجمی کا فرق پیدا کر کے باہمی منافرت کا بیج بو دیا، اور سیرت شیخین کی بنیاد پر شورای کی راہ اختیار کی گئی تو بنی امیہ کے بدترین افراد امت پر حکمران ہو گئے، یہ باتیں اگر زبان سے کہی گئی ہوتیں تو ان پر کسی کو یقین نہ آتا بلکہ شاید پیغمبر کی ذات پر بھی یہ الزام عائد کر دیا جاتا کہ وہ

اپنے خاندان میں حکومت مرکوز رکھنے کے لئے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں اس لئے امیرالمومنینؑ نے یہ چاہا کہ مسلمان خود "حکومت غیر معصوم" کا تماشا دیکھ لیں اور یہ تجربہ کر لیں کہ جب نبیؐ کے پہلو نشین غیر معصوم کی حکومت یہ رنگ دکھا سکتی ہے اور اتنی غلط ہو سکتی ہے کہ بالآخر عوام کو بغاوت اور خونریزی کی راہ اختیار کر کے فرمانروائے وقت سے نجات حاصل کرنا پڑے تو دوسرے غیر معصوم حکمرانوں کی فرمانروائی جنہیں "علیٰ منہاج الرسالۃ" ہونے کا شرف بھی حاصل نہ ہو کیا گل کھلا سکتی ہے؟ امیرالمومنینؑ نے خاموش رہ کے نہ صرف یہ کہ اس وقت کے مسلمانوں پہ یہ ثابت کر دیا کہ حکومت الٰہیہ کا کام وہی چلا سکتا ہے جسے نبیؐ نے اللہ کے حکم سے اس امر عظیم پر مامور فرمایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح فرما دی کہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان غدیر اسی خلوص اور بے لوثی پہ مشتمل تھا جس خلوص اور بے لوثی پر شریعت کا ہر حکم مبنی تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کی وصایت و ولایت کا جو اعلان فرمایا تھا اس میں خود قوم کی بھلائی تھی، رسولؐ یا آلِ رسولؐ کا اس میں کوئی ذاتی یا خاندانی فائدہ نہیں تھا!

حضرت عثمان کا قتل جن حالات میں ظہور میں آیا وہ حد درجہ پُر آشوب تھے، مسلمانوں میں شدید ذہنی انتشار پھیلا ہوا تھا، بغاوت کی تیز و تند آندھیوں نے مدینہ کے در و دیوار ہلا دیئے تھے، قریش کے اقتدار کا محل زمین بوس ہو چکا تھا، مصر اور بصرہ میں شورش کے آثار پورے طور پر نمایاں تھے، حاکم اور محکوم کا جو غیر اسلامی امتیاز سابقہ حکومتوں نے پیدا کر دیا تھا اس کے نتیجہ میں ہر سمت نفرت اور عتاب کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں،

شام سے ملوکیت کا شیطان اپنے سینگ برآمد کر رہا تھا، معاشی بنیادوں پر طبقات میں تقسیم کی ہوئی قوم طبقہ اعلیٰ کی زرکشی اور اکتناز سے تنگ آ چکی تھی عام مسلمان قریشی تاجروں اور جاگیرداروں کی حکومت برداشت کرنے پر تیار نہیں رہے تھے۔ خود قریشی اکابر کا یہ عالم تھا کہ وہ عوامی عتاب کے اس سیلاب سے تھر تھر کانپ رہے تھے، ان میں سامنے آنے کی جرأت نہیں تھی وہ اپنی دولت اور خزانوں کو بچانے کی فکر میں تھے اور سیاسی مطلع سے روپوش ہو جانے میں ہی اپنی سلامتی تصور کرتے تھے، بنی امیہ بھی اپنے اعمال کے نتائج سے لرزہ براندام تھے اور ان میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ بپھرے ہوئے عوام کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں ان حالات میں ایک سیاسی خلا سا پیدا ہو گیا تھا، کوئی شخص خلافت کی مسند سنبھالنے یا قیادت کا بارِ گراں اٹھانے پر تیار نہیں تھا، حضرت عثمان کا حشر سب کے سامنے تھا اور ایسی حالت میں وہ تمام مدعیان خلافت و دعویداران قیادت خاموش تھے، جو ابھی کل تک مسند حکومت پر فائز ہو کر مفتوحہ ممالک کے خراج پر قابض ہونے اور دولت و سلطنت سے کھیلنے کی تمنا میں سرگرداں نظر آ رہے تھے، قریش کی حکومت ختم ہو جانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا تھا اُسے پر کرنے کے لئے کوئی آگے بڑھنے پر تیار نہیں تھا۔ ان حالات میں قوم کی نگاہیں اپنی قیادت کے لئے جس شخص کی طرف اٹھیں وہ امیر المومنینؑ ہی کی ذات گرامی تھی!

امیر المومنینؑ نے قبول خلافت سے انکار کیا، اس لئے نہیں کہ آپ قیادت کا بارِ گراں سنبھالنے سے احتراز فرما رہے تھے یا اس وقت کے حالات سے اسی طرح متوحش تھے جس طرح دوسرے اکابر قریش سراسیمہ

وَمتوحش تھے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ رہے تھے، کہ پچیس سال میں مسلمانوں کے نفوس بگڑ چکے ہیں، ان میں حرص وآز کا مادہ بے حد بڑھ چکا ہے۔ اور وہ اس الٰہی نظام حکومت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں جسے رائج اور نافذ کرنا امام کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا، آپ یہ جانتے تھے کہ قریش اور بنی امیہ دونوں عوامی غصہ کا یہ سیلاب ختم جانے کے بعد اپنے اپنے اقتدار کی بازیابی کی جدوجہد کرینگے، اور اس طرح دنیائے اسلام میں خانہ جنگی کا ایک دور شروع ہو جائے گا۔ آپ اس سے بھی واقف تھے کہ تین خلافتوں کے زمانہ میں جو حالات رونما ہوتے رہے ہیں ان میں مسلمان اپنا انقلابی جوش اور اسلامی اصولوں کیلئے جذبہ جہاد کھو چکے ہیں اور اب ان میں یہ سکت نہیں ہے کہ وہ ایک خالص اصولی جنگ کے لئے میدان میں اتر سکیں، ایسی حالت میں آپ کے لئے خلافت قبول کرنا دراصل ایک بے سود سی بات تھی اس لئے کہ اب وہ قوم ہی نہیں رہی تھی جس کی آپ امامت فرماتے، اب تو مسلمان کے نام سے ایک ایسی تھکی ہاری، پاشان، سراسیمہ، حریص، بزدل اور بے اصول جماعت رہ گئی تھی جس میں ازسرنو اسلام کا جذبہ پیدا کرنا، جہاد کا ذوق ابھارنا، ایمان کی تڑپ پیدا کرنا اور وہ حیات نو دوڑانا ضروری تھا جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دورِ حیات میں پیدا کر دی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ حکومت کی ذمہ داریاں قبول کرنے پر تیار نہیں تھے، اور چاہتے تھے کہ اپنا وقت تبلیغ واشاعت دین اور تزکیہ قلب ونفس میں صرف فرمائیں لیکن جب مسلمانوں نے اصرار کیا تو آپ نے ان کو طلحہ اور زبیر وغیرہ کو آزمانے کا مشورہ دیا تاکہ جن جن لوگوں کے

دلوں میں تمنائے حکومت وقیادت مچل رہی ہو، وہ سب اپنے دلوں کی حسرتیں نکال لیں اور اگر مصریوں کے خوف سے دلوں کے جذبے مُردہ پڑ گئے ہیں تو کم از کم مسلمان یہ تو دیکھ لیں کہ جب مدینہ پر بن برس رہا تھا، مال بٹ رہا تھا، لمبے لمبے وظیفے مقرر ہو رہے تھے، جاگیریں تقسیم ہو رہی تھیں اور عزت وشہرت کا بازار گرم تھا، اسوقت مسلمانوں کی قیادت، اور ملت کی سرداری کا دعولے کرنے والے مشیرانِ سلطنت وعمائدِ حکومت دراصل کتنے پانی میں ہیں۔ اور ملت پر وقت پڑنے کے بعد ان لوگوں میں سے جنہوں نے خلافت اسلامیہ کے نام پر سونے چاندی کے خزانے جمع کر لئے ہیں وہ کون ہیں جو ملّت کی دستگیری کے لئے آگے بڑھتے ہیں؟

امیرالمومنینؑ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کر کے عشرہ مبشرہ کے ارکان، بدر واُحد کے سورماؤں، بڑی بڑی احادیث فضیلت کے مالکوں اور مناقب ومدارج کے نام پر لمبے لمبے وظیفے وصول کرنے والوں کو ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا ——— کہ اب وہ آئیں اور مصری تلواروں کی چھاؤں میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا امتحان دیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان حدیثوں اور مناقب کے واقعی سزاوار ہیں۔ جو خوشامدیوں اور مطلب پرستوں نے ان کی شان میں گڑھ دیں تھیں، ثابت کریں کہ وہ ان بڑے بڑے وظائف کے مستحق تھے جو وہ دورِ خلافت ثانی سے وصول کرتے رہے تھے، ثابت کریں کہ ان میں سیادت وقیادت کے وہ جوہر موجود ہیں جن کے وہ مدینہ کے پُرسکون ماحول میں دعوے کیا کرتے تھے اور اس پُرآشوب دور میں خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر سکے۔ یہ

ثابت فرمائیں کہ وہ واقعی ملت اسلامیہ کے سچے بہی خواہ اور اس کے حقیقی جان نثار ہیں ــــــ یہ ایک بڑا اہم اور دلچسپ سوال تھا جو امیر المومنینؑ نے اٹھا دیا، اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت پیش پیش نظر آنا اور بات ہے، امور مملکت میں دخیل ہو کر بڑے بڑے مناصب حاصل کر لینا اور بات ہے اور مشکل کے وقت قوم کے سینہ سپر ہو جانا، ملت کی خاطر جان جوکھم میں ڈال دینا اور پُر آشوب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے سفینۂ قومی کی ناخدائی کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ اور یہ کام صرف وہی شخص انجام دے سکتا ہے جسے قدرت نے اپنے گنجینۂ فیض سے قیادت کی وہ صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں جن آیۂ ولایت گواہ ہے!

خلیفہ کی تلاش میں ایک ہفتہ بیت گیا لیکن آج اتنی بڑی حکومت کا جو افغانستان کی سرحدوں سے افریقہ تک اور ماوراء النہر سے لیکر عدن تک پھیلی ہوئی تھی کوئی حکمران یا وارث بننے پر تیار نہیں تھا، وہی اکابر قریش جن کی شجاعت کی داستانوں پر دنیا سر دھنتی ہے مٹھی بھر مصریوں سے اتنے خوف زدہ تھے کہ آج وہ اس حکومت کو قبول کرنے سے کترا رہے تھے جس کے لیے انہوں نے فرمان رسالتؐ تک کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ ثبوت تھا اس امر کا کہ ان میں قوم کی قیادت کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ جذبہ، وہ سازش اور جوڑ توڑ سے پُر امن حالات میں حکومت پر قابض ہو جانا تو جانتے تھے، لیکن کٹھن وقت پڑ جانے پر قوم کو مصیبت سے بچانے، پیچیدہ حالات کو درست کرنے مصائب کا مقابلہ کرنے اور امت مسلمہ کو تباہی سے نکالنے کے لئے جس ایثار، جس جذبہ قربانی اور جس ذہانت کی ضرورت تھی وہ ان میں ناپید تھی، قوم نے اپنے ان نام نہاد اکابر کا تماشا دیکھ لیا تو اس کی ملتجیانہ نگاہیں اور حسرت بھری

نظریں اسی شخص کی جانب اٹھیں جسے ایوان حکومت سے دور رکھنے میں قریش کی سازشی ذہانت پچیس سال تک اپنی ساری قوتیں صرف کر چکی تھی ساری قوم اس سے اپنی قیادت اور نجات کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئی اور اس طرح عملاً قوم نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ قومی زندگی میں ایک نازک موڑ آ جانے پر جو شخص اس کے سفینہ کو پار لگا سکتا ہے وہ علیؑ بن ابی طالب ہی ہیں!

مزہ کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مدینہ میں وہ طلحہ، زبیر اور سعد بن وقاص بھی موجود تھے، جنہوں نے ابھی کل کی بات ہے کہ سیرت شیخین کی پابندی کو شرط خلافت قرار دیا تھا، لیکن آج؟ —— آج یہ شرط ختم ہو چکی تھی صرف ختم ہی نہیں ہو چکی تھی بلکہ سرے سے بھلائی جا چکی تھی، اور خود ان اکابر قریش نے بھی بھلا دی تھی جو اس شرط کے موئید تھے! —— یہ امیر المومنینؑ کی ایک عظیم اصولی فتح تھی اس لئے کہ اس طرح عملاً یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ شرط کوئی شرعی یا مذہبی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ یہ سوال صرف ایک سازش کے ماتحت اٹھایا گیا تھا، اور اس کا مقصد محض اتنا تھا کہ قوم پر قریشی سرمایہ داروں کا راج قائم رکھا جائے!

امیر المومنینؑ اگر قبول خلافت میں تاخیر نہ فرماتے تو اکابر قریش کی اس سازش کا حال نہ کھلتا اور شاید دنیا اس دھوکے میں رہ جاتی کہ سیرت شیخین پر عمل بھی کوئی مذہبی شرط ہے لیکن سیاست علویہ کے قربان جایئے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خلافت کے سے شرعی مسئلہ میں اس بدعت کا خاتمہ کر دیا بلکہ دنیا پر یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت ایسی چیز ہے جس کے لئے صحابہ کرام تک شریعت میں بدعت کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور محض اپنے

مقصد برآری کے لئے یا صاف الفاظ میں حصول حکومت کے لئے ایسی چیزیں ایجاد فرما سکتے ہیں جن کو دوسرے موقع پر خود انہیں کو مسترد کرنا پڑ جاتا ہے!

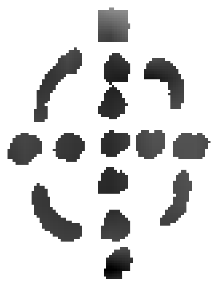
امیر المومنینؑ کے اس طرز عمل نے اس وقت کے بزرگوں کے چہروں پر پڑی ہوئی خلوص، بے لوثی، للّٰہیت اور صحابیت کی نقابیں اس خوبصورتی سے الٹ دیں کہ اب صاحبان نظر ——— جو عقیدت کے بجائے عقل و بصیرت سے کام لینا جانتے ہوں ——— حقائق اور شخصیتوں کو برافگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور مزیدار بات یہ ہے کہ امت نے امیر المومنینؑ کی ذات پر "اجماع" کیا لیکن امیر المومنینؑ نے اس اجماع کا فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، طلحہ، زبیر اور دوسرے اکابر قریش نے "شوریٰ" کے ذریعہ آپ کی خلافت کا فیصلہ کیا، لیکن آپ نے اسے بھی مسترد کر دیا سیرت شیخین کا سوال اٹھانے کی تو کسی میں ہمت ہی نہیں ہوئی، لیکن اس باب میں آپ کا جو فیصلہ تھا اس سے دنیا واقف ہے ——— ایسی حالت میں آپ نے قوم کے ساختہ و پرداختہ ہر اصول خلافت کو مسترد کر دیا لیکن قوم نے پھر بھی خلافت آپ کے سپرد کی ——— اور بصد اصرار سپرد کی ——— جو سیاست علویہ کا ایک بے نظیر نمونہ اور آپ کی ایک عظیم الشان اصولی فتح ہے!

دنیا نے دیکھ لیا کہ خلافت سازانِ اُمّت ہار گئے اور علیؑ جیتے، علیؑ نے اجماع کو بھی نہیں مانا، شوریٰ کو بھی نہیں مانا، نامزدگی کو بھی نہیں مانا، انتخاب خلافت کے سلسلہ میں قریش کے وضع کردہ "ہر اصول" کو ٹھکرایا۔ اور قریش نہ صرف یہ کہ خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہے بلکہ انہوں نے

اپنے ان مزعومات کی شکست کے باوجود علیؑ کی بیعت کی اور اس طرح اپنے عمل سے یہ قبول کر لیا کہ ان تمام شرائط کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ تو سب حصول حکومت کی تدبیریں تھیں، جس وقت جس ترکیب سے کام نکل سکتا تھا اس وقت وہ ترکیب اختیار کر لی جاتی تھی اور مقصد برآری کے بعد اسے فراموش کر دیا جاتا تھا، سوال نہ دین کا تھا نہ ملت کا، مقصد جو کچھ تھا وہ حکومت کا تھا!

امیرالمومنین کو پچیس سال تک ایوان حکومت سے ضرور دور رہنا پڑا، لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چہروں پر پڑی ہوئی نقابیں اُلٹ گئیں، عدالتِ صحابہ کا ڈھونگ ختم ہو گیا، اور کم از کم عقل و بصیرت رکھنے والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ کون کیا تھا؟ اور صدر اسلام کی سیاسی زندگی جسے اعلیٰ اصول پروری اور اسلامیت کا مظہر اتم قرار دے کے علیٰ منہاج النبوۃ کے معزز لقب سے نواز دیا گیا ہے حرص حکومت، مطلب برآری، زراندوزی، سازش اور بے اصولی کے کتنے فتنوں سے آلودہ ہو چکی تھی!



خلافتِ ظاہری

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو اس وقت خلافت حاصل ہوئی جب قوم میں اتحاد تھا، قوت تھی، ابھرنے کا جذبہ تھا، زندگی اور جوش تھا، انقلاب اور مقصد کی چونپ تھی، عزائم بلند تھے، ہمت مضبوط تھی، حالات پر سکون تھے، فیض صحبت رسول ص سے اخلاق بلند تھا، نظم اعلیٰ تھا اور عوام میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک زندہ، جواں اور ابھرتی ہوئی قوم میں موجود ہوا کرتی ہیں۔ ایسے حالات میں قوم کی قیادت سنبھال لینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا ——— ان حالات میں قیادت کا امتحان بس اس چیز میں ہوتا ہے کہ قوم کی صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ ان صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں استعمال کر کے قوم کے معیار زندگی کو بلند اور اس کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی حیثیت کو برتر بنایا جائے، اور اس کی قوتوں کا زیادہ سے زیادہ استحکام کیا جائے تاکہ وہ غلط راہوں میں برباد نہ ہو جائیں، اس کی تنظیم جن اصولوں پر کی گئی ہے ان کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے، اس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھایا جائے اور اسے مادی، ذہنی اور روحانی ارتقا کی ان راہوں پر گامزن رکھا جائے جن پر چل کے وہ عروج کی منزلیں طے کر سکے ——— جب ہم اس زاویہ سے ان حضرات کی خلافت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی کے سوا اور کچھ دستیاب نہیں ہوتا، ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے چند ملک فتح کر لئے اور ان فتوحات کے نتیجہ میں ان کا برسر اقتدار طبقہ کافی مالدار ہو گیا لیکن علم الاقوام

کے ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ایک زندہ طاقتور اور ابھرتی ہوئی قوم کا چند ممالک فتح کر لینا نہ کوئی بڑا کارنامہ ہے اور نہ اس قوم کے قائدین کی اعلیٰ صلاحیت کا کوئی ثبوت، اس لئے کہ جب بھی کوئی قوم زندگی اور نظم کی قوتوں سے ہمکنار ہوتی ہے، تو وہ اپنا دائرہ اثر وسیع کرتی ہے، اسکے ارد گرد کی کمزور قومیں جو عیش پرستی یا بدنظمی کا شکار ہوتی ہیں اسکے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔ اور وہ ایک وسیع حصہ ارض کی مالک بن جاتی ہے۔ ہر ابھرتی ہوئی قوم کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے اور آتا رہتا ہے، رومن ابھرے تو یورپ اور شمالی افریقہ پر چھا گئے، ایرانی ابھرے تو مشرق قریب پر ان کا پرچم اقبال لہرانے لگا، انگریز ابھرے تو ان کی سلطنت میں آفتاب غروب ہونا بند ہو گیا، تاتاری ابھرے تو ساری معلومہ دنیا پر قابض ہو گئے، روسی ابھرے تو آدھی دنیا پر ان کا سکہ رواں ہو گیا، یہی دنیا کا دستور اور علم الاقوام کا کلیہ ہے اس لئے محض چند ممالک کی فتح کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی قیادت کی کامیابی قرار دینا عقیدت پسندی کا مظاہرہ تو کہا جا سکتا ہے، حقیقت پسندی یا علم تاریخ سے واقفیت کا مظاہرہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا، مسلمان ایک نئی اور ابھرتی ہوئی قوم تھے، اس لئے ان کی قیادت کسی کے ہاتھوں میں ہوتی، توسیع مملکت کا کام ضرور انجام پاتا، قوم اپنا دائرہ اثر ضرور وسیع کرتی، آس پاس کی قوموں پر غلبہ ضرور حاصل ہوتا، یہ کوئی خاص بات نہیں ہے اور اس پر قیادت کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنا بالکل غلط ہے!

ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ہٹلر کی قیادت میں جرمنوں نے پولینڈ، زیکوسلوواکیہ، یوگوسلاویہ، ہالینڈ، بلجیم، فرانس، آسٹریا، ہنگری بلغاریہ، رومانیہ، اور آدھے روس پر قبضہ کر لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا

ہٹلر کی قیادت کو محض اس بنیاد پر کامیاب کہا جا سکتا ہے ؟ اور کیا جرمن قوم کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری سے ہٹلر کو عہدہ برآ کیا جا سکتا ہے ؟

جنرل ٹوٹژو کی قیادت میں جاپانیوں نے مشرقی چین، فلپائن، انڈونیشیا ہندچینی، ملایا، سنگاپور اور برما تک پر قبضہ کر لیا، لیکن کیا اس تسخیرِ ممالک پر جنرل ٹوٹژو کو ایک کامیاب قائد کہا جا سکتا ہے ؟ اور کیا اس قیادت کا یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ بالآخر جاپان کو امریکہ کے سامنے محکومی کا سَر جھکا دینا پڑا ؟

یہ دو مثالیں ہی اس کا ثبوت ہیں کہ کسی قیادت کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ فتوحات پر نہیں کیا جاتا، اس کا فیصلہ نتائج کو دیکھ کر کیا جاتا ہے ؛

مسلمانوں کی نئی اور طاقت سے بھرپور قوم نے چند ممالک ضرور فتح کر لیے لیکن محض پچیس سال کے اندر ہی یہ قوم جسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نظم و اتحاد کا مرقع اور قوت و سطوت کی نشانی بنا دیا تھا، خانہ جنگی، بغاوت، بدامنی، جدالِ باہمی، جمود اور بزدلی کا شکار ہو گئی، اسے جن بلند و برتر اصولوں کی بنیاد پر متحد کیا گیا تھا وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اس کا جذبہ جہاد ختم ہو گیا، اس کی قوتیں بکھر گئیں، وہ ایک عضوِ مفلوج بن کر رہ گئی، اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں، وہ ایک گم کردہ راہ کارواں میں تبدیل ہو گئی، اس کا مقصدِ حیات فنا ہو گیا، وہ زمین پہ اللہ کی بادشاہت قائم کرنے کے بجائے خود اموی اقتدار کے سامنے سرنگوں ہو گئی، عادلانہ تقسیمِ دولت کی تبلیغ کے بجائے زر اندوزی کا شکار ہو گئی، اور اسلام کے اس عظیم نظامِ زندگی کو بھی فراموش کر بیٹھی جو اس کی زندگی کا مقصود

اور اس کی حیات ارضی کا نصب العین تھا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو قوم چھوڑی تھی وہ دلیر تھی، جفاکش تھی، صاحب عزم تھی، ہمت ور تھی، اور مرعوبیت یا شکست خوردگی کے احساس سے کوسوں دور تھی، لیکن صرف پچیس سال کے اندر وہ ایسی بدلی کہ مٹھی بھر مصریوں نے مدینہ میں غدر برپا کر دیا، اور مدینہ والے انتہائی بے بسی کا مظاہرہ کرتے رہے، بنی امیہ کے گورنر ملک میں لوٹ مچاتے رہے اور وہی مسلمان جو ابھی کل تک خلیفہ وقت تک کو ٹوک دینے کی جرأت رکھتے تھے ان بدترین افراد تک کے مقابلہ میں بے بس اور خاموش تھے، حرصِ دنیا ان پر اتنی غالب آچکی تھی کہ اب معاویہ ان کو ٹکوں میں خرید سکتے تھے، عزم و ہمت ان سے اس درجہ مفقود ہو چکا تھا کہ ابو موسیٰ اشعری کے سے بڑے لوگ "شمشیرِ آہن کے بجائے لکڑی کی تلوار" لگانے کو فضیلت دے رہے تھے؛ اور ان کے دل اس درجہ کمزور پڑ چکے تھے کہ میدان سے فرار اور جہاد سے گریز ان کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا، اب نہ تو قوم میں نظم تھا، نہ اتحاد تھا، نہ عالی ہمتی تھی، نہ افلاک پر کمند ڈالنے کا عزم تھا، نہ باطل سے پنجہ کشی کی امنگ تھی، نہ شیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے کی جرأت تھی، نہ مقاصد پر مر مٹنے کی تمنا تھی، نہ انقلاب اسلامی کو عالم گیر بنانے کی آرزو تھی، نہ اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے کا جذبہ تھا، نہ اپنے حقوق کے تحفظ کی قوت تھی، نہ حیات کا ولولہ تھا، نہ زندگی کا جوش تھا، نہ فداکاری کا ذوق تھا، نہ قربانیوں کی لگن تھی اور نہ اسلام کی اشاعت کا وہ شوق تھا جس نے ان کو بدر و احد کے میدانوں میں سرفروشی پر تیار کر دیا تھا ــــــ اس کے برعکس ان میں ایک لامتناہی جمود تھا، ایک عام احساس شکست خوردگی تھا، ایک نہ ختم ہونے والی تھکن تھی

ایک بے پناہ مایوسی اور افسردگی تھی، ایک پسپائی کی سی کیفیت تھی، ایک انتشار کا عالم تھا، وہ زندگی سے اتنے دُور ہو چکے تھے کہ ان میں اسلامی دنیا کی سیاست سے ایک خاص قسم کی بے تعلقی پیدا ہو چکی تھی اور قوم ان تمام اخلاقی اور روحانی اقدار سے محروم ہو چکی تھی جو ایک زندہ اور ابھرتی ہوئی قوم کی نشانی کہی جاتی ہیں، قوم کی قوتیں جنگ آزمائی اور کشور کشائی میں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس کی اعلیٰ اخلاقی صلاحیتیں مردہ ہو چکی تھیں، وہ احساسِ حریت سے اس درجہ محروم ہو چکی تھی کہ ہزاروں صحابہ کی نگاہوں کے سامنے ملوکیت و قیصریت کا آغاز ہوا، اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ اُسے روکا نہیں بلکہ خاموشی سے اسلام کے قیصر امیر معاویہ کی بیعت کر لی، اس کا دینی جذبہ آنا مٹ چکا تھا کہ یزید لعہ نے اس سے غلامی پر بیعت طلب کی اور اس نے یہ مطالبہ بے چون و چرا قبول کر لیا اس کا نظم اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ اس کا تیسرا خلیفہ قتل کر ڈالا گیا، اور وہ بے بسی سے تماشا دیکھتی رہی، وہ زر پرستی کی اتنی خوگر ہو چکی تھی کہ وہ چند پیسوں کی خاطر آلِ رسولؐ پر تبرا برداشت کرتی رہی، اس کا وہ سارا ولولہ اور وہ ساری گرمی ختم ہو چکی تھی جس کے بل پر اس نے قیصر کے سر سے تاج اور کسریٰ کے قدموں سے تخت چھین لیا تھا، اب ایک مُردہ اور بے حس قوم تھی —— اور یہ نتیجہ تھا پچیس سال کی اس قیادت کا جس پر عقیدت کے مارے مسلمان آج تک ناز کیا کرتے ہیں!

پچیس سال میں چند ممالک ضرور فتح ہو گئے لیکن سوال یہ ہے کہ ——

(۱) مسلمانوں میں حکمرانی اور انتظام کی کتنی صلاحیت پیدا ہوئی تھی؟

(۲) ان میں اس عظیم سلطنت کو باقی رکھنے کی کتنی قابلیت پیدا کی گئی؟

(۳) ان کی علمی اور ذہنی زندگی کا کیا حشر ہوا؟ ان کا تعلیمی معیار کس حد تک بلند کیا گیا؟

(۴) ان میں اسلامی دعوت کو عام کرنے کی صلاحیت کس حد تک بیدار کی گئی؟

(۵) عوام کی معاشی اور اخلاقی حیثیت کس حد تک بہتر بنائی جا سکی؟

(۶) وہ تمدن، تہذیب، علم اور حکمت میں معاصر اقوام سے کیوں پیچھے رہ گئے؟

(۷) ان کا وہ دینی ولولہ کیا ہوا جس نے ان میں پہاڑوں کا ثبات اور فولاد کی صلابت پیدا کی تھی۔ ان سوالات کے جواب پر ہی اس قیادت کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہو جاتا ہے؟

قوم کی حالت بہتر تھی تو ہر شخص قبول خلافت کا تمنائی تھا لیکن حالات بگڑے تو سارے مدعیان خلافت گھروں میں چھپ کے بیٹھ رہے، ان حالات میں وہی شخص آگے بڑھا جس میں ہر قسم کے حالات میں قوم کی قیادت کی صلاحیت موجود تھی، امیر المومنینؑ کی کامیابی کی اس سے روشن دلیل اور کیا ہو سکتی ہے، کہ آج قوم ان کے در دازے پر دستک دے رہی تھی، ان کو مدد کے لئے پکار رہی تھی، ان کا دامن تھام رہی تھی اور اس وقت جبکہ اس کے سارے سہارے ٹوٹ چکے تھے امیر المومنینؑ ہی کی ذات گرامی کو اپنا آخری آسرا قرار دے رہی تھی،

امیر المومنین علیہ السلام نے خلافت ظاہری قبول فرمائی تو آپ کے سامنے متعدد مسائل تھے —

(۱) مدینہ کے حالات کو اعتدال پر لانا، اور مصریوں کے غصہ کو ختم کرنا،

(۲) بنی امیہ کے ان احکام سے ملت اسلامیہ کو نجات دلانا جو اُمت کا خون چوس چوس کے اُسے تباہ کئے دے رہے تھے!

(۳) قوم کے داخلی انتشار کو ختم کرنا!

(۴) مسلمانوں میں دولت اور نسل کی بنیاد پر جو طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی تھی اسے ختم کر کے وحدت اسلامیہ کو بحال کرنا!

(۵) اسلامی دعوت انقلاب کی تعلیم کو عام کرنا تاکہ امت جو فتوحات اور زر اندوزی میں مبتلا ہو کر اس دعوت کو تقریباً فراموش کر چکی تھی دوبارہ اس کے اساسی تصوّرات سے آگاہ ہو جائے اور مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت ضرور ایسی پیدا ہو جائے جو ہمیشہ اسلام کی سچی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتی رہے،

امیر المومنینؑ نے خلافت سنبھالتے ہی مدینہ میں امن قائم کر دیا اور مصریوں کو تسکین دے کے شہری زندگی بحال کر دی، آپ کی سیاسی اور انتظامی قابلیت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا جس میں آپ نے زبردست کامیابی حاصل فرمائی،

آپ نے دوسرا کام یہ کیا کہ حضرت عثمان کے بہت سے ایسے افسران کو معزول کر دیا جو امت کے لئے وبال جان ثابت ہو رہے تھے؛ آپ پر یہ اعتراض شدت سے کیا جاتا ہے کہ آپ نے ان افسران کو معزول کر کے سیاسی غلطی کی لیکن یہ اعتراض کرنے والے خود اپنی سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور دراصل اسی اعتراض کو اندھا دھند دہراتے چلے جاتے ہیں۔ جو سیاسی اور انتظامی صلاحیتیں رکھنے والے عربوں نے آپ پر کیا تھا اگر وہ ایک ذرا سے تعقل و تفکر سے کام لیں تو

ان کو خود یہ محسوس ہو جائے گا کہ ان کا یہ اعتراض سرے سے مہمل ہے اور آپ کا اقدام انتہائی مصلحت اور سیاسی دُور اندیشی پر محمول تھا، اسلئے کہ

(۱) ان ظالم، لٹیرے اور نالائق حکام کی برطرفی کے نتیجہ میں مملکت میں سکون پیدا ہو گیا اور وہ شورش دب گئی جو حضرت عثمان کے عہد آخر میں پیدا ہو گئی تھی!

(۲) ان صوبہ داروں کی برطرفی کے نتیجہ میں حجاز، یمن، عراق، ایران اور مصر وغیرہ پر آپ کا تسلط ہو گیا ورنہ ان صوبوں میں بھی وہی ہوتا جو شام میں ہوا، اور حضرت عثمان کے رشتہ دار اموی حکام ان علاقوں میں بھی بغاوت کر دیتے اور اس کے نتیجہ میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا، آپ کے اس اقدام کے نتیجہ میں مملکت کی سالمیت قائم رہی ورنہ وہی ہوتا جو عباسیوں کے آخری دور میں صوبہ داروں نے کیا اور اس سے نہ صرف یہ کہ مملکت اسلامیہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی بلکہ مسلمانوں کی مرکزی حکومت تباہ ہو جانے کے نتیجہ میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ مفتوحہ علاقے پھر اپنے سابق ادیان پر پلٹ جاتے، اِس لئے کہ ان علاقوں میں اسلام کا جو کچھ اثر تھا، تلوار کی وجہ سے تھا، تبلیغ یا نشرِ علم کی بدولت نہیں تھا۔ اور ایسی حالت میں اس کا پورا امکان تھا کہ مرکز خلافت کمزور ہو جانے کے نتیجہ میں یہ علاقے اِسلام سے رُوگرداں ہو جاتے۔

(۳) شام میں اموی حکومت کے قیام اور مدینہ کی دینی مرکزیّت کمزور

ہوجانے کے نتیجہ میں دنیا نے یہ تماشہ دیکھا کہ اسلام میں درجنوں فرقے بن گئے، ہزاروں جھوٹی احادیث گڑھ لی گئیں، تفاسیر پر یونانی فلسفہ کا اثر غالب ہو گیا، روایات میں اسرائیلی خرافات داخل ہوگئیں، اور عقائد و احکام کی دنیا میں زلزلہ سا آگیا، اب ایک ذرا قیاس کیجئے کہ اگر ایران، یمن، مصر، عراق سب جگہوں پر مطلق العنان اموی حکومتیں بن جاتیں اور مدینہ کے اثرات کا بالکل خاتمہ ہو جاتا تو کیا نتیجہ ہوتا؟ اسلام کیا روپ اختیار کر لیتا، عقائد و احکام میں کیسی تبدیلیاں ہو جاتیں اور یہ خانہ جنگی مسلمانوں کو تو الگ رکھیئے، خود اسلام کو کس درجہ تباہ کر دیتی؟

(۴) امیر معاویہ یا طلحہ و زبیر کی سرکوبی کے دوران میں ان ناقابل اعتماد گورنروں کی موجودگی حد درجہ مہلک ثابت ہو سکتی تھی اس لئے کہ یہ لوگ معاویہ کی شہ پر اس دشمنی کے نتیجہ میں جو بنی امیہ کے دلوں میں اسلام کے خلاف موجود تھی اسلامی فوجوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے، امیر المومنینؑ کی رسد اور کمک کاٹ دیتے، یا جگہ جگہ بغاوتیں کر کے مسلمانوں کی قوت اتنی منتشر کر دیتے کہ شامی فوجیں کامیاب ہو جاتیں اور شامی عیسائی دنیا سے اسلام کا خاتمہ کر دیتے۔

(۵) دنیا کا کوئی عقلمند حکمران صوبوں پر ایسے حکمرانوں کو قائم نہیں رکھتا جو اسکے مخالف یا دشمن ہوں، ایسا کرنا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی چلانے کے مترادف ہوتا ہے۔

(۶) اگر آپ ان اموی افسروں کو برطرف نہ کرتے تو مفتوحہ علاقوں کے عوام لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے کہ اسلام کا مقصد غیر عرب علاقوں کو لوٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اس طرح انکے دلوں میں اسلام کے خلاف بیزاری پیدا ہو جاتی۔

(۷) اموی حکام کی موجودگی میں آپ وہ علمی، اخلاقی، اور روحانی اصلاحات عمل میں نہیں لا سکتے تھے جو آپکا مقصود اصلی تھیں، بنی امیہ کی جہالت دنیا داری، دین سے بیزاری، اور اخلاقی دنائت دنیا کو معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذریعہ کسی روحانی یا علمی تحریک کو پروان چڑھانا قطعاً ناممکن تھا، اس لیئے ان کی برطرفی ایک اصولی حکومت کے لئے حد درجہ ضروری تھی۔

ایسی حالت میں آپ نے وہی کیا جو ایک ہوشمند مدبر کو کرنا چاہیئے اور آپ کے اس اقدام پر وہی لوگ اعتراض کر سکتے ہیں جو یا تو خود سیاسی اعتبار سے دیوالیہ ہیں یا پھر محض مخالفت برائے مخالفت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آپ کے سامنے تیسرا اہم سوال اس داخلی انتشار کو دور کرنے کا تھا جو دنیائے اسلام میں پیدا ہو چکا تھا، مدینہ پر مصریوں کی یلغار دراصل اسی اندرونی خلفشار کا ایک مظہر تھی، مسلمانوں کا نظم و اتحاد برباد ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بغاوت اور سرکشی کے جذبات نے لے لی تھی۔ مصر اور بصرہ کے لوگوں کا مدینہ پر چڑھ آنا اسی ذہنیت کا مظہر تھا۔ خلیفہ ثالث کی کمزوری اور مسلمانوں کے اخلاق کا زوال اس داخلی انتشار کے سب سے بڑے اسباب تھے، چنانچہ یہ خلیفہ ثالث کے دور میں پروان چڑھ چکا تھا امیر المومنینؑ

کے دور میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ اور جمل و نہروان اسی کے دو مختلف مناظر تھے۔ یہ دونوں بغاوتیں مسلمانوں کا نظم ختم ہو جانے کا پتہ دے رہی تھیں، امیرالمومنینؑ نے ایک کامیاب مدبر اور ایک دُور بین قائد کی حیثیت سے یہ ضروری تصور کیا کہ اس داخلی فتنہ کو اتنی سختی سے کچل دیا جائے کہ انتشار پیدا کرنے والی طاقتوں کی کمر ٹوٹ جائے، اور مُلک میں امن و امان قائم ہو جائے۔ چنانچہ جمل اور نہروان کے میدانوں میں جو کچھ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے۔ باغیوں کی پوری طرح سرکوبی کر دی گئی اور عربوں پر یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ وہ شخص جو مسلمانوں پر باپ سے زیادہ رحیم ہے فتنہ پردازوں اور خلافت اسلامی کو داخلی انتشار کا شکار بنانے والوں کے مقابلہ میں فولاد سے زیادہ سخت بن جانے کی قوت رکھتا ہے۔ اور اس کی حکومت کسی داخلی فتنہ کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں امن قائم ہو گیا۔ اور پھر آپ کے دور سلطنت میں کسی کو بغاوت کی جرأت نہیں ہو سکی —— یہاں ہم نے امیر معاویہ کے خلاف جنگ کا ذکر دانستہ طور پر نہیں کیا ہے اس لئے کہ یہ جنگ "داخلی خطرہ" سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ یہ دراصل ایک "بیرونی حملہ آور" کے خلاف جنگ تھی۔ اس لئے کہ میدان صفین میں امیرالمومنینؑ مسلمانوں سے نہیں لڑ رہے تھے، شامی عیسائیوں اور ان بنی امیہ سے لڑ رہے تھے جنہوں نے کبھی دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ امیر معاویہ کے نام اپنے تاریخی مکاتیب میں آپ نے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں فرما دی ہے کہ آپ امیر شام کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ایسی حالت میں شامیوں کے خلاف آپکی جنگ دراصل ایک بیرونی دشمن کے خلاف جنگ تھی اور اُسے اندرونی خلفشار

میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک داخلی نظم و ضبط مملکت کا تعلق تھا اسمیں آپ بالکل کامیاب ہوئے اور قریش و خوارج کے فتنوں کا آپ نے سدباب کر دیا۔

مسلمانوں میں دولت اور نسب کی بنیادوں پر مختلف طبقات وجود میں آ گئے تھے اور اسلامی مساوات چاہے مسجد کے اندر باقی رہی ہو لیکن روزمرہ کی عملی زندگی میں ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو امیر اور غریب، عرب اور عجم، قریشی اور غیر قریشی میں تقسیم کر دیا تھا۔ امیر المومنینؓ نے نسل و نسب اور دولت کے ان بتوں کو پاش پاش کر ڈالا۔ آپ نے قریش اور اکابر ملت کی شدید مخالفت کے باوجود تقسیم بالسویہ کا دستور جاری فرمایا۔ اور اس طرح معاشی مساوات کے اس نظریہ کو جسے آج ساری دنیا اپنانا چاہتی ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے اپنی پوری مملکت میں نافذ فرما دیا۔ آپ نے عربی و عجمی امتیازات کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس طرح مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں حقیقی مساوات قائم فرما دی۔

معاشی اور معاشرتی مساوات کا قیام اس دور میں کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کو اشراف قریش سے زبردست ٹکر لینا پڑی لیکن ایک عظیم اصلاح کی خاطر آپ نے کسی مخالفت کی پروا نہیں کی اور اپنے اصلاحی مقاصد کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ آپ کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کا ایک بے نظیر مظاہرہ تھا اس لئے کہ ایک ایسی قوم جو امتیازات کی عادی ہو چکی تھی، اپنا نظم و ضبط کھو چکی تھی اور جس میں رجعت پسند عناصر زبردست اثرات کے مالک تھے، اتنی بڑی اصلاح کو وجود میں لے آنا (جو آج کی ترقی یافتہ حکومتوں کے لئے بھی ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے!) انتہائی مشکل کام تھا۔ آپ نے

اس باب میں قیادت کی ایسی بلند پایہ صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمایا جنہیں معجزہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ سماجی اور معاشی اصلاحات کے میدان میں آپ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اسکی مثال آجتک دنیا پیش کرنے سے قاصر رہی ہے:

امیرالمومنینؑ کی ان عظیم اصلاحات کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم ان حالات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن سے آپ کا سابقہ تھا ساڑھے چار سال کی مختصر سی مدت حکومت، اور پھر اس میں بھی متواتر لڑائیاں پر آشوب حالات، قریش کے باغیانہ تیور، شامیوں کی یورش، خوارج کی جنگ آزمائی، زر پرستی کا زور، جہل اور دنیا داری، غرض حالات ایسے تھے جن میں کسی اصلاحی اقدام کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن یہ تھا کمال قیادت کہ آپ نے ان حالات میں بھی وہ کر دکھایا جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی حکمرانوں سے ممکن نہیں ہو رہا ہے۔ سماجی اور معاشی مساوات کی باتیں تو دنیا میں بہت ہوتی ہیں لیکن آج تک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ لیکن امیرالمومنینؑ نے بغاوتوں اور ہنگاموں کے دور میں بھی اس خواب کو حقیقت بنا دیا تھا جو آپکی قائدانہ صلاحیتوں کا اعجاز آفرین نمونہ ہے۔

خلافت حاصل ہوتے ہی آپ نے مدینہ میں امن قائم کر دیا اور بلوائی منتشر ہو گئے۔ مدینہ والوں کو سکون میسر ہوا تو قریش کے مفاد پسند قائدین کی جان میں جان آئی، گمشدہ حواس درست ہوئے، اب جو انہوں نے دیکھا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ خلافت اس شخص کے ہاتھوں میں تھی جو ان کے قبائلی مفادات کا علمبردار نہیں تھا جس کی حکومت ان کی زر اندوزی کی مہم میں معاون نہیں ہو سکتی تھی۔ جو ان کو بغیر عمل فضائل و مناقب کا مستحق ماننے پر تیار نہیں تھا۔

جو ان کی شان میں گڑھی ہوئی احادیث پر ایمان لا کے ان کے عوام کی دولت سے کھیلنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا، جو ان کو نسب کی بنیاد پر مستحق حکومت تسلیم نہیں کرتا تھا۔ جو محض خاندان کی بنا پر ان کی اشرافیت یا امارت یا ارستقراطیت کا قائل نہیں تھا، جو ان کو عجمیوں اور موالیوں سے برتر قرار دینے پر تیار نہیں تھا، بلکہ سب مسلمانوں کو مساوی حقوق عطا کرنے پر مصر تھا جو ان کی زر اندوزی، شان و شوکت، محلات کی تعمیر اور نمائش دولت کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور یہ چاہتا تھا کہ دولت کے معاملہ میں سارے مسلمان برابر ہو جائیں، جو صرف قریش کو صوبوں کی گورنری اور جاگیروں کا مستحق ماننے پر تیار نہیں تھا۔ اور جس کی حکومت باقی رہنے کے معنی یہ تھے کہ قریش نے ابتدائی تین حکمرانوں کے دور میں جو کچھ حاصل کیا تھا، عوام کو افلاس اور جہل میں مبتلا کر کے جو کچھ پایا تھا وہ سب ختم ہو جائے، ظاہر ہے کہ یہ صورت حال قریش کے لئے ناقابل برداشت تھی، ان کے لئے یہ تصور بھی موجب تکلیف تھا کہ اب عجم اور موالی بھی ان کے ہم پلہ قرار دیئے جائیں گے۔ یہ ان کے نسبی غرور کے منافی تھا۔ پھر انکے تاجرانہ مفادات کے لئے حد درجہ خطرہ پیدا ہو گیا اس لئے انہوں نے یہ چاہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنا اقتدار بازیاب کیا جائے، اپنی لٹی ہوئی مسند قیادت دوبارہ بچھائی جائے اور وہ حکومت قائم کیجائے جو ان کے نسبی اور تاجرانہ مفادات کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکے، بد قسمتی سے ان کو اپنی اس تحریک بازیابی اقتدار کی حمایت و سرپرستی کے لئے حضرت عائشہؓ مل گئیں جو ایک شدید عذباتی خاتون تھیں اور حضرت علیؑ سے اس لئے دشمنی رکھتی تھیں کہ۔

(۱) آپ حضرت خدیجہ کے داماد تھے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ کی تعریفیں کیا کرتے تھے اس لئے حضرت عائشہ نے خود اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ آپ کو ان سے سخت جلن ہو گئی تھی۔

(۲) آپ رسول اللہ کو حد درجہ محبوب تھے۔ اور یہ چیز حضرت عائشہ کو حد درجہ ناگوار تھی اس لئے کہ موصوفہ یہ چاہتی تھیں کہ آپ ہی رسول اللہ کی تمام تر توجہات کا مرکز رہیں۔ چونکہ آپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ سے محبت فرماتے رہے اس لئے آپ کو حضرت علیؑ سے شدید دشمنی ہو گئی تھی۔

(۳) حضرت عائشہ یہ بھی جانتی تھیں کہ حضرت علیؑ کی حکومت میں آپکو بارہ ہزار درہم کا وہ گرانقدر وظیفہ حاصل ہونا ناممکن ہے جو حضرت عمر نے آپ کے لئے مقرر کر دیا تھا۔

(۴) حضرت عائشہ میں اقتدار پسندی کا جذبہ بے حد تھا اور دوسرے خلفاء کے زمانہ میں آپ کی جس انداز سے نازبرداری ہوتی رہی تھی اس نے اس میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ نمود اور برتری کے جذبات بھی آپ میں کافی پائے جاتے تھے۔ چنانچہ نمود کے جذبہ کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ کتب احادیث میں جتنی احادیث آپ سے مروی ہیں دوسری امہات المومنین تو رہیں الگ، کسی صحابی سے بھی مروی نہیں ہیں۔ امیر المومنینؑ کی حکومت میں آپ کے اس جذبۂ نمود کے اظہار کا کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ آپ

لازماً موصوفہ پر یہ اصرار فرماتے کہ وہ حرم رسولؐ کی حیثیت سے خاموشی کی زندگی بسر فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی آپکی ہیجان فطرت پر ایک بار بنتی اور اسکی وجہ سے بھی آپ حضرت علیؑ کی مخالفت پر مجبور تھیں۔

(۵) آپ میں بدقسمتی سے ہنگامہ پروری کا مادہ بھی کافی تھا، جس کا مظاہرہ حیات رسولؐ میں بھی کافی ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان کے خلاف "اقتلوا نعثلاً" کے نعرے آپ کی اس فطرت کا صاف پتہ دیتے ہیں۔

سرداران قریش نے آپ کی فطرت کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے آپکو "قریش کی قیادت" پیش کر دی۔ ایک اقتدار پسند جذباتی عورت کو اتنا بڑا "رتبہ" حاصل ہو رہا ہو تو وہ کیا کچھ نہ کر ڈالے گی؟ چنانچہ آپ بھی اپنی اس جذباتی کمزوری کا شکار ہو گئیں اور اللہ رسولؐ اور قرآن کے فرمان کو بھول کے قریش کے لشکر کی سردار بن گئیں!

قریش کی بزدلی، دنائت، موقع پرستی، اور تاجرانہ ذہنیت کا اس سے بدتر مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عشرہ مبشرہ کے محترم ارکان نے محض اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف یہ کہ حرم محترم رسولؐ کو میدان جنگ میں کھڑا کر دیا بلکہ عرب کے سورماؤں نے ایک عورت کی قیادت قبول کر لی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) سرداران قریش یعنی طلحہ اور زبیر وغیرہ کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ عوام ان کا ساتھ نہیں دیں گے اس لئے وہ حرم رسولؐ کے نام پر عوام کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔

(۲) یہ لوگ اپنی مطلب برآری کے لئے اتنی نیچی سطح تک اُتر سکتے تھے کہ حرم رسولؐ کا احترام بھی خاک میں ملا دیں۔

(۳) ان میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ خود امیرالمومنینؑ کے مقابلہ میں کھڑے ہوں اس لئے انہوں نے حرم رسولؐ کو اپنی بزدلی کا پردہ قرار دیا تھا۔

(۴) یہ لوگ محض حصول خلافت کے لئے حرم رسولؐ کی عزت تک بیچنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور اپنے نفع کے لئے پیغمبر اسلامؐ کی حرمت تک سے کھیلنے کی جسارت کر سکتے تھے!

قریش کے رو بہ انحطاط اقتدار کو بازیاب کرنے اور مہاجرین کے ہاتھوں میں اختیارات حکومت مرکوز رکھنے کی یہ آخری کوشش تھی جو کی گئی لیکن جمل کے میدان میں یہ کوشش ناکام بنادی گئی، طلحہ اور زبیر مارے گئے۔ اور اس طرح مہاجرین قریش کی قوت اور ان کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا!

قریشی قیادت کی ناکامی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ محض پچیس سال کے اندر قریش کا مفاد پسند طبقہ اس حکومت اور اقتدار سے محروم ہوگیا جو اسے سقیفہ بنی ساعدہ کے سازشی ماحول نے عطا کر دیا تھا۔ اور وہ مذہبی اثرات بھی جو صحابیت، مہاجرت، قرشیت، اور وضعی احادیث نے اسے عطا کر دیئے تھے۔ اس کے گرتے ہوئے اقتدار کو بحال نہ کر سکے۔ قریش کا یہ زوال دراصل نتیجہ تھا ان کے قائدین کی بے بصیرتی اور عدم تدبر کا۔ اور مذہبی عقیدت چاہے ان بزرگوں کی مدح میں کتنے ہی افسانے تراش دے لیکن اس تلخ اور بھیانک حقیقت سے

انکار محال ہے کہ جس حکومت کو مذہب، فتوحات، دولت، نسب، غرض ہر قسم کے اثرات حاصل تھے وہ ایک مختصر سی مدت میں ختم ہو گئی۔ اس زوال کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ قریش کے حکمران طبقہ پر ہے۔ ان حضرات پر ہے جن کو قریش نے زمام حکومت تفویض کی تھی، اور چاہے یہ بات عقیدت کی رو میں بہنے والوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ محسوس ہو لیکن یہ حقیقت بہر حال حقیقت رہے گی کہ قریش کے فرمانروا سیاسی اعتبار سے اتنے کوتہ بین، اتنے تنگ نظر، اتنے ناتجربہ کار اور اتنے خامکار ثابت ہوئے کہ وہ اس حکومت کو بڑی آسانی سے اور بہت کم مدت میں کھو بیٹھے جسے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے احکام رسالتؐ کو اور جسے بازیاب کرنے کی آخری کوشش میں انہوں نے احترام حرم رسالتؐ کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا!

قریش کے مفاد پسند طبقہ کا سب سے بڑا ہ کارنامہ،، یہ تھا کہ اس نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو سقیفہ بنی ساعدہ کی سازش کے نتیجہ میں ایوان حکومت سے دور کر دیا لیکن اس کشمکش کا جو سقیفہ میں شروع ہوئی تھی خاتمہ اس طور پر ہوا کہ بالآخر حکومت امیر المومنینؑ کے ہاتھوں میں آ گر رہی اور جمل کے میدان میں خود ان علیؑ کے ہاتھوں قریش کے مفاد پسند گروہ کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا جن سے حکومت چھین لینے پر یہ طبقہ نازاں و مفتخر تھا۔

جمل کے میدان میں امیر المومنینؑ کی فتح محض طلحہ و زبیر کے مقابلہ میں نہیں تھی بلکہ دراصل یہ فتح تھی مفاد پسندوں کی اس ساری ٹولی کے مقابلے میں جس نے آپ کو حکومت اسلامی سے دور رکھنے کی سازش کر رکھی تھی، جمل کے میدان میں آپ نے قریشی اکابر کے اس گروہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک

دی۔ اور اسے ایسی شکست فاش دی کہ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ اور آئندہ بھی اس کے ابھرنے یا اسلامی سیاست پر حاوی ہونے کا امکان ختم ہوگیا۔

جنگ جمل اس اعتبار سے امیرالمومنینؑ کی زندگی کا ایک انتہائی فیصلہ کن معرکہ کہی جا سکتی ہے۔ اور ان لوگوں کا ایک مسکت جواب ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ کے پیدا کیے ہوئے حالات کے نتیجہ میں اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ امیرالمومنینؑ کو مفاد پسند قریشیوں کے مقابلہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔۔۔ واقعہ یوں ہے کہ سقیفہ میں جو "جنگ" چھڑی تھی وہ اسی دن ختم نہیں ہو گئی تھی یہ "جنگ" برسوں جاری رہی۔ متعدد "مورچے" قائم ہوتے رہے اور ان میں امیرالمومنینؑ نے حکمت ربانی کے امین کی حیثیت سے ہر موقع پر اپنے مخالفین کو شکست دی۔ یہ ضرور ہے کہ آپ نے سقیفہ کے فیصلہ کے وقت قریش کے مقابلہ میں تلوار بے نیام نہیں کی لیکن صاحب عقل اس حقیقت کو جانتا ہے کہ دانشمند جرنیل موقع محل دیکھ کے تلوار کھینچتے ہیں۔ بے موقع نمائش شمشیر نہیں کیا کرتے۔ سقیفہ کے فیصلہ کے وقت تلوار کھینچنے کا مقصد ہوتا۔ اسلام کو ختم کر دینا، اس وقت قریش کو شکست نہیں ہوتی، اسلام کو شکست ہوتی اور امیرالمومنینؑ کا مقصد اسلام کو شکست دینا نہیں تھا مفاد پسندوں اور جاہ طلبوں کو شکست دینا تھا ۔۔۔۔ ایسی حالت میں آپ اس وقت چپ رہے ؛ اسلام مستحکم ہوگیا۔ غیر ممالک تک اسلام کی روشنی پھیل گئی۔ دین کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ تو شمشیر حیدری اسی شان سے قریش کے مفاد پسندوں کے مقابلہ میں چمکی جس آب و تاب سے کفار قریش کے مقابلہ میں چمک چکی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مخصوص شخصیتیں سامنے نہیں تھیں لیکن

سوال شخصیتوں کا تھا ہی نہیں، مقابلہ جو کچھ تھا وہ ایک مخصوص طبقہ ایک مخصوص مفاد کے لوگوں سے تھا۔ وہ طبقہ آج بھی موجود تھا ـــــــ اور شاید سقیفہ کے مقابلہ میں زیادہ طاقت کے ساتھ موجود تھا۔ اس لئے کہ اب اسے فتوحات کی شوکت بھی حاصل تھی، سیم وزر کی قوتیں بھی نصیب تھیں۔ ماضی کا جاہ و جلال بھی اس کی پشت پر تھا، عساکر کی منظم طاقت بھی موجود تھی، احترام رسول کا وقار بھی ساتھ تھا ـــــــ اور اس کے مقابلہ میں علی ظاہری طور پہ زیادہ کمزور بھی ہو چکے تھے۔ رسولؐ کے انتقال کو عرصہ ہو چکا تھا۔ اس لئے امیرالمومنینؑ کو رسول اللہ کے فرمودات سے جو مدد سقیفہ کے وقت مل سکتی تھی اُس کا آج امکان نہیں تھا۔ ان کے فضائل پر پردے ڈالے جا چکے تھے۔ ان کو گمنامی کے اندھیرے میں پھینکنے کی تمام تدابیر بھی عمل میں لائی جا چکی تھیں اور سیاسی حیثیت سے ان کو ختم کر دینے کے جتنے حربے ممکن تھے وہ سب استعمال ہو چکے تھے۔ لیکن یہ امیرالمومنینؑ کے تدبر اور قیادت کا کمال تھا کہ آپ نے جنگ اور فیصلہ کن معرکہ کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب حریف کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور قریش ایسے ہارے کہ ان کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔!

جو لوگ سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر امیرالمومنینؑ کی خاموشی پہ نام دھرتے ہیں۔ ان کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ۱۱ھ کی خاموشی نے ۳۵ھ میں کیا رنگ دکھایا، اور کس طرح امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں قریش کی اس جماعت کا خاتمہ ہو گیا جو ۱۱ھ میں کوس لِمَنِ الْمُلْک بجاتی نظر آ رہی تھی، اگر امیر المومنینؑ سقیفہ کا فیصلہ سامنے آتے ہی اس گروہ کے مقابلہ میں شمشیر بکف ہو جاتے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کا خاتمہ ہو جاتا بلکہ آپ اور آل رسولؐ کے

سارے افراد قتل ہو جاتے، ظاہر ہے کہ ایک عقلمند جرنیل ایسے وقت میں نہیں لڑتا جب اس کی شکست یقینی ہو۔ اسے جنگ نہیں کہا جاتا، خودکشی کہا جاتا ہے، اور امیرالمومنینؑ ایک عقلمند جرنیل کی حیثیت سے خودکشی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے ایسی حالت میں یہی مناسب جانا کہ صحیح وقت کا انتظار کیا جائے، جمل کے میدان میں یہ وقت آگیا، لڑائی ۱۱ھ سے ابتک جاری رہی تھی، یہ اور بات ہے کہ یہ " سرد جنگ " تھی، تیغ وتفنگ کی جنگ نہیں تھی، ۳۵ھ میں موقع ملتے ہی تلوار کی جنگ بھی لڑ لی گئی، اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ دُنیا کے سامنے ہے!

قریش کا مقصد تھا علیؑ کو خلافت ظاہری سے دُور رکھ کے حکومت پر اقتدار قائم رکھنا ——— دُنیا نے نتیجہ اس کے برعکس دیکھا حکومت علیؑ کو مل کر رہی اور سلطنت اسلامی مدینہ کے قریش اکابرین کے ہاتھوں سے ہمیشہ کیلئے نکل گئی ——— ایسی حالت میں قریش ہارے اور علیؑ جیتے، سرد جنگ میں علیؑ اس طرح کے ہزاروں جوڑ توڑ کے باوجود خلافت حاصل کر کے رہے اور شمشیر وتبر کی جنگ میں اس طرح جیتے کہ قریش کے دوبارہ اُبھرنے کا امکان ہی ختم ہو گیا ——— اس سے زیادہ شاندار فتح اور کیا ہو سکتی ہے؟

جنگ جمل دراصل اس جنگ کا نقطہ عروج کہی جا سکتی ہے جو رسولؐ اللہ کے دنیا سے پردہ کرتے ہی اکابر قریش اور امیرالمومنینؑ کے درمیان چھڑ گئی تھی اور اس آخری فیصلہ کن جنگ میں فتح کا سہرہ امیرالمومنینؑ کے سر رہا اور کیوں نہ ہو ——— اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا کا تاج مامور من اللہ قائدین کے سروں پر جگمگانے کے لیئے ہی قدرت نے تیار

کیا ہے اور علیؓ چونکہ مامور من اللہ قائد تھے اس لئے یہ فتح مبین ان کو حاصل ہونا ہی چاہئے تھی، یہ ان کا قرآنی حق تھی، اور اللہ کا مقرر کیا ہوا حق مل کے رہتا ہے۔

جنگِ جمل میں قریش کے مفاد پرست طبقہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسلام کو ایک اور داخلی فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، اور وہ تھا "فرقہ خوارج کا ظہور"۔

بظاہر تو خوارج کا ظہور ایک وقتی سوال کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ پچیس[۲۵] سال میں حکمران طبقہ نے جو روش اختیار کی تھی اس کے نتیجہ میں مسلم عوام میں جہالت عام ہو گئی تھی، ان میں فہم قرآن کا صحیح شعور باقی نہیں رہا تھا، ان کو کتاب الٰہی کی تعلیم دینے والوں سے دور رکھا گیا تھا اور ان میں وہ "دینی طوائف الملوکی" یا مذہبی انتشار پیدا کر دیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں ہر جاہل اپنے آپ کو مفسر قرآن اور شارح دین تصور کرنے لگا تھا، انکے دماغوں سے یہ احساس گم کر دیا گیا تھا کہ قرآن کی تفسیر و تشریح صرف ان لوگوں کا حق ہے جن کو قدرت نے وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا لقب عطا کر کے خاص اسی امر کے لئے مامور فرمایا ہے۔ ان کو یہ یقین پیدا کرا دیا گیا تھا کہ قرآن اور دین کے مفاہیم صرف آلِ رسولؐ یا صحابہ متقین سے معلوم کرنے کا خیال بے سود ہے۔ اور ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ ہر کس و ناکس کو قرآن، دین اور شریعت کے باب میں ہر فیصلہ کرنے کا حق خاص ہے، یہ تدبیر محض اسی لئے اختیار کی گئی تھی کہ لوگ آلِ رسولؐ کو بھول جائیں، قرآن و شریعت کی تعلیم کیلئے

ان مامورین من اللہ کی جانب رُخ کرنا چھوڑ دیں اور آلِ رسولؐ اتنی گمنام ہو جائے کہ پھر حکومت وقت کو اس سے کوئی خطرہ باقی نہ رہے، خود حکامِ وقت کا عالم یہ تھا کہ وہ دین اور قرآن کی تشریح و تفسیر کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اور مختلف واقعات اس کے شاہد ہیں کہ وہ خالص علمی مسائل کے باب میں بالکل کورے ثابت ہوئے تھے۔ اسلئے انکے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دینی اور قرآنی مسائل میں اپنی ذات کو مسلمانوں کی توجہ کا مرکز قرار دیتے اور خلیفہ وقت کی ذات کو تفسیر و تشریح قرآن کا مرکز قرار دے سکتے دینی مسائل میں مرکزیت باقی رکھتے۔ ایسی حالت میں انہوں نے یہ رخ اختیار کیا کہ سیاسی مسائل اور حقوقِ حکمرانی تو خلیفہ کی ذات میں مرکوز رہیں اور دینی مسائل میں مسلمان "آزاد" چھوڑ دیئے جائیں، ہر مسلمان کو دین اور قرآن کے معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی عقل یا پسند کے مطابق آیاتِ قرآنی کی تفسیر کرنے کا حق دیدیا جائے اور اس کا بہانہ اس امر میں تلاش کر لیا گیا تھا کہ سارے مسلمان صحابی ہیں۔ اور چونکہ ہر صحابی کا عادل اور مجتہد ہونا ضروری ہے اس لئے صحابہ دین یا قرآن کے باب میں جو فیصلہ کریں وہ حق ہو گا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منصب خلافت کے ذریعہ تعلیم دین کے سلسلہ میں جو مرکزیت قائم کرنا مقصودِ شارع تھا اس کا خاتمہ ہو گیا اور مذہبی مسائل میں مطلق العنانی کا رواج عام ہو گیا ——— یہ توضیح ہے کہ اس تدبیر کے نتیجہ میں آلِ رسولؐ کے مامور من اللہ اور معصوم معلمین قرآن سے حصول دین کا دروازہ بڑی حد تک بند ہو گیا اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم آلِ رسولؐ سے بیگانہ ہو گیا لیکن وہ تدبیر جو محض ایک سیاسی غرض سے اختیار کی گئی تھی اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ۔

(۱) دین اور قرآن کے باب میں، ہر کس وناکس کو اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی عقل یا پسند کے مطابق دین اور قرآن کے مفاہیم متعین کرنے کا حق حاصل ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ فرقہ بندیوں کی شکل میں برآمد ہوا۔ جس نے جو چاہا اسلام کا ایک نیا مفہوم متعین کر دیا، جو دل میں آئی وہ قرآن کی تفسیر کر دی، اور اسی کے نتیجہ میں مسلمان سیکڑوں فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

(۲) مذہب کے باب میں کسی مرکز کی ضرورت کا احساس ختم ہو گیا۔

(۳) خلافت صرف بادشاہت رہ گئی جس کا مذہب سے بس اتنا تعلق رہ گیا کہ سلطان وقت مذہب کے نام سے فائدہ اٹھا کے عوام پر اپنی حکومت قائم رکھے اور دین کے نام سے ان کی گردنوں پر اپنی غلامی کا جوا لادے رہے۔

(۴) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سلاطین کا کھلونا اور شخصی حکومت کا آلہ کار بن کے رہ گیا۔ چنانچہ جب عوام میں احساس حریت ابھرا تو انہوں نے جہاں خلافت کا خاتمہ کر دیا وہیں مذہب کو سلطنت اور سیاست ملکی سے بیدخل کر دیا اس لئے کہ ان کا تجربہ اس کا شاہد تھا کہ مذہب صرف چند افراد کی حکومت باقی رکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے اور اس طرح عوام کی آزادی کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ ہوا کرتا ہے۔

بہرحال قرآن کے باب میں عوام میں جو مطلق العنانی پیدا کر دی گئی تھی اسی کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ وہ تھا جو خوارج کے ظہور کی شکل میں برآمد ہوا۔ اور ایک حکم قرآنی کی توجیہ وتشریح کے نام پر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ گمراہی وضلالت کا شکار ہو گیا۔ خوارج کو اس پر اصرار تھا

کہ لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ کی جو تشریح و تفسیر وہ کر رہے ہیں اُسے تسلیم کر لیا جائے اور چاہے ان کی بیان کردہ تفسیر کتنی ہی مہمل کیوں نہ ہو مگر خلیفۂ وقت اس کے سامنے سر جھکا دے اس لئے کہ قرآن کی تفسیر بالرائے ہر مسلمان کا پیدائشی حق ہے اور خلیفۂ وقت چونکہ صرف ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی رائے کی جو مسلمان قرآن کے باب میں ظاہر کر رہے ہوں مخالفت کرے، خوارج نے یہ نظریہ دراصل اس دینی انتشار اور لامرکزیت کے نتیجہ میں قائم کیا تھا جو ابتدائی تین خلافتوں میں پیدا کر دی گئی تھی اور جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ امیرالمومنینؑ کے دور میں کچھ مسلمانوں نے گمراہی کی راہ اختیار کی بلکہ یہ فتنہ آج تک باقی ہے، اور تاریخ میں ہمیشہ باقی رہا ہے، جس شخص کا جو جی چاہتا ہے وہ قرآن کا مفہوم قرار دیدیتا ہے اور پھر چند مقلد پیدا کر کے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ پیدا کر دیتا ہے۔ خوارج کا ظہور ہو یا بعد کی فرقہ بندیاں، سب دراصل اسلام کا وہ مرکز علمی و روحانی برابر ہو جانے کا نتیجہ ہیں جسے سقیفہ کی محفل میں ختم کیا گیا تھا، اگر خلافت کو شریعت کا مرکز باقی رکھا جاتا، اگر قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر صرف مامور من اللہ خلیفہ تک محدود رکھی جاتی، اور اگر اس مرکز روحانی کو برابر نہ کیا جاتا تو اسلام مختلف فرقوں میں تقسیم نہ ہوتا، لیکن برا ہو حرص سلطنت اور جذبہ حکومت کا، کہ محض چند روزہ بادشاہت کی خاطر شریعت کی مرکزیت ختم کر دی گئی۔ اور ایک ایسا فتنہ کھڑا کر دیا گیا جس کا خمیازہ مسلمانوں کو آجتک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

امیرالمومنینؑ کو نہروان کے میدان میں خوارج سے جو جنگ کرنا

پڑی وہ ایک بڑی اصولی جنگ تھی، اس جنگ کا مقصد محض اتنا ہی نہیں تھا کہ ایک داخلی فتنہ کی سرکوبی کر دی جائے بلکہ یہ جنگ در اصل اس اصول کے خلاف تھی کہ ہر کس و ناکس کو قرآن کا مفہوم متعین کرنے اور محض اپنی رائے سے دین کے اصول مقرر کرنے کا حق ہے، امیر المومنین کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلام اور قرآن کی حقیقی تفسیر و تشریح کا حق صرف امام زمانہ کو ہے، اور دین کی وحدت اور ملت کا نظم صرف اسی طرح برقرار رہ سکتا ہے کہ احکام مذہبیہ کی تعلیم اور تشریح ایک مرکزی نظام کے تابع ہو، ہر شخص کو مذہب کے بارے میں اپنی رائے نافذ کرنے اور اس طرح ملت کو فرقہ بندیوں کا شکار کر دینے کا حق نہ ہو ——— اور آپ کے مخالفین اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ابتدائی تین حکمرانوں کی روش قائم رکھی جائے، دین کے بارے میں مکمل مطلق العنانی کا رواج باقی رکھا جائے اور تفسیر بالرائے کی بدعت کو ایک دینی حقیقت تسلیم کر لیا جائے، دوسرے الفاظ میں خوارج وہ لوگ تھے جو "سیرت شیخین" کے قیام پر مصر تھے اور اس طبقہ کی نمائندگی کر رہے تھے جو انتقال رسول کے بعد آلِ رسول کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے اور امیر المومنین کی روحانی اور دینی خلافت و جانشینی کو سلب کرنے کے درپے تھا، اس طرح نہروان کی جنگ جو بظاہر امیر المومنین اور خوارج کے مابین ہوئی در اصل دو متضاد نظریات کی جنگ تھی جس میں ایک طرف امیر المومنین تھے جو خلافت کو محض بادشاہت قرار دینے سے انکار کر رہے تھے اور اس پر مصر تھے کہ خلیفۂ اسلام ہی تفسیر و تشریح قرآن کا حق رکھتا ہے، نیز یہ کہ خلافت ایک منصب دینی ہے جس کا مقصد حفظ و بقا و تعلیم و تشریح و اشاعت شریعت ہے اور دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو خلافت کو مذہب سے الگ

محض الگ سیاسی منصب تصور کرتا تھا، یہ وہی جھگڑا تھا جو سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد اٹھا تھا، اور نہروان کے میدان میں امیرالمومنینؑ نے اسی کا فیصلہ تلوار سے کیا۔

یہ صحیح ہے کہ جس طرح میدان جمل میں شخصیتیں بدلی ہوئی تھیں لیکن مقابلہ اسی طبقہ سے تھا جو امیرالمومنینؑ کو حکومت اور سیاست کے میدان میں شکست دینا چاہتا تھا، اسی طرح نہروان میں بھی شخصیتیں بدلی ہوئی تھیں لیکن مقابلہ اسی طبقہ سے تھا جو مذہب کو خلافت سے الگ کرکے آلِ رسولؐ کی دینی حیثیت کو مجروح کرنا چاہتا تھا ـــــــ اور امیرالمومنینؑ کو جہاں اس طبقہ کے مقابلہ میں فتح ہوئی جو آپ کو حکومت سے دور رکھ کے خلافت اسلامی کو قریش کی زر اندوزی کا وسیلہ بنانا چاہتا تھا وہیں آپ کو اس طبقہ کے مقابلہ میں فتح مبین نصیب ہوئی جو آپ کی علمی و روحانی برتری پر پردہ ڈال کے مذہب کو عوام الناس کا کھلونا بنا دینا چاہتا تھا!

سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ کے نتیجہ میں دو فتنے اٹھائے گئے :-

(۱) امیرالمومنینؑ کو سیاست اسلامی سے دور رکھ کے حکومت پر قریش کے مفاد پسند طبقہ کا اقتدار قائم کر دیا جائے۔

(۲) آلِ رسولؐ کی دینی سیادت کا خاتمہ کر دیا جائے اور تعلیم و تشریح قرآن کا حق آلِ رسولؐ سے چھین کے عوام پر امیرالمومنینؑ کا جو مذہبی اثر ہے اسے زائل کر دیا جائے۔

امیرالمومنینؑ نے ان دونوں فتنوں کے خلاف صبر اور خاموشی سے کام لیا۔ لیکن اسکے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ اپنے اور اسلام کے حقوق کی پامالی پر راضی ہو گئے تھے، آپ دراصل جنگ کے لئے مناسب وقت کی تلاش میں تھے چنانچہ جب وقت آیا تو جمل کے میدان میں آپ نے اس

طبقہ کا خاتمہ کر دیا جو آپ کو سیاست کے میدان میں زک دینا چاہتا تھا اور نہروان کے میدان میں شمشیر بکف ہو کر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ اس دینی مرکزیت اور اس خلافت روحانی کے استقرار کے لئے بھی جہاد واجب تصور کرتے تھے جسے قریش اپنے سیاسی اقتدار کی خاطر مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے!

خوارج کے سلسلہ میں ایک اور چیز کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا!

خوارج کے فتنہ کے آغاز کا فوری سبب قضیہ تحکیم تھا۔ بات یہ ہوئی کہ لیلۃ الہریر کی جنگ میں جب امیر معاویہ کو فیصلہ کن شکست ہوتے نظر آئی تو انہوں نے اپنے مشیر خاص عمرو بن عاص کے مشورہ سے نیزوں پر قرآن بلند کرا کے امیر المومنینؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈال دی اور یہ نعرہ بلند کیا کہ

"خلافت کا فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق کیا جانا چاہیئے!"

ہم اس واقعہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے ایک طرف امیر المومنینؑ کو جو تھا خلیفہ ماننے والے عراقیوں، اور عربوں نے دوسری طرف یہ بات مان لی کہ

خلافت کا فیصلہ نہ اجماع سے ہو سکتا ہے، نہ نامزدگی سے، نہ شوریٰ سے اور نہ تلوار سے، بلکہ خلافت کا صحیح اور سچا فیصلہ وہی ہوگا جو قرآن سے ہو اور جسے احادیث کی تائید حاصل ہو!

امیر معاویہ کے اس نعرہ پر لوگ یہ سمجھے کہ امیر المومنینؑ ناکام ہوئے اور امیر معاویہ

اور خوارج کامیاب، لیکن در اصل یہ نعرہ امیر المومنینؑ کی بہت بڑی سیاسی اور اصولی فتح تھی اس لئے کہ اس نعرہ کو قبول کرنے والوں نے اصولاً یہ مان لیا کہ

(۱) اجماع، نامزدگی اور شورای کی اساس پر بننے والی حکومتیں ناجائز تھیں اس لئے کہ یہ قرآن و سنت کی بنیادوں پر قائم نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ قریشی مفاد پسندوں کے موضوعہ اصولوں کی اساس پر وجود میں آئی تھیں

(۲) اور خود امیر معاویہ اور بنی امیہ و بنی عباس و آل عثمان کی خلافتیں بھی ناجائز تھیں اس لئے کہ یہ قرآن و سنت کے بجائے قہر و غلبہ سے قائم ہوئی تھیں!

یہ صحیح ہے کہ امیر معاویہ نے اس بہانہ سے جنگ بند کرادی اور فیصلہ کن شکست سے بچ گئے لیکن اس معمولی سی کامیابی کی قیمت ان کو ادا کرنا پڑی وہ بہت مہنگی تھی، اس لئے کہ انہیں اپنے "ایمان" کا سودا کرنا پڑا، اور امیر المومنینؑ کے لئے یہ سودا بہت اچھا تھا اس لئے کہ آپ کو تلوار کی ایک عارضی فتح سے تو ضرور ہاتھ دھونا پڑا، لیکن شامیوں، عراقیوں اور عربوں سب نے یہ مان لیا کہ علیؑ جس اصولِ خلافت کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ صحیح ہیں۔ اور ان کو خلافت سے محروم کرنے کے لئے قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے جو "اصول" گڑھ لئے تھے وہ سرتا سر غلط اور باطل تھے!

جمل اور نہروان کے میدانوں میں وہ ہوا جو سقیفۂ بنی ساعدہ کے بعد ہی ہوتا لیکن محض اسلام کی خاطر نہیں ہو سکا تھا! —— اور —— در اصل سقیفہ کی جنگ تھی جو جمل اور نہروان کے میدانوں میں فیصلہ کن انداز میں

لڑی گئی اور اس میں امیرالمومنینؑ کو جو فتح مبین حاصل ہوئی وہ ناقابل انکار ہے جمل اور نہروان کی فتوحات نے اسلامی دنیا سے فساد داخلی کا خاتمہ کر دیا اور اب صرف شامیوں کا معاملہ باقی رہ گیا جسے ہم اسلام کیلئے ایک بیرونی حملہ آور کا خطرہ قرار دیتے ہیں!

اگر امیر معاویہ اور شامیوں کی جگہ عیسائیوں نے اسلامی سرحدوں پر حملہ کیا ہوتا تو یقیناً امیرالمومنینؑ ان کو ایک یا دو لڑائیوں میں کچل دیتے لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں مقابلہ اس اموئیت اور مسیحیّت سے تھا جسے نوک شمشیر پہلے سے ہی دائرۂ اسلام اوڑھنے پر مجبور کیا جا چکا تھا، ان لوگوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح بہت پہلے حاصل ہو چکی تھی، اب اسے دل کی فتح میں تبدیل کیا جانا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کی شمال مغربی سرحدوں پر شام کا علاقہ ایسی سیاسی اور جنگی اہمیت رکھتا تھا کہ اگر اسے دل سے مسلمان نہ بنا لیا جاتا تو صدر اسلام کے لئے ہمیشہ ایک خوف ناک خطرہ باقی رہتا اس لئے کہ شام سے مدینہ کا راستہ بالکل کھلا ہوا ہے، اور شام بحر روم کے ساحل پر واقع ہونے کے نتیجہ میں ہمیشہ مسیحی یورپ کی یلغار اور لشکر کشی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کا داعی اعظم شامیوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس فتح کے نتیجہ میں شام میں ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ایک نفرت موجود رہتی اور جب بھی کوئی مسیحی طاقت شام پر حملہ آور ہوتی تو مقامی آبادی نہ صرف یہ کہ مزاحمت نہ کرتی بلکہ اس کا ساتھ دے کے دشمنوں کے لئے مدینہ کا دروازہ کھول دیتی۔ ایک عدیم النظیر ماہر جنگ کی حیثیت سے امیرالمومنینؑ شام کے جغرافیائی محل وقوع اور اس سے پیدا ہونے والے عظیم خطرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے آپ یہ

ضروری تصور فرماتے تھے کہ شام کو مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا جائے اس سے ایک دوسرا فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ شامیوں کے سچے دل سے مسلمان ہو جانے کے نتیجہ میں بحر روم کے ساحل پر واقع تمام یورپی اور افریقی ممالک پر مسلمانوں دبدبہ قائم ہو جاتا اور ان ممالک میں تبلیغ اسلام کی صورتیں پیدا ہو جاتا یقینی تھا، سیاسی اعتبار سے شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ مسلمانوں کے حلقہ اثر میں داخل ہو جاتے تھے، اور اس سے مسلمان جو فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تھے وہ سیاسی، حربی اور تبلیغی مسائل جو شامیوں سے مقابلے وقت، امیر المومنینؑ کے سامنے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں امیر المومنینؑ کی رائے یا آپ کی سیاست غلط تھی؟ —— یہ صحیح ہے کہ دلوں کی یہ فتح کافی عرصہ میں حاصل ہوئی، اور اس کے لئے آلِ رسولؐ کو عظیم قربانیاں دینا پڑیں۔ لیکن اس فتح کے جو شاندار نتائج مرتب ہوئے وہ تاریخ کے کسی طالبعلم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دلوں کی اس عجیب و غریب فتح کے لئے ——

(۱) امیر المومنینؑ کو جنگ کو طول دینا پڑا تا کہ اوّل تو شامیوں کی آتش انتقام سرد پڑ جاتے۔ دوسرے وہ آلِ رسولؐ کے کردار کا مطالعہ کر کے اسلام سے مانوس ہو جائیں اور تیسرے اسلام کو مٹانے کا نعرہ حصول خلافت کے نعرہ میں تبدیل ہو جائے۔

(۲) امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو "خلافت" یعنی بادشاہت عطا کر کے شامیوں کو ظاہری مسلمان بنے رہنے پر مجبور کر دیا، یہاں تک کہ ان کی وہ نسل جسے جبراً مسلمان بنایا گیا تھا اور جو بظاہر مسلمان لیکن بباطن مسیحی تھے، ختم ہو گئے۔ اور وہ نئی نسل وجود میں آ گئی جس کا تثلیث یا مسیحیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ جس نے آنکھیں کھول کے چاروں طرف اسلام ہی اسلام کو

دیکھا تھا۔ (یہ اور بات ہے کہ اِس کے سامنے اسلام کا اموی روپ ہی تھا !)
اور جس کے دِل میں عربوں کے خلاف سیاسی عناد تو ہو سکتا تھا لیکن مذہبی عناد
کا وجود ناممکن تھا !

(۳) شامیوں کی اس پروردۂ امویّت مسلمان نسل کو حقیقی اسلام کے مطالعہ کا ذوق
پیدا کرانے کے لئے کربلا کی عظیم الشان قربانی پیش کی گئی۔ تاکہ وہ شامی جو
بنی امیہ کی شاہی کو اسلام سمجھتے تھے اور جن کو اصل اسلام سے بے
خبر رکھنے میں حکومت وقت نے اپنی پوری قوتیں صرف کردی تھیں،
یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ "بنی امیہ کے اسلام" سے الگ بھی کوئی ایسا
"اسلام" موجود ہے جس کے لئے آلِ رسولؐ ایسی حیرت ناک قربانی
دے سکتی ہے !۔ واقعہ کربلا نے شامیوں کے مردہ ضمیر کو جھنجوڑا
ان کے دل ہلا دیئے۔ اور ان کو "حقیقت" معلوم کرنے پر مائل کر دیا۔

(۴) امام زین العابدین علیہ السلام اور آلِ رسولؐ کی مظلوم خواتین نے شامیوں کے
دلوں کو موم کر دیا۔ حقیقت ان پر واضح کر دی گئی ان کو اسلام حقیقی سے
روشناس کرا دیا گیا اور اہلبیت کے لٹے ہوئے قافلے نے شام کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا "دلوں کی فتح" مکمل کر لی گئی۔
اور وہ کام جو ۳۷ھ میں امیر المومنینؑ نے نامکمل چھوڑا تھا ۶۱ھ میں اس
طرح تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔ وہی شام جو عہد امیر المومنینؑ میں اسلام کے لئے
سب سے بڑا فتنہ بن کر نمایاں ہوا تھا آج چودہ سو سال بیت جانے
کے بعد بھی مسلمانوں کی عزت و شوکت کا ایک مرکز تسلیم کیا جاتا ہے!
آلِ رسول کے اسیروں نے شام کو اسلام کے لئے اس شان سے فتح کیا
کہ بنی امیہ کے انتہائی بداعمال، شراب خور، زانی اور دشمن دین سلاطین کا مرکز

حکومت ہونے کے باوجود شام کا تعلق اسلام سے منقطع نہ ہو سکا اور نہ صرف یہ کہ شام پر اسلام کا اثر غالب رہا۔ بلکہ انہیں شامیوں کے دلوں میں جو امیر معاویہ کی کمان میں اسلام کو ختم کر دینے کا عہد کر کے میدان جنگ میں آئے تھے اسلام سے ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ کئی سو سال تک مسیحی قوتیں شام کے راستے مرکز اسلام پر حملہ کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ لیکن شامیوں نے اپنی بانوں کی بازی لگا کے ان کو ہمیشہ روکے رکھا۔ اور وہی شامی اسلامی سرحدوں کے نگہبان قرار پائے۔ جنہوں نے ۳۵ھ میں سرحد اسلامی کو انتہائی پرخطر بنا دیا تھا، یہ نتیجہ تھا امیر المومنین کی اس پالیسی کا کہ شامیوں کو تلوار سے زک نہ دی جائے۔ بلکہ ان کے دلوں کو اسلام کے لئے جیت کے شام کو آنے والی صلیبی جنگوں میں اسلام کا سب سے مستحکم قلعہ بنا دیا جائے۔ کوتاہ نظر شاہ پسند اس سیاست پر اعتراض کر سکتے ہیں اس لئے کہ وہ معرکہ صفین میں "بادشاہ" علیؑ کے سر پہ فتح کا تاج جگمگاتے نہیں دیکھتے لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ علیؑ بادشاہ نہیں تھے۔ بلکہ تحریک اسلامی کے قائد اور مومنین کے امیر تھے۔ جن کو یہ معلوم ہے کہ علیؑ کا مقصد زندگی اپنی "بادشاہت" کا استقرار نہیں تھا بلکہ اسلام کی بقا و توسیع تھا اور جو اس امر سے واقف ہیں کہ علیؑ کے نزدیک فتح وہی تھی جو اسلام کی فتح ہو۔ وہ امیر المومنینؑ کی اس دور رس سیاست کی داد دینے پر مجبور ہیں۔ اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ معاویہ کے مقابلہ میں امیر المومنینؑ نے محض یہی نہیں کہ فتح حاصل کی بلکہ ایسی پائیدار اور شاندار فتح حاصل کی جس شام کو معاویہ نے دشمنان اسلام کا گڑھ بنایا تھا اسی کو خانوادۂ رسالتؐ نے اسلام کا ایسا مستحکم قلعہ بنا دیا جسے صلیبی جنگوں کا خوفناک سیلاب بھی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اور جس ملک کے رہنے والے مسیحیوں کے سہارے معاویہ نے اسلام کو مٹا دینے کا خواب دیکھا تھا وہی ملک

بر فیض تبلیغ خانوادۂ رسالت اسلام سے اتنا قریب ہو گیا کہ یسیحیت کے دیوانے یورپی صلیبی سپاہی کبھی شامی سرحدوں کو پار کر کے مرکز اسلام میں داخل نہ ہو سکے بلکہ انہیں ہمیشہ شامیوں کے ہاتھوں شکست اور موت کا سامنا کرنا پڑا ۔۔۔ امیر معاویہ کی اس سے زیادہ شرمناک ناکامی اور امیرالمومنینؑ کی اس سے زیادہ شاندار فتح اور کیا ہو سکتی ہے؟۔

یہاں ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ صفین میں جو معرکے ہوئے ان میں امیرالمومنینؑ نے اپنی جنگی مہارت اور فوجی قیادت کے وہ لافانی نقوش چھوڑے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ امیر معاویہ کے ساتھ ایک ایسا لشکر تھا جو اسلام کو مٹا دینے کی دھن میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ امیر معاویہ کے سپاہیوں میں جوش تھا، اتحاد تھا، جنگ کا جذبہ تھا۔ اور وہ اپنے قائد کے ہر حکم کی متابعت کرتے تھے۔ ان کا نظم و ضبط اچھا تھا۔ وہ ایک آواز پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور جان جوکھوں میں ڈال کے ہر کام کر گذرتے تھے، اور ان کے مقابلہ میں امیرالمومنینؑ کے پاس ایک ایسی فوج تھی جس میں نہ کوئی جوش تھا اور نہ کوئی جذبہ، نہ مقاصد کی لگن تھی، نہ اصولوں پہ مر مٹنے کا ذوق، نہ تنظیم تھی نہ اتحاد، نہ اسلام کو بچانے کی تڑپ تھی، نہ حدود مملکت میں بقائے امن کی خواہش۔ امیرالمومنینؑ ان سپاہیوں کو غیرت دلاتے، ان کے سامنے اسلام کی فریاد پیش کرتے، اپنے کلیجہ کا خون آنسو کر کے بہاتے ان کو اللہ اور رسولؐ کے واسطے دیتے۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی جنگ سے جی چراتے، طرح طرح کے بہانے کرتے اور لڑائی سے پہلو تہی کرتے اس لئے کہ اول تو ان کے نفوس خراب ہو چکے تھے، سابقہ حکومتوں نے ان کی

دینداری کو دنیاداری میں تبدیل کر دیا تھا، اور اوران کو اسلام یا اصول کی خاطر لڑنے کے بجائے محض مال غنیمت کی خاطر جنگ کرنے کا عادی بنا دیا تھا، اور دوسرے یہ لوگ امیرالمومنینؑ کو اپنے سابقہ تین حکمرانوں کے خلاف عمل کرتے دیکھتے تو یہ چیز ان پر گراں گذرتی تھی اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انکے دل پورے طور پر امیرالمومنینؑ کیساتھ نہیں تھے، ایسی حالت میں امیرالمومنینؑ کیلئے امیر معاویہ سے جنگ کرنا کتنا دشوار ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور یہ امیرالمومنینؑ کا کمال قیادت ہے کہ آپ اس قسم کے کم ہمت، بزدل، مفاد پرست، اور نیم دلی سے کام لینے والے لشکر کے باوجود نہ صرف یہ کہ میدان میں جمے رہے بلکہ معاویہ کو عراق اور حجاز پر قبضہ کر لینے سے روکے رہے۔ آپ کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا — تو شاید وہ چند روز بھی جنگ جاری نہ رکھ سکتا۔ اور اگر جنگ جاری رکھنے کی کوشش کرتا تو لازماً موت سے ہمکنار ہو جاتا۔ لیکن یہ اعلیٰ درجہ کی قیادت کا کمال تھا کہ ایک آپ ایک پاشان، پراگندہ اور کم ہمت گروہ کی مدد سے ایک پرجوش اور منظم لشکر کو نہ صرف یہ کہ روکے رہے بلکہ ایسے ایسی شکستیں دیتے رہے کہ آخر اسے نیزوں پر قرآن بلند کر کے التوائے جنگ پر مجبور ہو جانا پڑا۔

حضرت عثمان کے مقابلہ میں مٹھی بھر مصری اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ والوں نے خلیفہ کی مدد نہیں کی، تو بنی امیہ کی مکمل حمایت حاصل ہونے کے باوجود حضرت عثمان ایک دن مقابلہ نہیں کر سکے۔ گھر میں محصور ہو کر بیٹھ رہے اور آخر قتل کر ڈالے گئے۔ ان کے مقابلہ میں امیرالمومنینؑ کو دیکھئے کہ آپ کے سامنے معاویہ کا منظم لشکر موجود تھا، عراقی مدد سے پہلو تہی کر رہے تھے، کوفہ والے بار بار غداری، بےوفائی اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے لشکری اطاعت سے

گریزاں تھے، لیکن پھر بھی امیر معاویہ نہ صرف یہ کہ میدان جنگ میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ مکمل شکست سے بچنے کے لئے فریب کاری پر مجبور ہو گئے،!

قضیہ صفین کے بعد تو امیر المومنینؑ کے نام نہاد ساتھیوں اور لشکریوں کا نظم اتنا بگڑ چکا تھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت امیر المومنینؑ کے پاس کوئی لشکر تھا ہی نہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود معاویہ عراق اور حجاز پر قبضہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ جو امیر المومنینؑ کی قیادت اور سیاست کا ایک محیر العقول اور اعجاز آفرین کارنامہ ہے۔ جو صرف حکمت ربانی کے امین ہی سے ظہور میں آ سکتا ہے!

چار سال کی مختصر سی مدتِ خلافت میں آپ نے نہ صرف یہ کہ قریش کے مفاد پرست طبقہ کا خاتمہ کر دیا بلکہ بنی امیہ کے کافرانہ کردار کا بھی خاتمہ کر دیا اس لئے نہ خلافت کا دعوےٰ کر دینے کے بعد بنی امیہ کے لئے اصنام پرستی کی راہ پر پلٹ جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور وہ اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے ناموں کے ساتھ اسلام کا لیبل چسپاں رکھیں

آپ کی ان دونوں کامیابیوں کے تاریخ اسلام پر گہرے اثرات مرتب ہوئے جن کا ایک ہلکا سا خاکہ ہم سابقہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں آپ یہ عظیم اور تاریخی کارنامے انجام دینے میں مصروف تھے اس زمانہ میں آپ کے لئے یہ امکان ہی نہیں تھا کہ آپ اسلامی سلطنت کے حدود میں کوئی اضافہ فرمائیں۔ لیکن پھر بھی آپ اس امر سے غافل نہیں رہے چنانچہ ۳۸ھ میں آپ کے ایک جرنیل قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس کے بعد حارث بن مرہ کی سرکردگی میں دوسرا حملہ کر کے سندھ پر قبضہ کر لیا گیا۔ چنانچہ سندھ پر کئی سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ لیکن بعد میں دمشق میں حصول اقتدار کی

جو آویزشیں شروع ہوئیں ان میں سندھ دوبارہ ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا۔ افغانستان میں غور کا علاقہ آپ ہی کے عہد سلطنت میں فتح ہوا۔ حریث بن جعفر جعفی کی قیادت میں مشرقی ایران اور توران کے علاقے فتح کئے گئے۔ ایرانیوں کی متعدد بغاوتوں کو فرو کیا گیا۔ ربیع بن خشیم کی قیادت میں قزوین اور رے پر قبضہ کیا گیا اور اس طرح حدود سلطنت اسلامی میں کافی اضافہ کیا گیا۔ چار سال کی مختصر سی مدت میں جبکہ آپ کو جمل، نہروان اور صفین کے معرکے بھی درپیش تھے اتنے علاقوں کی فتح بھی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ اور یہ آپ ہی کا دل جگر تھا کہ اس وقت جبکہ معاویہ کے حامیان پوری مملکت میں غدر مچا دینے پر تلے ہوئے تھے آپ نے نصف ایران فتح کیا، افغانستان کے ایک علاقہ پر پرچم اسلامی لہرایا اور ہندوستان کے صوبہ سندھ پر لشکر کشی کر کے مسلمانوں کو اس برصغیر کی راہ دکھادی جو دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی کا مرکز بننے والا تھا!

امیرالمومنینؑ نے صرف یہی نہیں کیا کہ اسلام کے لئے قریش کے مفاد پسندوں اور بنی امیہ کے منافقوں سے جو خطرات پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کر دیا بلکہ آپ نے اپنی مختصر سی مدت خلافت میں تحریک اسلامی کے وہ سارے خدوخال پوری شدت سے ابھار دیئے جن پر جہالت، زر پرستی اور جنگوں کے لامتناہی سلسلہ نے پردے ڈال دیئے تھے۔ چنانچہ آج یہ آپ ہی کی علمی کاوشوں اور تعلیمات کا طفیل ہے کہ سیکڑوں انقلابات اور شیطان کے ہزاروں جوڑ توڑ کے باوجود اسلام کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے موجود ہے۔ آپ کی دور رس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ۔

(۱) مسلمانوں میں ملوکیت اور نسلی بادشاہت کا فتنہ پوری شدت سے ابھرنے والا ہے۔ اور انسانی حاکمیت کے جس غلط تصور کو اسلام ختم کر دینا چاہتا

تھا وہی خود دنیائے اسلام پر نافذ ہو جانے والا ہے اس کے معنی یہ تھے کہ انقلاب اسلامی کا نقطۂ اوّل یعنی کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بھی اموی اور عباسی سلاطین کے ہاتھوں اپنے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو جانے والا تھا اور توحید باری تعالیٰ کے اصول جہالت کی ظلمتوں میں گم ہو جانے والے تھے!

(۲) سلمان، ابو ذر، عمار، اویس قرنی اور اسی قسم کے دوسرے حضرات جو اسلام اور تحریک اسلامی کے حقیقی مفہوم کو جانتے اور سمجھتے تھے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اسلام کی عنان اقتدار ان ہاتھوں میں چلی جانیوالی تھی جو اسلام کو چند مردہ رسوم اور چند بے جان عبادات میں تبدیل کر دینے والے تھے، آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ اموی اور عباسی سلاطین کے ہاتھوں میں اسلام ایک کھلونا بن جائے گا۔ حدیث سازی عام ہو جائے گی، تفسیریں اسرائیلی خرافات کا مجموعہ بن جائیں گی، جبر و قدر، تجسیم باری تعالیٰ، انبیاء کی خطاکاری، اور اسی قسم کے سیکڑوں لغو عقائد اسلام میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ مانویت، مزدکیت، نوفلاطونیت، اور فلسفۂ یونان اسلامی روپ دھار کے عقائد اسلامی کے شفاف دھارے کو گندہ کر دیں گے بادشاہوں کی تفریح خاطر کے لئے فقہ اسلامی عجیب و غریب مسائل کا طومار بن جائے گی۔ اور اسلام اس طرح مسخ ہو جائے گا کہ اس کی شکل پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔

(۳) خلافت کی تقدیس کا تصوّر سلاطین کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں ختم ہو جائے گا۔ اور اس طرح امّت کی مرکزیت اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔

(۴) شیعہ عثمان، شیعہ علی اور خوارج کے نام سے مسلمانوں میں فرقہ بندی شروع

ہو چکی تھی جو آگے چل کے بھیانک روپ اختیار کر لینے والی تھی،

(۵) زر پرستی عام ہو چکی تھی اور آگے چل کے ملت اسلامیہ کو اس کے نتائج بد کا سامنا کرنا یقینی تھا۔

(۶) ابو موسیٰ اشعری قسم کے لوگ عام ہوتے جا رہے تھے جن کے نزدیک جمود اور بے عملی ہی وقت کی سب سے بڑی نیکی تھی جس کے نتیجہ میں آگے چل کے تصوّف کا بے عمل فلسفہ مسلمانوں کے ذہنوں پر چھا جانے والا تھا۔

(۷) مسلمان اتنے جاہل ہو چکے تھے کہ امیر معاویہ کے بقول اونٹ اونٹنی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جس قوم میں جہالت اس درجہ پر پہنچ جائے اس کا روحانی، علمی، تمدنی اور ذہنی حیثیت سے جو حشر ہو سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

امیر المومنینؑ کے دور کی کسی دوسری اسلامی شخصیت نے نہ تو ان مفاسد کا اندازہ کیا اور نہ ان کے تدارک کی کوئی تدبیر کی۔ یہ صرف آپ ہی کی ذات گرامی تھی جس نے ان خطرات کا احساس کیا اور مسلمانوں کی دینی تربیت کا پورا پورا بندوبست فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ کی مساعی جمیلہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ خون کی بارش اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی اسلام کی تبلیغ اور اسرار دین کی اشاعت سے باز نہیں رہتے تھے چنانچہ میدان صفین میں عین اس وقت جبکہ موت کا بازار گرم تھا آپ نے ایک اعرابی کے جواب میں مسئلہ توحید پر جو عالمانہ تقریر فرمائی ہے۔ وہ آپکے اسی جذبہ تبلیغ کی مظہر ہے۔ آپ نے اپنا یہ اصول بنا لیا تھا کہ روزانہ نماز ظہر کے بعد ایک خطبہ ارشاد فرماتے تھے جس میں دین کے حقائق و معارف بیان کیا کرتے تھے تاکہ مسلمان اس دین حقیقی سے آشنا

ہو جائیں جس پر جہالت نے گہرے غلاف ڈال دیئے تھے۔ آپ نے اپنے خطبات فرامین، توقیعات، خطوط اور دعاؤں کے ذریعہ دین کی حکمتوں اور اسلام کی تعلیمات کو جس شان سے اُجاگر کیا ہے۔ اس کی مثال صدر اسلام کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور اس باب میں تاریخ کی کوئی شخصیت آپ کے مقابلہ میں پیش کی جا نا محال ہے۔ آپ کی یہ سعی جمیل نہج البلاغہ اور صحیفہ علویہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور کتاب اللہ کے بعد اسلام کی صداقتوں کا سب سے مکمل اور حسین مظہر تسلیم کیجاتی ہے۔ آپ کے ان خطبات، مکاتیب اور ادعیہ کے نتیجہ میں ہی اسلام اپنی شکل پر قائم رہا۔ اور بادشاہوں کے جبر، فلاسفہ کے اقتدار کج فہم علماء کی نکتہ آرائیوں، جہالت کی ظلمت آفرینیوں، صوفیاء کے نلوح کالوں حدیث سازوں کی کرشمہ آرائیوں اور مفسرین کی بعیدانہ کار ذرف نگاریوں کے باوجود دین کی حقیقتیں گم نہ ہوسکیں۔ توحید کے اصلی نقوش قائم رہے۔ رسالت ومعاد کے عقائد پر حرف نہ آسکا۔ اور اسلام ہزاروں انقلابات کے باوجود آج تک اپنی اصلی صورت میں زندہ اور موجود ہے۔ سرکار دو عالمؐ کے ہزاروں صحابہ میں یہ شرف صرف امیرالمومنینؑ ہی کی ذات گرامی کو حاصل ہے کہ آپ نے امت کی ہدایت اور دین کی بقا پر پوری پوری توجہ فرمائی اور خطبات ومکاتب کی شکل میں وہ سرمایہ چھوڑ گئے۔ جو علوم الٰہیہ کا سب سے بڑا گنجینہ اور بصیرت ومعرفت کا سب سے قیمتی خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے صحابہ نے بعض احادیث کی روایت کا فریضہ انجام دیا۔ اور یا پھر فقہی مسائل واحکام بیان کئے لیکن امت کے عقائد کو محفوظ کرنے، حقیقت توحید عام کرنے، دین کے مصالح وحکم کو ذہن نشین کرانے اور آنے والے زمانہ میں دین کی شکل کو مسخ ہونے سے محفوظ رکھنے کا کام صرف امیرالمومنینؑ نے انجام دیا۔ اور یہ ایک

ایسا کارنامہ ہے جس کا جواب دوسری خلافتوں کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

خلافت الہیہ کا حقیقی مقصد دین کی حفاظت کرنا، علوم دینیہ کو عام کرنا، مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی کرنا، حقیقت اسلام کو اجاگر کرنا، رموز قرآن کی وضاحت کرنا، احکام الہی کی تبلیغ کرنا، شریعت مطہرہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کرنا ہے۔ ——— اور جب اس زاویہ سے امیر المومنینؑ کی خلافت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ خلافت کا مقصد اصلی صرف آپ کی خلافت کے زمانہ میں پورا ہوا۔ دوسرے خلفاء نے فتوحات ملکی میں ضرور اضافہ کیا۔ انتظام سلطنت پر توجہ ضرور کی۔ شاندار عساکر کی ترتیب میں ضرور انہماک کا مظاہرہ کیا، لیکن یہ کام تو دنیا کا ہر بادشاہ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، انجام دیا کرتا ہے، ان امور کا خلافت الہیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اگر محض ترتیب عساکر اور فتوحات ملکی کو خلافت کا مقصد مان لیا جائے تو دنیا کے سارے مسلمان بادشاہ اور فاتحین مستحق خلافت ہو جائیں گے۔ خلافت الہیہ کا مقصد تو وہ ہے جو ہم نے مندرجہ بالا سطور میں واضح کیا ہے۔ اور یہ مقصد اگر کبھی پورا ہوا ہے تو امیر المومنینؑ کے دور خلافت میں ——— ! اس اعتبار سے آپکا یہ چار سالہ دور خلافت نہ صرف یہ کہ اپنی آپ مثال ہے بلکہ درحقیقت وہ واحد خلافت علی منہاج النبوۃ ہے جس کی نظیر تاریخ اسلام میں ملنا محال ہے !

آج دنیا کی ہر ترقی یافتہ حکومت اپنے حدود مملکت سے جہالت کو مٹانے اور عوام کو تعلیم یافتہ بنانے پر زور دیتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے۔ کہ صدر اسلام کی ابتدائی تین خلافتوں نے اس اہم تعمیری اور تعلیمی کام کو ہمیشہ نظر انداز کیا جس کا نتیجہ اس شدید جہالت کی شکل میں رونما ہوا۔

جس میں بقول امیر معاویہ عرب اونٹ اور اونٹنی میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہے۔ امیر المومنین علیہ السلام دنیائے اسلام کے پہلے حکمران ہیں جنہوں نے نشر علوم پر نہ صرف یہ کہ توجہ دی بلکہ اسے اپنی حکومت کا اوّلین مقصد قرار دیا۔ چنانچہ آپ کی کاوشوں کے نتیجہ میں کوفہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔ اور آپ کی ہدایت و تربیت کے نتیجہ میں دنیائے اسلام میں تصنیف تالیف کا وہ مشغلہ شروع ہوا جسے آپ سے پہلے کے حکمرانوں نے قطعًا بند کر رکھا تھا۔!

عربی علم نحو کے امام ابوالاسود دوئلی، علم قرأت کے امام عبدالرحمٰن سلمی، فقہ و حدیث کے امام شعبی، تفسیر کے امام عبداللہ بن عباس، مساحت و ریاضی کے امام کمیل بن زیاد، زبان و بیان کے ماہر عمر بن سلمہ اور علم عروض کے موجد عبادہ بن صامت آپ ہی کے خرمن علم کے خوشہ چین ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السّلام، امام حسین علیہ السلام، جناب محمد بن حنفیہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب، حضرت جابر بن عبد اللہ انصا[ری] حضرت کمیل بن زیاد، حضرت اصبغ بن نباتہ، حضرت عبیداللہ بن ابی رافع سلیم بن قیس ہلالی، میثم تمار، زید بن وہب، اور بعض دوسرے حضرات آپ کے مکتب فکر کے پروردہ وہ مصنفین ہیں جن کے آثار قلمی محفوظ ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی سعی و جہد کے نتیجہ میں تصنیف و تالیف کا فن کافی ترقی کر گیا تھا!

دُنیائے اسلام پر امیر المومنین کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ آپ نے مسلمانوں میں علمی تحریک شروع فرمائی۔ چنانچہ اس حقیقت کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے کہ آج ملت اسلامیہ جن علوم پر ناز کرتی ہے۔ ان کے آغاز کا سہ[را]

امیرالمومنینؑ ہی کے سر ہے۔ مسلمانوں کا علم الٰہیات، مسلمانوں کا علم کلام اور مسلمانوں کا فلسفہ و حکمت، تمام تر حضرت علیؑ کی ایجاد ہے اور ان علوم کا اولین ماخذ نہج البلاغۃ ہے۔ دوسرے علوم کے سرچشمے بھی اسی کوہ علم و معرفت سے پھوٹے اور یہ آپکا ایک ایسا احسان ہے جسے ملت اسلامیہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی علمی تحریک کا ایک ادنیٰ سا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ دنیائے اسلام کی پہلی تفسیر حضرت سعید بن جبیر نے لکھی جو تابعین میں شامل تھے۔ ابن الندیم نے اپنی فہرست میں اس تفسیر کا تذکرہ کیا ہے۔ سعید بن جبیر شیعیان امیرالمومنینؑ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حجاج بن یوسف نے ان کو شہید کرا دیا۔

شیعیان امیرالمومنینؑ اس وقت قرآنی علوم کی تدوین و اشاعت میں مصروف تھے۔ جب دوسرے مسلمانوں کی ان علوم پہ کوئی توجہ نہ تھی چنانچہ امام محمد باقرؑ علیہ السلام کے صحابی سدی کبیر اسمٰعیل متوفی ۱۲۷ھ نے ایک اعلیٰ درجہ کی تفسیر تیار کی جس کا تذکرہ علامہ سیوطی نے بھی کیا ہے۔ محمد بن سائب بن بشر کلبی متوفی ۱۴۶ھ نے بھی جو امام جعفر صادقؑ کے صحابی تھے قرآن پاک کی ایک بہت مفصل تفسیر تیار کی تھی۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگردوں میں جابر بن یزید جعفی اور ابوالجارود نے بھی قرآن کی تفسیریں لکھی ہیں۔

آئمہ علوم قرآن میں عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، ابی بن کعب سعید بن جبیر (اعلم التفسیر فی التابعین) یحیٰی بن یعمر، میزان بصری، طاؤس بن کیسان، اعمش کوفی، سعید بن مسیب، عبدالرحمٰن سلمی اور ابان تغلب وغیرہ

کے نام لئے جا سکتے ہیں جو صحابہ اور تابعین کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

آئمہ آل رسول کے اصحاب میں جن لوگوں نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ممتاز کارنامے انجام دیئے ان میں ابو حمزہ ثمالی صحابی امام زین العابدین علیہ السلام زیاد بن منذر، ابوالجارود، یحییٰ بن قاسم ابوبصیر، علی بن سالم بطائنی، حصین بن مخارق، ابو جنادہ السلولی، محمد بن خالد برقی، وہب بن حفص، یونس بن عبدالرحمن، احمد بن صبیح، علی بن سباط، سلمہ بن خطاب ابوالفضل قمی، فرات بن ابراہیم اور دوسرے کئی حضرات شامل ہیں۔ حسن بن خالد برقی نے امام حسن عسکری علیہ السلام کی ہدایت پر ایک سو بیس جلدوں میں ایک مفصل تفسیر تیار کی تھی۔ جو ایک نادر علمی کارنامہ ہے۔

علم قرات میں سب سے پہلی کتاب ابان بن تغلب نے لکھی اور ان کے بعد دوسری کتاب حمزہ بن حبیب نے تیار کی۔ حمزہ کا انتقال ۱۵۶ھ میں ہوا اور یہ دونوں صحابی آئمہ تھے۔ حمزہ نے قرات کا علم امام جعفر صادق علیہ السلام سے حاصل کیا تھا۔ ان کے علاوہ سعد بن ابو جعفر کوفی متوفی ۲۲۱ھ نے علم قرات میں ایک اہم تصنیف چھوڑی۔ اور یہ کتابیں اس وقت تیار کی گئیں جب دوسرے مسلمانوں کو اس علم پر کوئی توجہ نہیں تھی، چنانچہ اہل سنت میں علم قرات کے پہلے مصنف ابو عبید قاسم بن سلام ہیں جو مذکورہ بالا تینوں شیعہ مصنفین کے بعد اس میدان میں داخل ہوئے ہیں۔

احکام القرآن پر پہلی کتاب محمد بن سائب الکلبی متوفی ۱۴۶ھ نے لکھی۔ غرائب القرآن کے پہلے مصنف ابان بن تغلب ہیں جن کے بعد ابو جعفر رداسی ابو عثمان مازنی، فرا، اور ابن درید نے اس میدان میں قدم رکھا اور یہ سب حضرات شیعہ تھے۔ معانی قرآن پر ابان بن تغلب، فرا، اور رداسی کی تصانیف

اولیت کا شرف رکھتی ہیں۔ نوادر القرآن کے پہلے مصنف علی بن حسین بن فضال ہیں جن کے بعد ابوالحسن محمد بن احمد معروف بہ حارثی اور علی بن ابراہیم نے اس فن میں اہم کتابیں تیار کیں۔

متشابہات قرآن پر سب سے پہلی کتاب امام جعفر صادق کے شاگرد حمزہ بن حبیب زیات کوفی نے لکھی اور مقطوع و موصول قرآن پر بھی پہلی کتاب انہیں بزرگ نے تیار کی۔ محمد بن احمد وزیر نے بھی متشابہات قرآن پر ایک اچھی کتاب چھوڑی۔

مجازات قرآن میں پہلی کتاب فرا یحییٰ بن زیاد نے تیار کی، علامہ سید رضی نے بھی اس موضوع پر ایک تصنیف چھوڑی۔

فضائل قرآن پر ابی بن کعب نے اور امثال قرآن پر شیخ محمد بن جنید نے پہلی بار قلم اٹھایا۔

محمد بن ابراہیم بن جعفر ابو عبداللہ کاتب نعمانی نے تفسیر نعمانی تیار کی اور آیات قرآنی سے ساٹھ علوم ظاہر کیے۔

پہلی تفسیر جو کل علوم قرآن کی جامع کہی جاتی ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی نے تیار کی۔

شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی کی التبیان۔ سید رضی کی حقائق التنزیل۔ شیخ حسین خزاعی کی روض الجنان، علامہ طبرسی کی مجمع البیان اور شیخ قطب الدین راوندی کی تفسیر وہ علمی کارنامے ہیں جن پر ملت شیعہ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے۔ اور یہ سب فیض ہے اس علمی تحریک کا جو ملت اسلامیہ کے منصوص من اللہ قائد نے اپنی نگرانی میں شروع فرمائی تھی۔

علم حدیث میں پہلا صحیفہ خود امیر المومنین علیہ السلام نے تیار کیا اور آپ نے اس امر میں سعی بلیغ فرمائی کہ زیادہ سے زیادہ احادیث جمع کر لی جائیں چنانچہ حضرت امام حسن علیہ السلام حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری نے بھی صحف حدیث مرتب کیے۔ حضرت

ابورافع نے اس طرح اپنا صحیفہ حدیث مرتب کیا کہ احادیث مختلف ابواب میں تقسیم تھیں امیرالمومنین کے شاگردوں میں علی بن ابی رافع، عبیداللہ بن ابی رافع، سلیم بن قیس ہلالی، میثم تمار، اصبغ بن نباتہ، عبیداللہ بن حر جعفی، ربیعہ بن سمیع اور حرث ہمدانی نے بھی صحف حدیث تیار کئے۔ اور یہ کتابیں اس زمانہ میں مرتب ہوئیں جب شیعیان اہلبیت کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔

دوسری صدی میں جب اہل سنت میں زہری اور امام مالکؒ نے احادیث جمع کیں اس وقت بھی شیعہ محدثین بکثرت تھے۔ جن میں ابان بن تغلب، جابر بن یزید جعفی، ابو حمزہ ثمالی، زرارہ بن اعین، محمد بن مسلم طائفی، ابو بصیر، عبدالمومن بن قیس انصاری، ابوالرجا کوفی، ابو یحییٰ فیاض، حجر بن زائدہ، معاویہ بن عمار، اور عبداللہ بن میمون قداح وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب نے حدیث کی چار سو کتابیں چھوڑی ہیں۔

علمائے شیعہ نے علم حدیث میں چھ ہزار چھ سو کتابیں تالیف کیں جو علم حدیث سے پیروان آل رسولؐ کی شیفتگی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ علم حدیث کے ساتھ علم رجال کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ تفسیر اور حدیث کے ساتھ ہی رجال میں بھی اوّلیت کا شرف شیعوں کو حاصل ہے۔ چنانچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے صحابی محمد بن خالد برقی علم الرجال کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے رواۃ کا تذکرہ مرتب فرما کے تحقیق و تنقید حدیث کا دروازہ کھول دیا۔ ان کے بعد ابو محمد ابن جبلہ ابن حیان نے کتاب الرجال لکھی۔ ابو جبلہ کا انتقال ۲۱۹ھ میں ہوا۔ رجال کے تیسرے مصنف امام محمد تقی علیہ السلام کے صحابی ابو جعفر بیقطینی ہیں۔ ان کی کتاب منظر عام پر آنے کے بعد اہل سنت نے اس علم کی جانب توجہ کی اور شیعہ نے رجال اہل سنت پر کتاب تصنیف کی۔ علمائے شیعہ میں ابو جعفر برقی، ابن بابویہ قمی، شیخ صدوق، شیخ ابو بکر جعالی وغیرہ علم رجال کے بہت بڑے ماہر گذرے ہیں۔ اور ابھی دور آخر میں حضرت ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ نے اس فن میں اس کمال کا مظاہرہ کیا ہے جس کی

نظیر تاریخ اسلامی میں دستیاب ہونا مشکل ہے۔

علم فقہ کی تدوین پر بھی امیرالمومنینؑ نے پوری توجہ دی۔ چنانچہ فقہ اسلامی کی پہلی کتاب امیرالمومنینؑ کے شاگرد ابورافع نے خود آپکی زندگی میں ہی مرتب کرلی تھی، ان کے بعد قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سعید بن مسیب نے فقہ پر کتابیں لکھیں۔ اس وقت تک اہل سنت نے فقہ میں کوئی کتاب تیار نہیں کی تھی۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابہ نے تو علم فقہ کو چار چاند لگا دیئے۔ چنانچہ ان فقہائے شیعہ میں زرارہ، ابوبصیر اسدی، فضیل بن یسار، مسلم طائفی، جمیل بن دراج، عبداللہ بن مسکان، عبداللہ بن کبیر، حماد بن عیسیٰ وغیرہ کے نام تاریخ فقہ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ثابت المقدام نے جامع فقہ تیار کی اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی علی بن حمزہ نے جامع ابواب فقہ تصنیف کی۔ امام موسےٰ کاظم علیہ السلام کے صحابہ میں محمد بن معانی نے شرائع الایمان اور عبداللہ بن مغیرہ نے تیس جلدوں میں علم فقہ کی ایک بہت بڑی کتاب تیار کی۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ آئمہ آل رسول کے صحابہ میں ابراہیم بن محمد ثقفی، ابراہیم بن محمد اسلمی، علی بن محمد نسائی، صفوان بن یحییٰ بجلی اور ابو علی السراد وغیرہ نے بھی علم فقہ میں تصانیف چھوڑی ہیں۔

علم کلام کی ایجاد بھی حضرت امیرالمومنینؑ کا کارنامہ ہے چنانچہ کمیل بن زیاد، سلیم بن قیس ہلالی، اور حارث اعور ہمدانی اس علم میں آپ کے خصوصی شاگرد تھے، علم کلام میں سب سے پہلی کتاب عیسیٰ بن روضہ تابعی نے لکھی اور ان کے بعد ابوالہاشم بن محمد بن علی بن ابی طالب کی تصنیف سامنے آئی۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے یہ علم قیس بن ناصر اور حمران بن اعین نے، امام محمد باقر علیہ السلام سے جابر بن یزید جعفی نے اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم کلام ابوجعفر محمد بن علی بن نعمان معروف بہ

احول نے حاصل کیا۔

مشہور متکلم ہشام بن حکم یونس بن یعقوب اور فضل بن حسن بھی اس علم میں امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے۔ امام علی رضا علیہ السلام کے شاگرد فضل بن شاذان نے علم کلام میں ایک سو اسی تصانیف چھوڑی ہیں۔ اسلام کے ممتاز اور شہرہ آفاق فلسفی و متکلم ابو نصر فارابی اور ابن مسکویہ بھی شیعہ تھے، شیعہ متکلمین میں علامہ حلی، شیخ مفید، محقق نصیر الدین طوسی اور علامہ سید مرتضیٰ لازوال شہرت کے مالک ہیں۔

سیرت کی پہلی کتاب ابن اسحٰق نے لکھی اور یہ شیعہ تھے،

تاریخ کی پہلی کتاب امام جعفر صادق کے شاگرد ابان بن عثمان الاحمر متوفی ۱۴۰ھ نے تیار کی۔

جغرافیہ کی پہلی کتاب امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگرد ہشام بن محمد کلبی نے تصنیف کی اور انہوں نے علم جغرافیہ پر متعدد رسائل بھی چھوڑے۔

علم کیمیا کی ایجاد کا شرف جابر بن حیان کو حاصل ہے جو امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے۔

علم عروض کے موجد خلیل بن احمد، علم الصرف کے پہلے مصنف ابو عثمان مازنی اور علم بدیع کے موجد ابن ہرم ابراہیم بن علی بن سلمہ بھی شیعہ تھے۔

ہم خلافت ظاہری کے اس باب کو آپ کی شہادت کے ذکر پر ختم کرنا چاہتے ہیں، اس المناک اور دردانگیز واقعہ پر، جس نے ملت اسلامیہ کو یتیم اور دین کو بے سہارا کر دیا۔ لیکن جو واقعہ بجائے خود امیر المومنینؑ کی زندگی کا اتنا تابناک اور شاندار واقعہ تھا کہ اس انسان اعظم نے جس نے

اپنی شان میں قرآن مجید کی سیکڑوں آیتیں نازل
ہو نے اپنے باب میں سرکار دو عالمؐ کی سیکڑوں احادیث

بیان ہونے اور خود اپنے لاتعداد بے مثل و بے نظیر
کارناموں پر
فخر نہیں کیا۔ اس نے اس واقعہ شہادت کو اپنی انتہائی کامیاب زندگی کا
سب سے کامیاب واقعہ قرار دیتے ہوئے ارشاد کیا

فزت برب الکعبۃ

رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا!

شہادت مسلمان کی معراج ہے لیکن کیا کہنا اس معراج کا جو اس نماز میں حاصل ہو جو خود معراج مومن کہی جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ کو اللہ کے گھر میں، عین سجدۂ خالق میں معراج شہادت سے ہمکناری نصیب ہوئی جو ایک سچے مومن کا سب سے بڑا فخر اور رسالتمآبؐ کے ایک سچے شاگرد کی سب سے بڑی نشانی ہے:

سچ کہا کسی نے ؎

کسے را میسر نہ شد ایں سعادت
بکعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

تاریخ کا فیصلہ

آلِ رسول کو محرومی، ناکامی اور پسپائی کا شکار تصور کرنے والے اس حقیقت کو بھولتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دنیائے اسلام میں جس شخص کو سب سے زیادہ مرجعیت حاصل ہے وہ امیرالمومنینؑ اور صرف امیرالمومنینؑ کی ذات گرامی ہے۔ ماننے کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انداز مختلف ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک مقبولیت اور ہردلعزیزی کا تعلق ہے امیرالمومنینؑ سے زیادہ دنیائے اسلام میں مقبول و محبوب کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے۔

شیعہ: آپ کو پہلا امام اور خلیفہ بلافصل مانتے ہیں۔

اہلسنت: آپ کو وصی رسول اور چوتھا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔

صوفیا: آپکو امام الاولیاء قرار دیتے ہیں

نصیری: آپکو خدا کہہ کر یاد کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک کفر ہے۔

غرض یہ کہ خوارج و نواصب کے علاوہ جو بہ اتفاق امت دائرہ اسلام سے خارج ہیں دنیا کا ہر مسلمان آپ پر ایمان رکھتا ہے اور یہ آپکی ایک ایسی کامیابی ہے جو قطعاً ناقابلِ انکار ہے۔ آپ کی محبت کو سارے مسلمان بلا اختلاف عقائد شرط ایمان تسلیم کرتے ہیں شیعہ، تفضیلیہ، صوفیا اور خود اہلسنت کا تعلیم یافتہ طبقہ آپکو تمام صحابہ سے افضل مانتا ہے۔ اور مسلمانوں میں بہ حیثیت مجموعی بڑی اکثریت بعد رسولؐ ساری امت پر آپکی فضیلت کی قائل ہے۔ آپکو سرکار دوعالمؐ کا روحانی جانشین اور وصی ماننے پر ساری امت کا اجماع ہے۔ اور یہ سب اس حالت میں کہ بنی امیہ نے آپکا نام مٹا دینے کی ہر امکانی کوشش کی قریش کے خلافت ساز طبقہ نے ہمیشہ آپکو نظر انداز کیا اور متعصب و تنگ نظر علماء نے جو سلاطین کے وظیفہ خور تھے تحریر کی ساری صلاحیتیں آپکے فضائل پر پردہ ڈالنے اور اغیار کے "فضائل" کو ابھارنے میں صرف کر دی تھیں یہ ضرور ہے کہ عہد بنی امیہ میں آپ پر سب و شتم ہوا۔ اور بظاہر اس عہد میں آپکی شخصیت ناکام نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عہد

آپ کو ایک عظیم اصولی فتح نصیب ہوئی اس لئے کہ جمہور مسلمین کے نزدیک آپ کی خلافت، خلافت راشدہ کا جزو ہے۔ اور اس پر ایمان رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ ایسی حالت میں جن لوگوں نے بنی امیہ کے ساتھ مل کر آپ پر سب وشتم کیا وہ خود اہل سنت کے نقطہ نظر سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلام کے چوتھے خلیفہ کی خلافت سے انکار کیا اور اس طرح ایک ایسے بنیادی عقیدہ کے منکر ہوئے جس پر عامتہ المسلمین کا اجماع ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے —— اور وہ یہ ہے کہ —— دور بنی امیہ میں جن لوگوں نے امیرالمومنینؑ پر سب وشتم میں حصّہ لیا اور اس طرح خلافت راشدہ کے ایک رکن کی خلافت سے انکار کیا۔ ان کو مسلمان اور مسلمانوں کا خلیفہ قرار دینا کس اصول سے جائز ہو سکتا ہے۔؟

ظاہر ہے کہ ان حضرات کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہ اصول وضع کرنا پڑے گا کہ خلافت راشدہ کے ارکان کی خلافت سے انکار کرنے اور ان پر لعن طعن کرنے سے کوئی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا —— یہی نہیں بلکہ اس حرکت کا ارتکاب کرنے والا خلیفۃ المسلمین بھی قرار دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ سلاطین بنی امیہ کے سلسلہ میں کیا گیا۔ تو پھر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ —— اگر مسلمانوں کی ایک جماعت خلافت راشدہ کے تین ارکان سے اظہار بیزاری کرتی ہے اور ان کی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو اس پر اعتراض کیوں؟

اگر امیر معاویہ، دوسرے خلفائے بنی امیہ اور اس عہد کے دوسرے حضرات کو جو تمام تر تابعین اور تبع تابعین پر مشتمل ہیں (اور جن میں عہد یزید و معاویہ کے صحابہ بھی شامل ہیں:) مسلمانوں کی چوتھی خلافت سے انکار نیز اس پر سب وشتم کرنے کے باوجود مسلمان قرار دیا جاتا ہے تو تین خلافتوں سے انکار کرنے والوں

کو بھی مسلمان قرار دینا پڑیگا ——— اور اگر اس سے احتراز ہوتا گیا تو امیر معاویہ سے لیکر بنی امیہ کے آخری خلیفہ تک نہ صرف یہ کہ سب خلفا کے اسلام سے ہاتھ دھونا پڑیگا بلکہ عدالت صحابہ کے عقیدہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑیگا۔ اور ان تمام مسلمانوں کے اسلام سے بھی انکار کرنا پڑیگا جو بنی امیہ کے خلفا کی بیعت کرتے رہے۔ ان پر ایمان کا اظہار کرتے رہے یا ان کو مسلمان تسلیم کر کے انکا احترام واجب قرار دیتے رہے۔ ان میں چاہے تابعین ہوں چاہے تبع تابعین ہوں چاہے علماء و محدثین ہوں، چاہے مفسرین و متکلمین ہوں اور چاہے جمہور مسلمین ہوں، سب کا ایمان مشتبہ ہو جانا ضروری ہے۔!

اگر ان حضرات کا اسلام ثابت کرنے کے لئے یہ بہانہ تراشا گیا کہ لوگوں نے بنی امیہ کی بیعت صرف تلوار کے خوف سے کی تھی تو ساری دنیا ئے اسلام پر جس میں صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے "تقیہ کا الزام" عائد ہو جائے گا۔ اور اس کا جواب دینا مشکل ہوگا!

عہد بنی امیہ میں بھی امیرالمومنینؑ کی حقانیت کا اعلان و اعتراف بار بار ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے انتقال کے صرف ساڑھے تین سال بعد بنی امیہ کے تیسرے خلیفہ ابولیلیٰ معاویہ بن یزید نے بھرے دربار میں یہ اعتراف کیا کہ امیرالمومنینؑ حق پر تھے اور معاویہ نے مسئلہ خلافت میں آپ سے جو تنازعہ کیا وہ سرتاسر سینہ زوری دھاندلی اور غلط کاری پر مشتمل تھا۔ امیرالمومنینؑ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود امیر معاویہ کے وارث نے نہ صرف یہ کہ اپنے دادا کو ناحق کوش قرار دیا بلکہ اس سلطنت پر ٹھوکر ماردی۔ جس کے لئے امیر معاویہ نے امیرالمومنینؑ سے تنازعہ کیا تھا۔

معاویہ بن یزید کا یہ اعلان حق اس امر کا ثبوت ہے کہ ابوسفیان

اور معاویہ کی نسل نے بالآخر اسی اسلام کے سامنے سرنیاز خم کر دیا جسے یہ دونوں تلوار، سازش اور مکر کے سہارے سے مٹا دینا چاہتے تھے اور یہ سیاست علویہ کی سب سے بڑی کامیابی ہے، امیر المومنینؑ سے پیشتر والے خلفاء نے بے بس اور ناطاقت بنی امیہ کو شام کی گورنری کی رشوت دی لیکن وہ ان کو نہ صرف یہ کہ مسلمان نہیں بنا سکے بلکہ ان کو اسلام دشمنی کی ایک بہت بڑی قوت عطا کر گئے۔ آل رسولؐ نے اس کے برعکس بنی امیہ کے کفر باطنی کا مقابلہ کیا اور اپنی قربانیوں کے سہارے یہ فتح عظیم حاصل کی کہ

(۱) آل ابوسفیان کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے حکومت نکل گئی یعنی مادّی اعتبار سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اور

(۲) اسے اسلام قبول کر لینا پڑا۔ یعنی اس کی ظاہری حیثیت و اقتدار کے ساتھ اس کی کفر نواز تحریک کا بھی خاتمہ ہو گیا!

یہ صحیح ہے کہ حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی لیکن خالد بن یزید کے بعد آل ابوسفیان حکمران نہیں رہی بلکہ بنی امیہ کی مروانی شاخ حکمران ہوتی۔ ابوسفیان کی نسل میں معاویہ کے صرف ساڑھے تین سال بعد تک حکومت رہی اور اسکے بعد اسکا خاتمہ ہو گیا۔!

مروانی خلفاء میں عمر بن عبدالعزیز نے امیر المومنینؑ پر سب و شتم بند کرا دیا اور اس طرح عملاً یہ تسلیم کر لیا کہ امیر معاویہ سے لیکر بنی امیہ کے دس خلفاء تک سب ایک مستقل گناہ کا ارتکاب کرتے رہے۔ اور جو لوگ ان خلفاء کی بیعت کرتے رہے۔ یا آج بھی ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہ ایک بڑی غلط کاری کے مرتکب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔!

اس سلسلہ میں یہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے کہ علمائے اسلام عمر بن عبدالعزیز

کو خلفائے راشدہ میں شامل کرتے ہیں اور اسے بنی امیہ کے ملک عضوض سے علیحدہ ایک دیندار خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ دنیا کے سارے مسلمان امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں کے اس فعل کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ پر سب وشتم کراتے ہیں اور چاہے زبان سے اس کا اقرار نہ کیا جائے لیکن عمر بن عبدالعزیز سے بیعت اور اظہار عقیدت کرنے والے اس منطقی نتیجہ کی زد سے باہر نہیں جا سکتے کہ وہ امیر معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے حکمرانوں کو عملاً غلط کار تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس منطقی نتیجہ کو نہ مانا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عمرو بن عبدالعزیز سے جو بیعت کی گئی وہ بھی جھوٹی تھی اور جو اظہار عقیدت کیا جاتا ہے وہ بھی نمائشی ہے!

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے آل رسولؐ کو فدک بھی واپس کر دیا جو آل رسولؐ کی ایک عظیم اخلاقی اور اصولی فتح تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے اس عمل سے ثابت کر دیا کہ جن لوگوں نے فدک کو ضبط کیا تھا یا اس کی ضبطی کے لئے ایک حدیث کا سہارا لیا تھا وہ غلطی پر تھے اور جس حدیث کو انہوں نے اپنے فعل کی دلیل قرار دیا تھا وہ سرے سے مجہول اور وضعی تھی اس لئے کہ اگر اس منطقی نتیجہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو عمر بن عبدالعزیز کے اس اقدام کی مذمت کرنا واجب ہو جائے گا۔ اور یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی مخالفت اور توہین کی اس لئے وہ خلافت کا اہل نہیں تھا، لیکن کوئی مسلمان عمر بن عبدالعزیز پر یہ الزام عائد نہیں کرتا بلکہ سب اسے ایک خلیفہ راشد تسلیم کرتے ہیں جو اس کا ثبوت ہے کہ سارے مسلمان زبان سے نہ سہی لیکن اپنے عمل سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فدک کی ضبطی بھی غلط تھی اور وہ حدیث بھی وضعی تھی، جسے اس ضبطی کی دلیل قرار دیا گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کی بیعت کرنے والے

مسلمان عملاً یہ ثابت کرتے ہیں کہ فدک کی ضبطی غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ تھی، اور جو حکومت غیر عادلانہ حرکتوں کی مرتکب ہو اُسے کم از کم خلافت کے محترم لقب سے نوازنا قطعاً غلط ہے!

فدک کے سلسلہ میں یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ اسے بار بار ضبط کیا اور واپس کیا جاتا رہا۔ جو خلیفہ چاہتا تھا اُسے ضبط کر لیتا تھا، اور جو چاہتا تھا واپس کر دیتا تھا اور سوادِ اعظم اسلام ان میں سے ہر خلیفہ کو خلیفہ برحق، واجب الاطاعت امیر اور اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہے ——— اس کے معنی یہ ہوئے کہ سوادِ اعظم کے نزدیک فدک کی ضبطی اور واپسی دونوں درست ہیں۔ کسی وقت یہ فعل جائز ہو جاتا ہے اور کسی وقت ناجائز! ——— جو بے اصولی کا ایک ایسا عجیب و غریب شاہکار ہے جس پر ہر سچا مسلمان شرم سے سر جھکا لینے پر مجبور ہے!

فدک کی ضبطی اور واپسی کی یہ عجیب و غریب داستان اور مسلمانوں کی یہ بے اصولی کہ وہ ان متضاد نظریات رکھنے والے خلفا میں سے ہر ایک کو امیرِ مطاع اور پیشوا تسلیم کرتے رہے، امیر المومنینؑ کی ایک عظیم اخلاقی اور اصولی فتح ہے۔ اس لئے کہ فدک کی ہر واپسی کے موقع پر دنیائے اسلام کو عملاً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فدک کو ضبط کرنا ایک غیر عادلانہ فعل تھا اور جو لوگ ایک غیر عادلانہ فعل کے مرتکب ہوئے وہ خلافت کے سے عظیم منصب کے اہل نہیں قرار دیئے جا سکتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ بار بار کا اقرار ان تمام خلافتوں کو باطل قرار دیدیتا ہے۔ جو قریش نے امیر المومنینؑ کو نظر انداز کر کے قائم کی تھیں ——— اور کم از کم دنیا پر یہ ضرور ظاہر کر دیتا ہے کہ بار بار اُمت کا "اجماع" اس امر پر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تین خلافتوں نے فدک کو غصب کر کے ایک بڑا ظلم کیا تھا۔! ——— ان خلافتوں کے غیر عادلانہ فعل پر بار بار "اجماعِ امت" کے سامنے اس ایک بار

کے " اجماع " کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ جو وفات رسولؐ کے بعد وجود میں آیا تھا؟

بنی امیہ کے بعد بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی اور ساری دنیائے اسلام نے ان کی بیعت کی۔ آل عباس کے پہلے خلیفہ ابو العباس السفاح نے حصول خلافت کے بعد ہی جو پہلا خطبہ پڑھا اس میں اس نے نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کے تمام خلفاء کی تکذیب کی بلکہ ابتدائی تین " خلفائے راشدین " کی خلافت کو بھی ناجائز قرار دیا۔ السفاح نے کھلم کھلا الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے جانشین، وارث اور خلیفہ بلا فصل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تھے اور جن لوگوں نے امر خلافت میں آپ سے تنازعہ کیا یا خود مسند آرائے خلافت بن بیٹھے وہ ہرگز اس فعل کے مجاز نہیں تھے!

السفاح کا یہ خطبہ اسؑ کے عقائد کا ایک واضح اعلان تھا اور اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ اس اعلان عقائد کے بعد ساری دنیائے اسلام نے اس کی بیعت کی یہ چیز تین حالتوں سے خالی نہیں ——————

(۱) یا تو ساری دنیائے اسلام نے السفاح کے ان عقائد کو تسلیم کر لیا۔
(۲) یا دنیا بھر کے مسلمانوں نے " تقیہ " کے طور پر عباسیوں کی بیعت کی
(۳) اور یا پھر سواد اعظم اسلام کا کوئی اصول نہیں اس لیئے کہ وہ جب چاہے اسلام کے تین خلفاء اور بنی امیہ کے سلاطین کی بیعت کر سکتا ہے اور جب چاہے ان کو غاصب قرار دے سکتا ہے اور دونوں حالتوں میں اس کا مذہب قائم رہتا ہے!

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت قبول کیجائے گی وہ امیر المومنینؑ کی فتح کہلائے گی اور مذہبِ اہلبیت کی کھلی ہوئی کامیابی تصور کیجائے گی۔

السفاح کے بعد منصور دوانیقی نے اپنے پیشرو کے عقائد میں ترمیم کی اور یہ دعوای کیا کہ خلافت دراصل حضرت عباس کا حق تھی۔ یہ ایک عجیب وغریب دعوئے تھا اور آج دنیا کا کوئی مسلمان اسے تسلیم نہیں کرتا لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس دعوے کے باوجود منصور کی بیعت کی۔ اور اُسے خلیفہ تسلیم کر لیا!

بہرحال حضرت عباس کے دعوائے خلافت کے نتیجہ میں منصور نے پوری "خلافت راشدہ" کو مسترد کر دیا اور ان تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی تکذیب کر دی جو اس نظام خلافت کے علمبردار تھے ـــــــ اور ساری دنیائے اسلام نے منصور کی بیعت کر کے اس کے اس فیصلہ پر مہر توثیق ثبت کر دی!

اگر ہم یہ عرض کریں تو غلط نہ ہوگا کہ السفاح اور المنصور کے دور میں خلافت راشدہ کے باطل ہونے پر ساری اُمت کا "اجماع" رہا۔ کیونکہ اگر اس صورت کو قبول نہ کیا جائے گا تو پھر یہ ماننا پڑیگا کہ مسلمانوں نے ان دونوں کی خلافت کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ دنیا بھر کے مسلمان دراصل "تقیہ" کئے ہوئے تھے اور یہ ایک ایسی بات ہوگی جسے قبول کرنا آج کے مسلمانوں کے لئے آسان نہیں ہوگا!

امیر المومنینؑ کی اس سے زیادہ شاندار کامیابی اور کیا ہوگی کہ ۱۱ھ میں مسلمانوں کے "اجماع" نے جن لوگوں کی خلافت کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں کو صرف ایک صدی کے بعد ۱۳۲ھ میں اسی اجماع مسلمین نے خلافت سے محروم کر کے غاصب قرار دیدیا ـــــــ اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس نئے اجماع کے فیصلہ کو بھی برحق شمار کیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ ارکان خلافت راشدہ غاصب تھے اور دوسرے یہ کہ سرے سے اصولِ اجماع

کو باطل مان لیا جائے اس لئے کہ جو اجماع روز روز بدلتا رہتا ہو اس پر شرعی مسائل کی بنیاد رکھ دینا اور اس کے فیصلوں کو برحق قرار دینا ویسی ہی الجھنیں پیدا کر رہے گا جیسی کہ آل عباس کے عقائد "پر اجماع اُمت" نے پیدا کر دی ہیں۔ اور جن کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ خلافت کا وہ سارا محل منہدم ہو جاتا ہے جس پر مسلمانوں کا ایمان ہے بلکہ وہ "عدالت صحابہ" بھی باطل ٹھہر جاتی ہے جس پر حدیث اور فقہ کی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں!

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ السفاح اور المنصور دونوں ابتدائی تین خلافتوں کو مسترد قرار دینے میں تو متحد ہیں لیکن امیرالمومنینؑ کے بارے میں ان کے نظریات مختلف ہیں۔ السفاح امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کا اعلان کرتا ہے۔ اور المنصور آپ کی خلافت سے بھی اسی طرح انکار کرتا ہے جسطرح ابتدائی تین خلفاء کی خلافت کا منکر ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے منصور کے دور میں اپنی بنائی ہوئی چاروں خلافتوں سے انکار کیا لیکن درحقیقت یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے ابتدائی تین خلافتوں سے منصور کے انکار پر تو خاموشی اختیار کی لیکن جب اس نے امیرالمومنینؑ کے حق خلافت سے انکار کیا تو فقہ اسلامی کے دو آئمہ یعنی امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے المنصور کی بیعت توڑ دینے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے انکار محال ہے کہ اہلسنت کے ان دونوں آئمہ نے خلیفہ المنصور کے مقابلہ میں محمد نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کا ساتھ دیا اور اس طرح عملاً یہ ثابت کر دیا کہ وہ خلافت کو عباسیوں کے مقابلہ میں آل علیؑ کا حق تسلیم کرتے تھے۔ اور اس منصور کو خلافت کا اہل تسلیم نہیں کرتے تھے جو امیرالمومنینؑ کی خلافت کا منکر تھا!

بنی عباس کے کئی خلفاء کے متعلق بلاخوف تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ابتدائی تین خلافتوں کو باطل تصور کرتے تھے اور امیرالمومنینؑ کو رسول اللہؐ کا پہلا اور سچا جانشین مانتے تھے ـــــــ اور مسلمانوں نے ان سب کی بیعت کی ہے۔ ایسی حالت میں یا تو یہ مان لیا جائے کہ یہ بیعت غلط تھی اور یا پھر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیرالمومنینؑ کی خلافت بلافصل پر اُمّت کئی مرتبہ اجماع کرچکی ہے، جو امیرالمومنینؑ کی بہت بڑی کامیابی ہے!

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے تین ارکان اور بنی امیہ کے سلاطین کی خلافت پر کبھی "اجماع" نہیں ہوا۔ اس لئے کہ شیعوں نے ان کی خلافت کبھی تسلیم نہیں کی، البتہ ان کی خلافت کے باطل ہونے پر دورِ بنی عباس میں بار بار "اجماع امت" ہوا۔ اس لئے کہ جب بھی اہلسنت نے بنی عباس کے ان سلاطین کی بیعت کی جو ان خلفا کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے تو وہ شیعوں کے ہم آواز ہو گئے۔ اور ان خلافتوں کے بطلان پر ساری امت کا اجماع مکمل ہو گیا!

آلِ رسولؐ کے نویں دسویں اور گیارہویں آئمہ پہ بنی عباس کے مظالم کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ بنی عباس کو یہ معلوم تھا کہ آلِ رسول میں مہدی پیدا ہوگا اور ان کو اندیشہ تھا کہ مہدی کے ہاتھوں ان کی حکومت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ خلفائے بنی عباس کا یہ خوف بھی امیرالمومنینؑ کی ایک بڑی کامیابی ہے اس لئے کہ مسند خلافت پر بیٹھنے والے بھی اپنے دل کے پردوں میں یہ تسلیم کرتے تھے کہ قائم آلِ محمدؐ امیرالمومنینؑ کے پوتے اور جانشین ہونگے اور اسی اقرار قلبی کے نتیجہ میں وہ اسے ضروری خیال کرتے تھے کہ آلِ رسولؐ کے اُن آئمہ برحق پر مظالم ڈھا کے عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی جائے جن کی امامت حقہ کا خود ان کو وقتاً فوقتاً اقرار کرنا

پتہ تھا!

جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے واقعہ کربلا کے بعد سے گیارہویں امام کے دور تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے دل ہمیشہ آلِ رسولؐ کے ساتھ رہے اور مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام رہا کہ خلافت دراصل آلِ رسولؐ کا حق ہے۔ شاہانِ وقت بھی مسلمانوں کے اس رجحان سے بخوبی واقف تھے چنانچہ آئمہ اہلبیت کا قید و بند میں مبتلا رکھا جانا دراصل اس حقیقت کے اعتراف کا عملی نتیجہ تھا۔ امیرالمومنینؑ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ حکومت وقت کی قوتوں، زر پاشیوں اور مخالفانہ پروپاگنڈہ کے باوجود دنیا آپ کی اور آپکی اولاد کی حقانیت کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوتی اور جس شخص کے نام کو دنیا سے مٹا دینے کی ہر امکانی سعی وجہد کی گئی وہ تاریخ کے ہر دور میں اس اعتبار سے مسلمانوں کا سب سے بڑا قائد تسلیم کیا گیا کہ اس کی ذات پر ہمیشہ امت کا اجماع رہا حالانکہ تاریخ کی کسی دوسری اسلامی شخصیت کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ اس پر ہمیشہ اور ہر زمانہ میں پوری اُمّت کا اجماع ہوا ہو!

فاتحین مصر کا عروج اور دنیا کے مختلف گوشوں میں شیعیان علی کی حکومتوں کا قیام بھی امیرالمومنینؑ کی ایک بڑی کامیابی ہے چنانچہ آج بھی ایران، یمن اور مراکش میں شیعیان علیؑ کی حکومت قائم ہے۔ عراق بھی شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے۔ اور وہاں چھ آئمہ کی زیارت گاہیں ہیں جن کی وجہ سے عراق کو عالم اسلام میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خود شام میں جو آپ کے مخالفین کا سب سے بڑا مرکز تھا آج بکثرت شیعہ موجود ہیں اور مذہبی اعتبار سے تو شام کی ساری اہمیت آلِ رسولؐ کی مرہونِ کرم ہے اور مسجد اموی کے علاوہ شام میں جتنی زیارت

گاہیں ہیں وہ سب امیر المومنینؑ کے اصحاب اور اولاد سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود ہمارے برصغیر میں کروڑوں شیعہ رہتے ہیں۔ اور جگہ جگہ امام باڑوں کی شکل میں آلِ رسولؐ سے تعلق رکھنے والی عمارتیں موجود ہیں۔ غرض آج اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں آپکا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ کی اولاد یعنی ساداتِ کرام کو ایک بلند تر مقام کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اور آپ سے اظہارِ محبت و عقیدت کو ایمان کی نشانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اصولی اعتبار سے بھی دیکھئے تو امیر المومنینؑ کی فتح مبین آج کے دور میں ناقابلِ انکار ہے۔ اس لئے کہ آپ کے مقابلہ میں خلافت کے جتنے اصول وضع کئے گئے تھے ان سب کو آج کی اسلامی دنیا بالاتفاق مسترد کر چکی ہے۔ چنانچہ

(۱) قہر و غلبہ کے اصول کو آج کا کوئی مسلمان دلیلِ حق تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے کہ قہر و غلبہ اوّل تو شخصی حکمرانی کے لئے ہوتا ہے جسے آج کا ہر مسلمان مردود قرار دیتا ہے اور دوسرے اسے حریت کے اصولوں کے منافی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈونیشیا، مصر، شام، ترکی اور پاکستان وغیرہ میں جمہوری حکومتوں کا قیام اور دوسرے ممالکِ اسلامیہ میں آئینی بادشاہت کا وجود قہر و غلبہ کے اصول کا عملی استرداد ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے مسلمان اس مہمل اصول کے خلاف "اجماع" کر چکے ہیں جس کی اساس پہ امیر معاویہ اور انکے جانشینوں کی خلافت قائم ہوئی تھی!

(۲) نامزدگی کے اصول کو بھی عامۃ المسلمین نے ٹھکرا دیا ہے اس لئے کہ جمہوریت اور دستوریت میں نامزدگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔

(۳) شوریٰ کا اصول بھی مسترد ہو چکا اس لئے کہ آج کا مسلمان اسے کسی حالت میں قبول نہیں کرتا کہ چند اکابر و اعیان بند کمروں میں بیٹھ کے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیں۔ بلکہ آج حکمرانوں کا انتخاب عوام کے ووٹوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

(۴) اجماع اُمت تو سرے سے ناممکن العمل شے ہے چنانچہ اسی لئے مسلمانوں نے اکثریت رائے کے اصول کو اپنا لیا ہے جمہوریت کے اکثریت رائے والے اصول کا مسلمانوں میں تسلیم کر لیا جانا اس حقیقت کا عملی اعتراف ہے کہ اجماع ایک ناممکن العمل شے ہے اور اسلام ظاہر ہے کہ ایک ناممکن العمل شے کی تعلیم نہیں دے سکتا!

خلافت کے ان چاروں وضعی اور بے بنیاد اصولوں کا مسترد کر دیا جانا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان اصولوں پر جو خلافتیں قائم کی گئی تھیں وہ سب بے اصل تھیں اور چند مفاد پسندوں نے اسلام کے ایک مہتم بالشان امر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کے لئے ایسے اصول گڑھ لئے تھے جن کو آج کے مسلمان نے سرے سے ناممکن العمل اور غلط قرار دے کر مسترد کر دیا ہے! ——— اس سلسلہ میں ملت اسلامیہ کی یہ بدقسمتی بھی ملاحظہ کے قابل ہے کہ جو اصول اساس خلافت قرار دیئے گئے تھے وہ چونکہ سب باطل اور غلط ثابت ہوئے۔ اور آج کا مسلمان ان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے اس لئے سرے سے خلافت کا وجود ہی ختم ہو گیا ہے۔ اور آئندہ بھی خلافت کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ———

(۱) ساری دنیا کے مسلمانوں کا کسی ایک شخص کی ذات پہ اجماع عملاً

ناممکن ہے اس لئے کہ ایسی کوئی شخصیت ملنا محال ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں میں مقبول و محبوب ہو۔

(۲) نامزدگی کا بھی ایسی حالت میں ظہور میں آنا ناممکن ہے۔

(۳) شوریٰ یعنی اکابر ملت کا فیصلہ بھی ناممکن العمل ہے اس لئے کہ اسے عام مسلمان اپنے حق رائے دہندگی کے منافی تصور کرتے ہوئے قبول نہیں کریں گے اور

(۴) قہر و غلبہ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ اول تو ساری دنیائے اسلام پر بزور شمشیر کسی شخص کا قابض ہو جانا ناممکن ہے اور اگر یہ صورت ممکن بھی ہو جائے تو اس شخصی حکمرانی کو غیر اسلامی قرار دیا جائے گا۔ اور اسے خلافت الٰہیہ کا مرتبہ عطا کرنے پر کوئی مسلمان تیار نہیں ہوگا!

خلافت کے باب میں مسلمانوں کے ان مزعومات کا ابطال امیرالمومنینؑ کی ایک ایسی عظیم الشان فتح ہے جس سے کوئی ہوشمند انسان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا!

امیرالمومنینؑ نے ان چاروں اصولوں کو جو قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے وضع کئے تھے غلط قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ آپ کی دوربین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب مسلمان اطراف واکناف عالم میں پھیل جائیں گے اس لئے اجماع، نامزدگی اور شوریٰ کا امکان باقی نہیں رہے گا اور قہر و غلبہ بھی ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں اگر ان اصولوں پر خلافت کی اساس رکھی گئی تو دنیا سے خلافت کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور نظم ملی و ضبط شریعت کا وہ اہم ترین رکن جسے سرکار دو عالم

کی خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے دُنیا سے مفقود ہو جائے گا۔ مفاد پسندوں نے امیر المومنینؑ کی بات نہیں مانی۔ اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج نہ خلافت ہے اور نہ اس کے مبیّنہ اصول ———— دُنیا علیؑ کی اصابت رائے اور پختگی فکر کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہے۔ اور عملاً یہ تسلیم کر رہی ہے کہ مدینہ کے قریش اور دمشق کے امویوں نے چند اصول وضع کر کے ملت اسلامیہ کو خلافت کے سے مہتم بالشان ادارہ سے محروم کر دیا۔ وقتی طور پر ان کی غرض ضرور پوری ہو گئی لیکن ملت اسلامیہ ان کی مفاد پسندی پر قربان ہو گئی، مسلمان شریعت کے ایک اہم جزو سے محروم ہو گئے۔ اور سقیفہ کی سازش نے مسلمانوں کی سیاسی وحدت کا جنازہ نکال دیا!

یہ ہے امیر المومنینؑ کی وہ مہتم بالشان کامیابی جس پر عصر حاضر کا ہر مسلمان ایک خاموش گواہ بنا ہوا ہے اور چاہے زبانوں سے آج بھی اجماع، نامزدگی، شوریٰ اور غلبہ کے الفاظ جاری کئے جاتے ہوں لیکن ملت اسلامیہ کا عمل اس کی گواہی دے رہا ہے کہ

یہ چاروں اصول باطل ہیں

اس لئے

ان کی اساس پر جو خلافتیں قائم کی گئیں وہ بھی باطل تھیں

اور

خلافت حقہ وہی تھی، اس کا سچا اور دائمی اصول وہی تھا جس کا اعلان میدان غدیر میں کیا گیا تھا!

صلح حسنؑ

امیرالمومنینؑ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد تحریک اسلامی کی قیادت کا بار گراں اس عظیم المرتبت امام کے کاندھوں پر آیا جسے دنیا سبط اکبر اور سید شباب اہل الجنۃ کے لقب سے یاد کرتی ہے امام حسن علیہ السلام کی ذات گرامی پر دشمنوں نے ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ دوست بھی آپکے محیر العقول کارناموں سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ اور یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے جس پر جتنا بھی ماتم نہ کیا جائے وہ کم ہے۔

اس سید مظلوم نے جس وقت قوم کی قیادت سنبھالی اس وقت کے حالات کم وبیش کچھ ایسے تھے ________

(۱) عراق اپنا جذبہ جہاد کھو چکے تھے اور اسلام کی خاطر مزید جنگ جاری رکھنے پر تیار نہیں تھے، ان پر تھکن طاری ہو چکی تھی ان کے بازو جھول چکے تھے، دلوں پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا۔ اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان سے کسی انقلابی یا اصولی تحریک میں مدد لی جا سکتی۔

(۲) حجازیوں پر موت اس طرح طاری ہو چکی تھی کہ معاویہ کے سپاہیوں نے حجازی عورتوں کو کنیزیں بنایا لیکن ان کی رگِ حمیت جوش میں نہ آئی بسر بن ارطاۃ نے مکہ پر لشکر کشی کی لیکن حجازی خاموش رہے اور اس طرح انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں اب اتنا بھی مذہبی

جذبہ باقی نہیں ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت نہ سہی، خود اپنی عزت و آبرو کا تحفظ بھی کر سکیں۔

(۳) مصری اور ایرانی اسلام کی انقلابی تحریک سے تقریباً نا آشنا تھے ان کو تلوار کے سہارے اسلام پہنچا تھا۔ اور ان لوگوں کے ذریعہ پہنچا تھا جو خود اسلام کے مقاصد سے بڑی حد تک نا آشنا تھے اس لئے ان سے کسی اصولی جنگ میں مدد ملنے کا امکان نہیں تھا۔

(۴) مسلمانوں کے نفوس اتنے خراب ہو چکے تھے کہ امیر معاویہ کا روپیہ بڑے بڑے مسلمان اکابر کو آسانی سے خرید لیتا تھا۔

(۵) مسلمانوں کے ذہنوں سے حکومت الٰہیہ کا تصور قطعاً ختم ہو چکا تھا۔ اور ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہو چکے تھے کہ علیؑ اور معاویہ کی حکومت میں فرق کیا ہے؟ انہوں نے حکومت الٰہیہ کو بادشاہت کا مترادف سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اور خلافت قیصریت کی ہم معنی قرار پا گئی تھی۔

(۶) جہالت کے نتیجہ میں مسلمانوں کے عقائد بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور تحصیل علم کے وسائل کم ہوتے جاتے رہے تھے۔

(۷) سلمان، ابوذر، عمار اور ایسے ہی دوسرے بہت سے صحابہ کبار جو علم کے ستون، ہدایت کے مینارے اور شریعت کے امین تھے، دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ اور جو لوگ باقی تھے وہ افلاس، کسمپرسی اور بیچارگی کا شکار ہو چکے تھے۔

(۸) شریعت اسلامی کے برباد ہو جانے کا وقت قریب آ چکا تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں اتنی سکت باقی نہیں تھی کہ وہ اُسے شامیوں کی دستبرد

سے محفوظ رکھ سکیں۔

(۹) مسلمان روحانی، اخلاقی اور دینی قدروں سے اتنے بیگانہ ہو چکے تھے کہ انکو دوبارہ "مسلمان" بنانے کی ضرورت پیش آگئی تھی!

(۱۰) مملکت اسلامی میں ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑکنا شروع ہو گئی تھی اور امن و نظم کا خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔ بدامنی کی حالت میں علم، دین، تہذیب، تمدن، اخلاق اور دوسری اعلیٰ انسانی قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے جوں جوں بدامنی میں اضافہ ہو رہا تھا دوں دوں انسانیت کے اس اعلیٰ تصور کے مٹ جانے کے خطرات پیدا ہوتے جا رہے تھے جسے دنیا میں عام کرنا اسلام کا مقصد اولین تھا۔

(۱۱) مملکت اسلامی میں بدنظمی پیدا ہو جانے کے نتیجہ میں یہ خطرہ بھی ابھرنے لگا تھا کہ غیر مسلم طاقتیں دنیا سے اسلام پر لشکر کشی کر کے اسلام کو فنا کر دیں گی اس لئے کہ اسلام گرد و پیش کے ممالک کی نگاہوں میں بری طرح کھٹک رہا تھا اور مسلمانوں کی بڑھتی سیاسی قوت نے ہمسایہ ممالک کو مسلمانوں سے خوفزدہ کر دیا تھا۔

(۱۲) ممالک غیر میں اسلام کی تبلیغ کا کام تقریباً بند ہو چکا تھا اس لئے کہ اندرونی خلفشار کی حالت میں اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے دوسرے قائد کو جو کام انجام دینا تھے وہ حسب ذیل تھے۔

(۱) دنیائے اسلام کو بنی امیہ کی اسلام دشمنی سے نجات دلائی جائے۔

(۲) ملک میں داخلی سکون کا بندوبست کیا جائے تاکہ امن و سکون کی فضا میں مسلمانوں کی تربیت نفس کا انتظام کیا جا سکے۔ ان کو اسلام کی صحیح

تعلیمات سے روشناس کرایا جائے، قرآن اور حدیث کی تعلیم عام کیجائے عوام کی اخلاقی حالت بہتر بنائی جائے اور مسلمانوں کو پھر ایک بار اس دین حقیق سے آشنا کرایا جائے جسے وہ اب تقریباً بھول چکے تھے،

(۳) غیر ممالک تک اسلام کی آواز پہنچائی جائے اور غیر اسلامی قوتوں کا زور بل توڑ کے دوبارہ ان کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت قائم کر دی جائے ——— لیکن سوال یہ تھا کہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ کیا ہو؟

جس وقت امام حسن علیہ السلام نے اسلام کے روحانی مشن کی قیادت سنبھالی اسوقت تلواریں اپنی ہوئی تھیں شام اور عراق کا سرحدی علاقہ ایک فوجی چھاؤنی نظر آرہا تھا اور امیر معاویہ کی طاقت بڑھتی جارہی تھی اس لئے کہ جہاں شامی سپاہی انتقام کے جذبہ میں سرشار پوری قوت سے انکا ساتھ دے رہے تھے وہیں مسلمان موصوف کی سازشوں اور زر پاشیوں کے نتیجہ میں بنی امیہ کے ساتھ شامل ہوتے جارہے تھے۔ امیر معاویہ کی طاقت بڑھنے کا اب ایک اور سبب بھی پیدا ہوگیا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ موصوف نے اپنی جنگ کو حصول خلافت کی جنگ قرار دیدیا تھا اور اس طرح ———

(۱) عام مسلمانوں کے ذہنوں سے یہ خوف دور ہوگیا تھا کہ امیر معاویہ کی کامیابی اسلام کی بربادی پر منتج ہوگی یا کامیاب ہونے کے بعد بنوامیہ ایام جاہلیت کی اصنام پرستی کو دوبارہ رائج کر دیں گے۔

(۲) آل رسولؐ کے سارے دشمن جو الٰہی نظام حکومت کو اپنے مفادات اور اپنی زراندوزی کے منافی تصور کرتے تھے۔ اب آسانی سے امیر معاویہ کا ساتھ دے سکتے تھے۔

(۳) قریش چونکہ الٰہی حاکمیت کے مقابلہ میں انسانی حاکمیت کے اصول کے ہمیشہ علمبردار رہے تھے اس لئے ان کو امیر معاویہ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس میں ان کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ جس نسلی عصبیت کے عادی تھے وہ بنی امیہ کی حکمرانی میں پورے شباب کے ساتھ ظہور میں آسکتی تھی۔

(۴) وہ عراقی مسلمان بھی جو امیر معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دے رہے تھے انسانی حاکمیت کے تصور کے پروردہ تھے۔ اور حضرت علی علیہ السلام کے شہید ہو جانے کے بعد خلیفہ کے "انتخاب" کے معاملہ میں وہ "آزاد" ہو چکے تھے۔ یہ لوگ بھی خلافت کو کوئی منصوص من اللہ منصب نہیں مانتے تھے۔ اور نہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اُولی الاَمر کو معصوم ہونا چاہیئے۔ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ بالکل رچا بسا ہوا تھا کہ ہر مسلمان خواہ وہ ذاتی اعتبار سے کیسا ہی کیوں نہ ہو خلیفہ رسول ہو سکتا ہے۔ اس لئے معاویہ کی خلافت مان لینے میں ان کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟ ——— اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ امیر معاویہ کا ساتھ دینے میں دنیاوی منفعت بھی مضمر تھی! — ایسی حالت میں عراق بھی رفتہ رفتہ امیر شام کے شام کیساتھ ہوتے جا رہے تھے۔

ان حالات میں اگر حضرت امام حسن علیہ السلام جنگ جاری رکھتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ

(۱) آپ اور آپ کے ساتھی سچے مسلمان جو شریعت کے خزینہ دار، دین کے ستون اور علم و ہدایت کے امین تھے قتل ہو جاتے اور حقیقی اسلام

تبلیغ کرنے والا یا دین مبین کے حقائق دنیا کے سامنے پیش کرنے والا کوئی باقی نہ رہتا۔

(۲) جنگ کی حالت میں شامی سپاہیوں کا انتقامی جذبہ بیدار رہتا اور اسلام اور اسکے آثار کو مٹا دینے کی جو تمنا ان کے دلوں میں موجزن تھی وہ برابر موجود رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آلِ رسولؐ کی شکست کے نتیجہ میں شامی اسلام اور اس کے آثار کو فنا کر دیتے۔

(۳) اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں امام حسن علیہ السلام کو فتح حاصل ہو جاتی —— حالانکہ یہ قطعاً بعید از قیاس ہے تب بھی امام کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اسلامی نظام حکومت قائم فرماتے اس لئے کہ مسلمانوں کے نفوس اتنے بگڑ چکے تھے اور حرص دنیا ان پر اس حد تک غالب آچکی تھی کہ اب وہ اس نظام زندگی کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ جو علوی نظام حکومت کا خاصہ تھا!

ایسی حالت میں فتح حاصل کرنا بے سود تھا۔ اس لئے کہ امام حسن علیہ السلام کے نزدیک فتح حاصل کرنے کا مقصد اپنی ذاتی بادشاہت قائم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ فتح کا مقصد اس نظام حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا تھا جس کا وجود میں آنا اب تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ نفوس کے بگڑ جانے عقائد کے کمزور ہو جانے، قلوب پر دنیا پرستی طاری ہو جانے اور جذبۂ دینی کمزور پڑ جانے کے بعد ایک دنیاوی حکومت تو قائم ہو سکتی ہے لیکن ایک خالص اصولی، شرعی اور دینی حکومت کا قیام ناممکن ہے!

امام حسن علیہ السلام بادشاہ ہوتے تو ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی کہ عوام کے نفوس کا کیا عالم ہے؟ ان کی اخلاقی اور روحانی حیثیت کیا ہے

——— اور مذہب کے باب میں ان کی حالت کیا ہو رہی ہے؟ ان کو اگر مطلب ہوتا تو اپنی اپنی حکومت سے، خزانوں سے، دولت سے، خدام وحشم سے، شاہانہ جاہ وجلال سے، محلات وقصور سے، اور جب تک ان کو یہ سب چیزیں حاصل رہتیں تب تک ان کو عوام کی حالت سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ لیکن حسنؓ امام تھے بادشاہ نہیں تھے تحریک اسلامی کے قائد تھے سلطان نہیں تھے، امیرالمومنین اور خلیفہ رسول تھے۔ دنیاوی حکومت کے طالب نہیں تھے۔ ان کا کام ایک شاندار محل میں بیٹھ کے داد عشرت دینا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے نفوس کی اصلاح کرنا اور دین کی تبلیغ کرنا تھا۔ وہ جواہرات سے کھیلنے کے لئے خلق نہیں ہوئے تھے، اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے کے لئے پیدا کئے گئے تھے، ان کو حکومت سے اگر کچھ دلچسپی ہو سکتی تھی تو اس لئے نہیں کہ انکا حکم چلے۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ کے احکام نافذ ہوں۔ ان کا مقصد حکمرانی ذاتی انتقام نہیں تھا، دین کا فائدہ اور ملت کی شرعی خطوط پر تنظیم ان کا مطلوب تھی ——— اور جس حکومت سے یہ مقصد ہی پورا نہ ہو اس کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی حکومت کا حاصل ہونا تحریک اسلامی کے قائد کی مقصدی شکست اور اس کے نقطہ نظر سے ایک قطعاً فضول اور بے کار سی بات تھی۔ اس لئے امام نے وہ کیا جو حکمت ربانی کے امین کی حیثیت سے آپ کو کرنا چاہیئے تھا۔ آپ نے معاویہ سے "صلح" کر لی اور حکومت سے دستبردار ہو گئے!

اس "صلح" پر کج فہم اور کم عقل لوگ بڑا اعتراض کرتے ہیں لیکن اعتراضات دراصل ان کی کوتہ نظری اور ناسمجھی کے علاوہ اور کسی شے کا پتہ نہیں دیتے، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ———

(۱) اس "صلح" کے نتیجہ میں امام حسن علیہ السّلام اس شکست سے بچ گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آلِ رسول ذبح ہو جاتی۔ اسلام کے سچے پرستار قتل ہو جاتے اور دنیا سے اسلام اور اس کی تعلیمات کا خاتمہ ہو جاتا۔

(۲) اس "صلح" کے نتیجہ میں حدودِ مملکت اسلامی میں امن و امان قائم ہو گیا جس کے نتیجہ میں امام حسن علیہ السّلام کو یہ موقع مل گیا کہ آپ پُرسکون حالات میں اسلام کی تبلیغ کر سکیں اور جہالت کے نتیجہ میں اسلامی تصورِ زندگی پر جو پردے پڑ چکے تھے ان کو دُور کر کے عربوں کے سامنے پھر ایک بار اس اسلام کو پیش کر دیں جسے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔

(۳) مرکزِ حکومت دمشق منتقل ہو جانے کی وجہ سے مدینہ سیاسی آویزشوں اور دنیاداروں کی سرگرمیوں سے بڑی حد تک پاک ہو گیا اور آلِ رسولؐ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اس بلدِ محترم میں قیام پذیر ہو کر دوبارہ اسی شہر سے اسلام کا آوازہ بلند کرے جہاں سے خود رسولِ پاکؐ نے چار دانگ عالم میں اپنی آواز پہنچائی تھی۔ امام حسن علیہ السلام نے رفتہ رفتہ مدینہ کو وہی شکل عطا کرنا شروع کی جو امیر المومنین علیہ السلام نے کوفہ کو عطا فرمائی تھی۔ اور اپنی علمی سرگرمیوں کے ذریعہ مدینہ کو ایک علمی مرکز کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

(۴) مدینہ کی مذہبی حیثیت کے پیشِ نظر ہر جگہ کے مسلمان اس شہر میں آتے تھے اور قبرِ رسولؐ کی زیارت کے بعد آلِ رسولؐ کی زیارت سے

بھی مشرف ہو تے تھے، ان مسلمانوں کے ذریعہ پوری دنیا کے اسلام میں حقیقی اسلام کی تبلیغ کا موقع حاصل کر لیا گیا۔

(۵) امام حسن علیہ السلام کی اسی تعلیم اور تبلیغ کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ عرصہ میں ایسے دیندار سرفروش اور فداکار مسلمانوں کی جماعت تیار ہوگئی جس نے کربلا کے میدان میں اپنے خون کی پاک دھاروں سے چمنستان اسلام کو بہار جاوداں عطا کر دی۔ اگر امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے جنگ بند کر کے اپنی سرگرمیاں اسلام حقیقی کی تبلیغ و اشاعت پر مرکوز نہ کر دی ہوتیں۔ تو معرکہ کرب و بلا کا وجود میں آنا ناممکن تھا۔ اگر یہ معرکہ وجود میں آتا بھی تو اس کے وہ ہمہ گیر اثرات ہرگز مرتب نہ ہوتے جو بعد میں ظہور میں آئے اس لئے کہ قربانی اسی وقت صحیح معنوں میں اثر انداز ہوتی ہے جب عوام ان بنیادی اصولوں سے متفق ہوتے ہیں جن کے لئے قربانی پیش کیجاتی ہے۔ یہ قربانی مردہ دلوں کو زندہ اور سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کر دیتی ہے۔ اسکے نتیجہ میں عوام کی عملی قوتیں جاگ پڑتی ہیں۔ اور وہ ایک بے حس، جمود پرور گروہ کے بجائے ایک زندہ، متحرک اور فعال جماعت بن جاتے ہیں ——

لیکن یہ سب کچھ تبھی ہوتا ہے، جب عوام کے ذہن ایک تصور کی صحت، ایک عقیدہ کی درستی، ایک فکر کی اصابت یا ایک نظریہ کی حقیقت کے دل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ جب عوام ایک چیز کو صحیح جانتے اور ماننے لگتے ہیں اور پھر اس چیز کے حق میں کوئی قربانی بھی پیش کر دی جاتی ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام میں ایک جوش اور ایک ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس قربانی کے نتیجہ میں پوری قوم اس تصور

کو کامیاب بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے ایسی حالت میں اگر حضرت امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ سے "مصلح" کر کے اسلام کے صحیح تصورات کو عام نہ کر دیتے تو امام حسین علیہ السلام کی قربانی قطعاً رائگان جاتی اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ضمیر ہرگز اس شان سے بیدار نہ ہوتے جس کا مظاہرہ اس عدیم النظیر قربانی کے بعد ہوا مسلمانوں نے معرکہ کربلا کے بعد جس زندگی کا مظاہرہ کیا وہ دراصل اس تبلیغ اور تعلیم کا نتیجہ تھی جو امام حسن علیہ السلام نے فرمائی تھی اور جس کے نتیجہ میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ آل رسولؐ کی تحریک اسلامی سے واقفیت کر چکا تھا۔

تحریک کے بنیادی تصورات عام ہو جانے کے نتیجہ میں مخلصین کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا جو اس تحریک کو علمی سطح سے بلند کر کے ایک عملی اور جاودانی سطح پر لانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار تھا یہی وہ جماعت تھی جس نے کربلا کے بن میں وہ عدیم المثال قربانی پیش کی جس پہ تاریخ اسلام قیامت تک ناز کرتی رہے گی۔

امام حسن علیہ السلام کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ آپ نے اسلامی تحریک کو جماعتی اور عوامی نفسیات کے مطابق ڈھال دیا۔ عصر حاضر کی تحریکات پر نظر ڈالئے تو آپ دیکھیں گے کہ وہی تحریکات کامیاب ہوتی ہیں جن کے قائدین مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کرتے ہیں :-

(۱) سب سے پہلے اس تحریک کے حق میں زمین ہموار کیجاتی ہے۔ تحریک کے بنیادی تصورات کی خوب اشاعت کیجاتی ہے۔

ان کو عوام میں مقبول بنایا جاتا ہے، عوام کے ذہنوں میں اس کی صحت و اصابت کا یقین پیدا کیا جاتا ہے۔ اور جب تحریک کے اساسی مقاصد عام ہو جاتے ہیں تو

(۲) ایسے افراد تیار کئے جاتے ہیں جو اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قربانیاں پیش کر سکیں تاکہ ان قربانیوں کے نتیجہ میں عوام میں جوش پیدا ہو جائے اور وہ تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔

امام حسن علیہ السلام نے یہی سائنٹفک طریقہ اختیار کیا اور "صلح" کے نتیجہ میں وہ مہلت حاصل کر لی جس سے فائدہ اٹھا کے ایک طرف تو آپ نے اسلامی تحریک کو عام کر دیا جو جہالت، بدامنی، غرض مندی، حرص دنیا اور اسی قسم کی چیزوں کے نتیجہ میں دب گئی تھی اور دوسری طرف مخلصین کی وہ جماعت تیار کر دی جس نے معرکہ کربلا میں اپنے خون سے اس تحریک کی جڑوں کو اتنا مضبوط کر دیا کہ انسانی حاکمیت کے تیرہ سو سال بھی آج تک حکومت الٰہیہ کے اس تصور کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جسے حسنین علیہم السلام عام کرنا چاہتے تھے!

ہم نے لفظ "صلح" کو جگہ جگہ قوسین میں لکھا ہے اس لئے کہ ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ امیر شام اور امام حسن علیہ السلام کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا وہ ہرگز "صلح" کا معاہدہ نہیں تھا اور یہ ایک انتہائی ہولناک غلط فہمی ہے جس میں یا تو مورخین خود مبتلا ہوئے ہیں یا بنی امیہ کے پروپگنڈہ نے ان کو مبتلا کر دیا ہے!

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے ہرگز صلح نہیں کی اسلیئے کہ صلح کا مقصد ہوتا ہے دلوں کا صاف ہو جانا، جنگ کا خاتمہ ہو جانا، میل ملاپ ہو جانا، دوستانہ تعلقات بحال ہو جانا، اور آپس کی آویزش کا ختم ہو جانا، لیکن دنیا کا کوئی مورخ یہ دعوٰے نہیں کر سکتا کہ امیر معاویہ اور امام حسن علیہ السلام میں صفائی ہو گئی تھی، دوستانہ فضا قائم ہو گئی تھی یا اس ٹکراؤ کا خاتمہ ہو گیا تھا جو آلِ سفیان اور آلِ رسولؐ میں مدت سے جاری تھا!

واقعہ صرف اتنا ہے کہ امام حسن علیہ السلام اور امیر معاویہ کے مابین "صلح کا معاہدہ" نہیں ہوا تھا

بلکہ

"التوائے جنگ" یا "جنگ بندی" کا معاہدہ ہوا تھا۔ جسے انگریزی زبان میں CEASE FIRE کہتے ہیں!

جنگ بندی کے اس معاہدہ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ طرفین اپنے اپنے موقف پر قائم ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کے مقابلہ میں تلواریں نہیں چلا رہے ہیں۔ التوائے جنگ کا مقصد صلح نہیں ہوتا۔ صرف تیغ و تفنگ کا استعمال ترک کر دینا ہوا کرتا ہے ——— امام حسن علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ آپ نے شمشیر و سنان کی جنگ بند کر دی تھی لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں تھے کہ آپؑ نے مطلق جنگ ہی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ آپؑ نے "گرم جنگ" کا رُخ "سرد جنگ" کی جانب موڑ دیا تھا اور رزمِ شمشیر کی جگہ "اعصابی جنگ" (COLD WAR OR WAR OF NERVES) شروع کر دی تھی ——— یہ ہے حقیقت اس معاہدہ کی جسے "صلح حسنؑ" کے

نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر نافہم لوگ جو حکمت ربانی کے مصالح کو نہیں سمجھتے یا فکر امامت کی بلند پروازیوں کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے طرح طرح کے اعتراضات کیا کرتے ہیں :

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے "صلح" کر لی ہوتی تو معمولی دیانت اور شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کبھی معاویہ کے خلاف لب کشائی نہ کرتے۔ اس کی حکومت کو جائز مان لیتے اور اس حکومت کا ساتھ دیتے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاہدہ پر دستخط کرتے ہی خود امیر معاویہ کے خیمہ میں امام حسن علیہ السلام نے جو خطبہ پڑھا۔ اس کا آغاز آپ نے ان الفاظ سے کیا کہ ______

"اَیُّھَا النَّاسُ! ہم تمہارے رسولؐ کے اہل بیت ہیں ہم تمہارے امیر اور سردار ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر نجس سے پاک کیا ہے!"

"ہم تمہارے امیر ہیں" کا دعویٰ بجائے خود یہ ثابت کر رہا ہے۔ کہ امام حسن علیہ السلام اپنے سابقہ موقف پر قائم تھے۔ اپنے حق خلافت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے، امیر معاویہ کو جائز حکمران تسلیم نہیں کرتے تھے، اور آپ نے صرف التوائے جنگ کا معاہدہ کیا تھا۔ تاکہ اب تلوار کی اس جنگ کے بجائے جس میں شکست ہو جانا لازمی تھا۔ عدم تشدد والی جنگ کا آغاز کرکے اس تدبیر سے دشمن کو شکست فاش دیدی جائے!

امیر معاویہ بھی ناسمجھ نہیں تھے، وہ یہ جانتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام نے جنگ ختم نہیں کی ہے۔ بلکہ صرف شمشیر و سنان کا مظاہرہ بند کیا ہے۔ آل رسولؐ اور بنی امیہ، حق اور باطل کے مابین صلح نہیں ہوسکی

ہے بلکہ صرف جنگ کا انداز بدل دیا گیا ہے۔ جنگ اب بھی جاری ہے، فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اب یہ جنگ تلوار سے نہیں لڑی جائے گی۔ زبان و قلم سے لڑی جائے گی۔ اس کا فیصلہ میدان حرب و ضرب میں نہیں ہوگا، سیاست اور علم کی بزم میں کیا جائے گا۔ ـــــ چنانچہ امیر معاویہ بھی غافل نہیں رہے اور انہوں نے اس "اعصابی جنگ" میں فتح حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ امیر المومنینؑ پر سب و شتم اور آل رسولؐ کے خلاف گمراہ کن پروپاگنڈہ اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھیں۔ ـــــ یہ اور بات ہے کہ امام کی عقل چونکہ عام عقول بشری سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اس لئے امیر معاویہ اس "جنگ" میں بُری طرح ہارے اور امام حسن علیہ السلام کو انکے مقابلہ میں وہ فتح مبین حاصل ہوئی جس کی وہ تاریخیں بھی گواہ ہیں جو بنی امیہ کے اثرات کے ماتحت لکھی گئی ہیں!

معاہدہ کرتے وقت امیر معاویہ نے شاید یہ محسوس کیا ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان کو یہ محسوس ہو گیا کہ ان کو سیاسی اعتبار سے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے اور امام حسن علیہ السلام نے تلوار کی جنگ روک کے ان کو ایسی زک دی ہے جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے دل کے پردوں میں جس اسلام کو مٹانے کے تمنائی تھے اس کی حسنؑ بہ اطمینان تمام تبلیغ کر رہے ہیں مسلمانوں میں بنی امیہ کی بادشاہت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ عوام میں یہ احساس بیدار ہو رہا ہے کہ ان کی قیادت و رہنمائی کا کام صرف آل رسول ہی انجام دے سکتی ہے ان کی دور بین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا کہ حسنؑ جس روش پر چل رہے ہیں اسکا

لازمی نتیجہ ایک دن دولت بنی امیہ کے زوال کی شکل میں برآمد ہوگا۔ اور آلِ رسولؐ کی تبلیغی مہم وہ بارود ثابت ہوگی جس سے بنی امیہ کے اقتدار کا محل بھک سے اڑ جائے گا۔ ـــــــ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حسنؑ نے معاہدہ کے جو شرائط رکھے ہیں ان کے نتیجہ میں جہاں آلِ رسولؐ حکومت الٰہیہ کے تصورات کو عام کرنے اور اسلام کے ملوکیت دشمن نظام زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں پورے طور پر آزاد رہے وہیں ان شرائط نے بنی امیہ کے ہاتھوں کو باندھ کے رکھ دیا ہے ان کو بے بس بنا ڈالا ہے اور ان کو کسی جوابی کاروائی کے قابل نہیں رکھا ہے۔ اس لئے کہ جب معاہدہ کی رو سے بنی امیہ علیؑ اور آلِ علیؑ پر سب و شتم نہیں کر سکتے اور علیؑ کے دوستوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تحریک اسلامی پھلتی پھولتی رہے گی۔ الٰہی نظام زندگی کی تبلیغ جاری رہے گی اور لوگ ملوکیت کے اثرات بد کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ اس خلافت ربانی کی جانب جھکتے چلے جائیں گے جس کے امام حسن علیہ السلام علمبردار تھے اس سیاسی شکست سے بچنے کے لئے امیر معاویہ اس پر مجبور ہو گئے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کریں چنانچہ شیعیان علیؑ پر جو اسلام حقیقی کے داعی اور مبلغ تھے سختیاں شروع کر دی گئیں۔ حجر بن عدی، رشید ہجری اور دوسرے ممتاز علمائے اسلام قتل کرا دیئے گئے۔ حضرت علی علیہ السلام پر سب و شتم کیا جانے لگا۔ اور جب یہ محسوس کیا گیا کہ ان تدابیر سے بھی کام نہیں نکلتا حسنؑ کی تبلیغ مملکت کو بنی امیہ کے لئے ایک کوہ آتش فشاں میں تبدیل کرتی جا رہی ہے، عوام بنی امیہ کی حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں۔ مردہ دلوں میں اسلام کی روح بیدار ہونے لگی ہے۔ اور تخت خلافت کی چولیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں

تو آخری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دیدیا جائے اور اس طرح اس دولت بنی امیہ کو تباہی سے بچا لیا جائے جسے امام حسنؑ کی تبلیغی جنگ اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتی چلی جا رہی تھی!

اگر امیر معاویہ اور امام حسن علیہ السلام میں واقعی "صلح" ہو گئی ہوتی تو امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوانے کی امیر معاویہ کو کوئی ضرورت پیش نہ آتی اور وہ بھی معاہدہ کے دس سال بعد! ——— زہر دلوانے کا یہ واقعہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ جنگ جاری تھی، صرف انداز جنگ بدل گیا تھا۔ تلواروں سے مقابلہ نہیں ہو رہا تھا عقل و دماغ کی جنگ ہو رہی تھی اور اس میں چونکہ امیر معاویہ مات کھا رہے تھے اس لئے وہ اس پر مجبور ہو گئے تھے کہ اپنے حریف کو زہر دلا کے اس کا کام تمام کرا دیں تاکہ اس شکست سے محفوظ رہ سکیں جو ان کے سر پہ منڈلا رہی تھی!

لیکن امیر معاویہ اپنی ان تدبیروں میں بھی ناکام رہے اس لئے حکومت الٰہیہ کا تصور ابھر کے رہا اور بنی امیہ کے خلاف ایسی نفرت پھیلی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف یہ کہ ان کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی نسل تک دنیا سے فنا ہو گئی بلکہ ان کی قبروں کے نشان تک محو ہو گئے۔ اور یہ سب نتیجہ تھا امیر معاویہ کی اس سیاسی غلطی کا کہ انہوں نے عین اس وقت جب کہ فتح ان کے سامنے تھی، التوائے جنگ کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور امام حسنؑ کو اس کا موقع دیدیا کہ وہ بنی امیہ کی جیتی ہوئی بازی کو الٹ کے اس اسلام دشمن جماعت کے مکمل خاتمہ کا بندوبست کر دیں!

امیر معاویہ نے اس ہولناک نتیجہ سے بچنے کے لئے معاہدہ کی خلاف ورزیاں شروع کیں۔ جس کا ایک معمولی نتیجہ یہ ہے کہ ان کو دائمی بدنامی کا

شکار ہونا پڑا۔ اور آج دنیا کے ہر انصاف پسند انسان کی نگاہ میں وہ ایک معاہدہ سے منحرف انسان ... کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام حسن علیہ السلام معاہدہ کرتے وقت اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے۔ کہ معاویہ اس کی پابندی نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھے کہ معاویہ کی جانب سے شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی تحریک اسلامی کو کمزور نہیں کر سکے گی۔ اسے مضبوط تر بنا دے گی۔ اس لئے کہ بدعہدی، مظالم، قتل، خونریزی اور سازشیں عوام کو بنی امیہ سے اور زیادہ بدظن کر دیں گی۔ اور یہ اموی تدابیر بنی امیہ کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بجائے اس کے خاتمہ کا جلد تر بندوبست کر دیں گی۔ چنانچہ وہی ہوا جو امام کا اندازہ تھا۔ امیر معاویہ نے وہی کیا جس کا امام کو علم تھا۔ اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس کی امام کو امید تھی۔ بنی امیہ کے مظالم نے چند ہی سال میں عوام کو ان کی حکومت سے متنفر کر دیا اور ان میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ مسلمانوں کی قیادت اور امارت کے حقدار صرف آل رسولؐ کے افراد ہیں —— اور یہی امیر معاویہ کی سیاسی شکست تھی!

اس معاہدہ سے امیر معاویہ کو بس ایک فائدہ ہوا، اور وہ یہ کہ ان کو حکومت مل گئی لیکن ہم اسے ان کی فتح نہیں قرار دے سکتے اس لئے کہ ان کو جن شرائط کے ساتھ حکومت ملی تھی وہی خود اس حکومت کی تخریب کا سبب تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کا مقصد اصلی یعنی اسلام کو مٹا دینا ختم ہو گیا بلکہ وہ حکومت بھی کچھ عرصہ میں ختم ہو گئی جس کے لئے امیر معاویہ نے خود اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کی تحریک کا گلا گھونٹنا قبول کر لیا تھا۔ امیر معاویہ کو بادشاہت ضرور نصیب ہوئی لیکن ایک

ایسی بادشاہت جوان کے لئے دائمی بدنامی کا تمغہ بنی اور پھر یہ حکومت بھی کتنے دن چلی۔ بیس سال امیر معاویہ حکمران رہے اور ساڑھے تین سال ان کی اولاد۔ اس کے بعد حکومت کے ساتھ ہی نسل تک کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت آلِ ابوسفیان سے نکل کے آلِ مروان میں چلی گئی۔ یہ تھا وہ فائدہ جو امیر معاویہ نے حاصل کیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی بڑی کامیابی تھی!

اب آئیے یہ دیکھیں کہ اس معاہدہ سے امام حسن علیہ السلام نے کیا کھویا؟

یہ کہنا غلط ہے کہ امام حسن علیہ السّلام نے امیر معاویہ کو "خلافت" دیدی اس لئے کہ "خلافت" ایک ایسا منصب ربانی ہے جو نہ معاہدوں سے بٹا کرتا ہے اور نہ تلواروں سے چھنا کرتا ہے۔ خلافت تقسیم ہونے والی چیز نہیں ہے۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ کو خلافت دیدی یا امیر معاویہ نے خلافت لے لی ——— امیر معاویہ کو در اصل بادشاہت حاصل ہوئی تھی اور "بادشاہت" وہ چیز تھی جس سے امام حسنؑ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی امیر معاویہ کو "بادشاہت" درکار تھی۔ اور "بادشاہت" چونکہ ایک غیر اسلامی شے ہے اس لئے امام حسن علیہ السلام نے ان کو "بادشاہت" لے لینے کی اجازت دیدی، ظاہر ہے کہ اس میں امام حسن علیہ السلام کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ بلکہ اس کے نتیجہ میں خود امیر معاویہ پر اسلام میں ملوکیت کے قیام اور نسلی بادشاہت کے آغاز کا الزام آیا ایسی حالت میں اگر امیر معاویہ "بادشاہ" بن گئے تو امام حسن علیہ السلام کا کچھ نہیں بگڑا۔ آپ کا جو منصب تھا وہ آپ کو حاصل رہا۔ چنانچہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد ہی آپ نے خود امیر معاویہ کے دربار میں ———

کہہ کر اس کی وضاحت کردی تھی کہ جہاں تک خلافت ربانی کا تعلق ہے وہ اس معاہدہ کے بعد بھی مجھے حاصل ہے اور وہ چیز جو معاویہ کو حاصل ہوئی ہے وہ دراصل بادشاہت ہے جس کا امامت یا خلافت ربانی سے کوئی تعلق نہیں ہے —— بلکہ جو اس انسانی حاکمیت کی بدترین شکل ہے۔ جسے پیغمبر اسلامؐ دنیا سے مٹا دینا چاہتے تھے!

اِس معاہدہ کے نتیجہ میں امیر معاویہ کو وہ بادشاہت حاصل ہو گئی جو جنگ جاری رہنے کی حالت میں بھی ان کو حاصل ہو جانا یقینی تھی، فرق صرف اتنا ہوتا کہ امیر معاویہ جنگ جاری رکھتے تو آل رسول قتل ہو جاتی۔ بادشاہت کو منافیٔ اسلام تصور کرنے والے ختم ہو جاتے، اسلام مٹ جاتا اور بنی امیہ ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر لیتے جس کی مخالفت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ لیکن امام حسن علیہ السلام نے التوائے جنگ کا معاہدہ کر کے ان کے ان تمام مقاصد کا خاتمہ کر دیا، اسلام کو بچا لیا، اسلام حقیقی کی تبلیغ کرنیوالوں کو بچا لیا حکومت الٰہیہ کی تبلیغ کرنے والوں کو بچا لیا۔ اور وہ جماعت پیدا کر دی جس کی قربانیوں کے نتیجہ میں معاویہ کے انتقال کے صرف ساڑھے تین سال بعد آل ابوسفیان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

ایسی حالت میں یہ معاہدہ دراصل امیر معاویہ کی بہت بڑی سیاسی شکست تھا۔ اور اس کے نتیجہ میں ان کو ایک ایسی چند روزہ بادشاہت کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوا جو خود ان کی دائمی بدنامی کا سبب بنی اور جس کے نتیجہ میں ان کی پیشانی پر اسلام میں ملوکیت اور نسلی بادشاہت قائم کرنے کے وہ داغ لگ گئے جو کبھی مٹائے نہ مٹ سکیں گے۔

اس کے برعکس اس معاہدہ سے امام حسن علیہ السلام کو یہ فائدہ ہوا کہ

(۱) اسلام کے مٹ جانے کا جو خطرہ پیدا ہوگیا تھا وہ دور ہوگیا۔

(۲) شامی لشکر عراق سے دمشق واپس ہوگیا اور مکہ و مدینہ کی تاراجی کی جو تمنائیں شامیوں کے دلوں میں تھیں وہ گھٹ کے ختم ہوگئیں

(۳) بنی امیہ کو "خلافت" کا کھلو نامل جانے کے نتیجہ میں اپنا نمائشی اسلام قائم رکھنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔

(۴) اور دنیا کے سامنے اپنی اسلامیت کے اظہار کے لئے۔ نیز یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ بھی "خلافت" کے بارگراں سنبھالنے کے لائق ہیں، بنی امیہ اس پر مجبور ہو گئے کہ غیر اسلامی ممالک پر لشکر کشی کریں، چنانچہ امیر معاویہ نے رومی سلطنت کے قلب یعنی قسطنطنیہ پر حملہ کیا، قبرص اور روڈس کینز کے علاقے فتح کیے اور سچے مسلمانوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ بحر روم کے ان علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کرسکیں۔ اس کے ساتھ ہی مسیحی طاقتوں پر جو مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہوئی تھیں مسلمانوں کا رعب داب قائم ہوگیا اور کفار کو ان لوگوں کے ہاتھوں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا جو خود دل سے اسلام کے قائل نہیں تھے!

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے مخلص خدا پرستوں کے ہاتھوں مرتدین کا خاتمہ کرایا تھا۔ اور امام حسن علیہ السلام نے بنی امیہ کے منافقین اور شام کے

نمائشی مسلمانوں کے ذریعہ مسیحی قوتوں کا زور توڑ ڈالا اور بحیرہ روم کے علاقوں میں ان لوگوں کے ذریعہ اسلام کی آواز پہنچا دی جو بدر سے لے کر صفین تک ہمیشہ اسلام کو مٹا دینے کے لئے شمشیر بکف رہے تھے۔ تدبر، دور بینی، مصلحت اندیشی اور سیاسی فکر کی بلندی کی اس سے اعلیٰ مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان منافع کثیرہ کی قیمت امام حسن علیہ السلام کو کیا ادا کرنا پڑی تو ہمارے سر امام کی عظمت فکر و وسعتِ تدبر کے سامنے بے اختیار جھک جاتے ہیں، اسلام کے دشمن بنی امیہ اور شامی عیسائیوں کو اس پر مجبور کر دینا کہ وہ اسلام دشمن مسیحی قوتوں سے ٹکرائیں اور اسلام کے لئے ممالک فتح کرتے پھریں۔ اور اس سب کی قیمت محض وہ چند روزہ بادشاہت جو دائمی بدنامی کا سبب بنے! ——— اس الٰہی سیاست اور منصوص من اللہ قیادت ہی سے ممکن ہے جس پر ہمارے آئمہ فائز تھے!

اس عظیم سیاست کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ شامیوں نے ۱۵ھ میں اپنے چہروں پر اسلام کی جو مصنوعی نقاب ڈالی تھی اسے وہ ۶۰ھ تک ڈالے رہنے پر مجبور ہو گئے، اس ۴۵ سال کے عرصہ میں ان کی وہ نسل ختم ہو گئی جس نے تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا اور اپنے دل کے پردوں میں مسیحیت کو چھپائے تھی ——— اور وہ نسل وجود میں آگئی جو بنی امیہ کی تعلیم کے نتیجہ میں آل رسولؐ کی دشمن تو ضرور تھی لیکن اسلام سے مانوس تھی، یہ صحیح ہے کہ اس کا "اسلام" عقائد و اعمال کے اعتبار سے حد درجہ پست اور سبک تھا لیکن یہ نئی نسل مسیحی نہیں

رہی تھی، غلط عقائد و افکار میں مبتلا ہونے کے باوجود مسلمان تھی اور اس قابل ہو گئی تھی کہ۔

(۱) ایک عظیم قربانی پیش کر کے اس کے ضمیر کو جھنجوڑ دیا جائے اور

(۲) پھر اس جاگے ہوئے ضمیر پر تبلیغ کا فریضہ انجام دے کے اسے سچا مسلمان بنا دیا جائے۔

اس میں سے اوّل الذکر فریضہ امام حسین علیہ السلام نے انجام دیا اور دوسرا کام بیمار کربلا نے پورا کر دیا ——— نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز "شام" اسلام کے ایک ایسے مستحکم قلعہ میں تبدیل ہو گیا جسے دنیائے مسیحیت آج تک تسخیر نہیں کر سکی اور وہ شام چودہ سو سال سے آج تک مسلمان ہے۔ جسے امیر معاویہ اسلام کی بیخ کنی کے مرکز میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

امیر المومنین ؑ نے جنگ صفین کو طول دے کر اسلام کے خلاف شامیوں کے غم و غصّہ کو بڑی حد تک فرد کر دیا تھا۔ لیکن امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو بادشاہت کا کھلونا دے کے شامیوں کی بباطن مسیحی اور بظاہر مسلمان نسل کو مسلمانوں کے مقابلہ میں مفلوج بنا دیا۔ اس مہم میں ۳۶ھ سے ۶۰ھ آگیا، پچیس سال تک آل رسول ؐ کو صبر اور استقلال سے کام لینا پڑا۔ لیکن آج اسی پچیس سال کی صبر آزما محنت اور ۶۱ھ کی قربانی کا یہ نتیجہ ہے کہ شام مسلمان ہے۔ اور وہاں آل رسول ؐ کے مزارات اسلام کی عظیم الشان کامیابی کا اعلان کر رہے ہیں!

امام حسن علیہ السلام کی شامیوں سے جنگ بادشاہت کے لیے نہیں

تھی، اسلام کے لئے تھی اور اس سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ حسن ؑ نے اپنے حسن تدبر سے اسلام کی یہ جنگ اس شان سے جیتی کہ آج تک شام پر پرچم اسلام نہایت شان سے لہراتا نظر آرہا ہے !

امام حسن علیہ السلام نے اس معاہدہ کے ذریعہ صرف یہی نہیں کہ امیر معاویہ کو اسلام اور کفر کے اس معرکہ میں پسپائی پر مجبور کر دیا جو چار سال سے صفین کی سرزمین پر جاری تھا بلکہ عقائد کی جنگ بھی بڑی خوبصورتی سے جیت لی جس پر بہت کم مورخین کی نظر جاتی ہے ۔

آپ نے معاہدہ کی سب سے پہلی شرط یہ رکھی کہ

"معاویہ کتاب اللہ اور سنت رسول ؐ کے مطابق حکومت کریگا"

اور معاویہ نے اس شرط کو قبول کر لیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ کتاب اللہ اور سیرت الرسول ؐ کے ساتھ سیرت شیخین کی وہ شرط جو عبدالرحمٰن بن عوف نے ایجاد کی تھی ۔ اور جس کی اساس پر حضرت عثمان کو خلافت عطا کی گئی تھی قطعاً غلط تھی اور یہ ایک ایسی بدعت تھی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا !

تاریخ میں امیر معاویہ کو "شیعیان عثمان" کا سرگروہ قرار دیا جاتا ہے ۔ اور آپ نے امیر المومنین ؑ کے خلاف بغاوت کا پرچم بھی قصاص خون عثمان کے نام پر بلند فرمایا تھا لیکن سیرت شیخین کی شرط اڑا دیئے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر معاویہ نے خود عملاً حضرت عثمان کی تکذیب کی اور حضرت علی ؑ کے موقف کی تائید کر دی ـــــ گویا حصول حکومت کے لئے امیر معاویہ نے اپنا مذہب بدل دیا "عثمانی نظریہ" کی جگہ علوی نظریہ قبول کر لیا اور اس طرح دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ بنی امیہ کا "ایمان" صرف اقتدار حکومت اور خزانوں پر تھا کسی اصول پر نہیں ۔

دنیائے اسلام نے امیر معاویہ کی بیعت کرکے گویا یہ اصول مان لیا کہ حکومت کی بنیاد کتاب اللہ اور سیرت رسول ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے اور سیرت شیخین کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دنیائے اسلام کے اس عملی اعتراف کے منطقی طور پر یہ نتائج مرتب ہوسکتے ہیں۔

(۱) حضرت عثمان کی خلافت باطل ہوجاتی ہے اسلئے کہ آپ کو ایک غلط اصول گڑھ کے اس کی بنیاد پر حکومت دیدی گئی تھی!

(۲) جن صحابہ نے یہ اصول وضع کیا تھا یا اسے تسلیم کیا تھا وہ ایک بدعت کے مرتکب ہوئے اس لئے ان کی عدالت کا نظریہ باطل ٹھہرتا ہے!

(۳) ملتِ اسلامیہ نے ۲۵ھ میں سیرت شیخین کے سوال پر اجماعؒ کرلیا تھا اور ۴۰ھ میں اسے ختم کردینے پر "اجماع" کرلیا۔ (جس کا ثبوت حضرت عثمان اور امیر معاویہ کی بیعت سے مل جاتا ہے۔ جو سب مسلمانوں نے کی تھی!) اس سے ظاہر ہوا کہ اجماع" کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لئے کہ جس اجماع امت کا فیصلہ پندرہ برس میں بدل جائے اسے غلطی سے ماوراء قرار دینا قطعاً منافی عقل و بصیرت ہے۔

(۴) جب اجماع کے صحیح ہونے کا اصول باطل ٹھہرا تو حضرت ابوبکر کی خلافت بھی ختم ہوگئی جسے اجماع کے سہارے جائز قرار دیا گیا تھا! ——— اور ساتھ ہی ساتھ حضرت عمر کی خلافت بھی تشریف لے گئی۔ اس لئے کہ وہ ایک غلط

اصول کے ماتحت منتخب کئے ہوئے خلیفہ کے نامزد کردہ جانشین تھے، جب نامزد کرنے والے کی حقیقت ہی ختم ہو گئی تو نامزد ہونے والے کی حقیقت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

بہر حال امام حسن علیہ السلام نے محض اس ایک شرط سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان تینوں کی خلافت کو باطل ٹھہرایا اور اس طرح مذہب حقہ کی وضاحت کا اہم دینی فرض جو آپکے فرائض امامت میں شامل تھا اس خوبی سے ادا فرما گئے کہ منافقین اور دشمنان آل رسولؐ چاہے وہ شامی ہوں اور چاہے مکی یا مدنی، اندھیرے میں رہے اور صاحبان بصیرت پر پوری حقیقت آشکار ہو گئی۔ معاویہ اور ان کے ساتھی خوش تھے کہ چلو حکومت مل گئی لیکن حسنؑ مسرور تھے کہ معاہدہ کی پہلی ہی شرط ایسی منوالی گئی کہ خود دشمنوں کے دستخط سے حق واضح ہو گیا اور مذہب کے بابؑ میں اجماع اور سیرت شیخین وغیرہ نے جو پردے ڈال دیئے تھے وہ بیک گردش قلم اُٹھ گئے!

مذہب کے باب میں امام حسنؑ کی یہ فتح مبین ناقابلِ انکار ہے!

امام حسن علیہ السلام نے اس تاریخی معاہدہ میں یہ شرط رکھ کے دنیائے اسلام پر ایک اور احسان عظیم فرمایا ہے اور وہ یہ کہ آپ نے ایک مختصر سے جملہ میں یہ بتلا دیا کہ "مسلمانوں کی حکومت" کا دستور اساسی کیا ہوتا ہے؟ اور وہ کونسی حکومت ہوتی ہے جسے "مسلمانوں کی حکومت" قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

یہ سوال مستقبل کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس لئے کہ آنے والے زمانہ میں "اسلام کی حکومت" یا "خلافتِ الٰہیہ" باقی رہنے والی نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ "مسلمانوں کی حکومتیں" وجود میں آنے والی

تھیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے "اسلام کی حکومت" کا نقشہ پیش فرمایا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام عہد عثمنی مرتبت کے بعد اسی "اسلامی حکومت" کو وجود میں لانے کی سعی وجہد میں مصروف رہے۔ پھر جب آپ کو حکومت حاصل ہوئی تو آپ نے "اسلام کی حکومت" قائم فرمائی ——— لیکن امام حسن علیہ السلام کے عہد تک دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ مسلمانوں کے نفوس بگڑ چکے تھے۔ دلوں کا عالم تہہ و بالا ہو چکا تھا، اخلاق و دیانت کے چراغ گل ہو چکے تھے اور روحانیت کے پھول مرجھا چکے تھے، ان حالات میں "اسلام کی حکومت" قائم ہونے کا موقع باقی نہیں رہا تھا، اب صرف "مسلمانوں کی حکومت" قائم ہو سکتی تھی اس لئے یہ ضروری تھا کہ دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ "مسلمانوں کی حکومت" کسے کہا جائے گا؟ آیا ہر وہ حکومت جس کا سربراہ مسلمان ہو "مسلم حکومت" کے نام سے موسوم کی جا سکے گی، یا اس حکومت کے لئے بھی کچھ قیود و شرائط ہونگے؟ ——— یہ تھا وہ سوال جسے امام حسنؑ معاہدہ کی اس شرط سے پورے طور پر واضح فرما دیا۔ اور دنیا کو بتلا دیا کہ محض مسلمان حکمران ہونا کسی حکومت کو "مسلمانوں کی حکومت" نہیں قرار دلا سکتا۔ "مسلمانوں کی حکومت" صرف وہی کہلائے گی جو کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ کی اساس پر قائم ہو!

مسلمانوں نے اس اہم نکتہ کا خیال نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہزاروں بے جا الزامات اپنے سر اوڑھ لئے۔ اپنی بدنامی اور بے عزتی قبول کر لی۔ اور مسلمان بادشاہوں کی بداعمالیوں، عیاشیوں اور مظالم کے نتیجہ میں غیر اقوام کے سامنے ذلیل ہوئے۔ وجہ صاف ظاہر ہے، مسلمانوں

نے ہر ظالم، عیاش، بدکار، نالائق، شرابی، زانی اور نا اہل حکمران کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت "قرار دے لیا، جسکے نتیجہ میں بادشاہوں کی بد اعمالیوں کی ساری ذمہ داری ملت اسلامیہ کے سر آگئی اور غیر قوموں کو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا موقع مل گیا۔ اسکے برعکس اگر پوری صفائی سے یہ کہہ دیا جاتا کہ مسلمانوں کی حکومت صرف وہ ہے، یا صرف اس حکومت کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوگی جس کا عمل کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ پر ہو۔ تو مسلمانوں پر ہرگز وہ الزامات عائد نہ ہوتے جو آج عائد کئے جاتے ہیں۔ اور ملت اسلامیہ اغیار کی نگاہوں میں اس ذلت و خواری کا نشانہ نہ بنتی جس کا نشانہ وہ آج بن رہی ہے۔

خود ہمارے برصغیر میں ہندو مسلم آویزش اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو جانے میں بڑا ہاتھ ان حرکتوں کا ہے جو مسلمان بادشاہوں سے صادر ہوئیں اور ہم نے بلا سوچے سمجھے ان بادشاہوں کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر کے ان تمام حرکتوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اگر ہم ایک ذرا عقل سے کام لیتے اور پوری جرأت سے یہ کہہ دیتے کہ یہ حکومتیں "مسلمانوں کی حکومتیں" نہیں تھیں بلکہ چند افراد یا چند خاندانوں کی حکومتیں تھیں جن کی حرکتوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے۔ تو آج ان دونوں قوموں میں جو کشیدگی نظر آتی ہے وہ ہرگز وجود میں نہ آتی، اسی طرح عرب اور ترک سلاطین کی عیش پرستیوں اور ظلم کوشیوں کے افسانوں نے یورپ کی نظر میں مسلمانوں کا وقار جس طرح برباد کیا ہے وہ نہ ہونے پاتا۔ امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی شرط اسی لئے عائد کی تھی اور اسطرح

ملّت اسلامیہ کو ایک بڑی بدنامی سے بچنے کا راستہ دکھایا تھا لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس پر اعتنا نہیں کی اور اسی کا وہ نتیجہ ہے جو آج وہ ساری دُنیا میں بھگت رہے ہیں۔

مسلمانوں نے بڑی غلطی یہ کی کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو حکومت کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ کی پابندی کرتی ہے وہ تو ہے خلافت اور جس حکومت میں ان چیزوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے وہ ہے مسلمانوں کی حکومت ——— اور یہی غلط تصور ان کی تاریخ کو داغدار بنا دینے کا سبب بنا، حقیقت یہ ہے کہ خلافت نام ہے اس الٰہی حکومت کا جس میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پیروی تو ضرور کیجاتی ہے لیکن خلیفہ وہ ماموریں اللہ بزرگ ہوتا ہے جو حفظ شریعت اور بقائے دین کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ مسلمانوں کا حکمران ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کل کائنات کا امام اور ہادی ہوتا ہے، وہ بادشاہ نہیں ہوتا تحریک اسلامی کا قائد ہوتا ہے اور اس کے دوش پر اس عالمگیر اصلاحی انقلاب کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کے ایک گوشہ سے شروع کیا تھا، وہ صرف حکمران نہیں ہوتا بلکہ دین کا داعی، اسلام کا مُبلّغ، وحدانیت کا ناشر، حکومت الٰہیہ کا پاسبان، شریعت کا امین، اسرار قرآنی کا حافظ، انسانیت کا رہبر، عوام کا ہادی اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حجت کاملہ بھی ہوا کرتا ہے۔ اور جب تک ایسا حکمران برسراقتدار نہ ہو تب تک کسی حکومت کو خلافت نہیں کہا جا سکتا، اسے اسلامی حکومت کے لقب سے موسوم نہیں کیا جا سکتا ——— نہ ہی مسلمانوں کی حکومت، تو ایسا نہیں ہے کہ جس

حکومت میں مسلمان حکمران ہوں اُسے مسلمانوں کی حکومت کہہ دیا جائے. مسلمانوں کی حکومت وہ کہلائے گی جس میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پابندی کی جائے شریعت اسلام کا پاس ولحاظ رکھا جائے اور تمام احکام وقضایا فقہ اسلامی کے مطابق جاری اور نافذ ہوں۔ جس حکومت میں یہ ہوگا اُسے مسلمانوں کی حکومت قرار دیا جائے گا۔ اور جس مملکت میں ان امور کا لحاظ نہیں ہوگا وہاں چاہے حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہوں اُسے ایک غیر مذہبی مملکت قرار دیا جائے گا. جس کے افعال کی ذمہداری مسلمانوں پہ نہیں ہوگی۔

مثال کے طور پر آج ہی کے دور میں دیکھ لیجئے کہ ترکی، مصر، انڈونیشیا شام اور دوسرے ممالک میں حکمران مسلمان ہیں لیکن ان کے انداز حکومت اور یورپی حکومتوں کے انداز حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ان کو غیر مذہبی حکومتیں کہا جائے گا اور ان کے کسی فعل کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہوگی. البتہ اگر کوئی ایسی حکومت وجود میں آجائے جہاں شرعی قوانین کا نفاذ ہو تو اُسے مسلمانوں کی حکومت مان لیا جائے گا. لیکن اسے خلافت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ مسلمانوں کی حکومت اور چیز ہے اور خلافت بالکل دوسری چیز!

امام حسن علیہ السلام نے ہمیں مسلمانوں کی حکومت کی تعریف بتلائی ہے اور یہ تعریف اتنی جامع ہے کہ آج جن مسلمان ممالک میں بھی شرعی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا جارہا ہے. وہاں اسی کتاب اللہ اور اسوۂ رسولؐ کو اساس حکومت بیان کیا جارہا ہے اور مسلمان تیرہ سو سال کے تجربات کے بعد اسی نقطہ پہ پہنچ گئے ہیں جو امام حسنؑ نے اپنے تاریخی معاہدہ کی

پہلی دفعہ میں بیان فرمایا تھا!

معاہدہ کی دوسری شرط یہ تھی کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو حاکم مقرر نہیں کرے گا۔ تاریخی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے یہ شرط بھی انتہائی اہم تھی اس لئے کہ

(۱) اگر معاہدہ میں یہ شرط نہ رکھ دی جاتی تو امام پر یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ آپ نے ایک شخص کو اختیار و اقتدار کا مالک بنا دیا جس نے اسلام میں نسلی بادشاہت کی بدعت جاری کی۔ اور امام اس مہمل الزام کو اپنی ذات پر لینے کے لئے کسی حالت میں تیار نہیں تھے۔ معاہدہ کی اس شرط نے نسلی بادشاہت کے امکانات کا خاتمہ کر دیا اور یہ حقیقت واضح کر دی کہ امام اس نسلی بادشاہت کے وجود میں آنے کے کسی حالت میں ذمہ دار نہیں ہیں جس کے آغاز کا سہرا امیر معاویہ کے سر ہے!

امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں نے تاریخ اسلام میں جو کردار انجام دیا ہے اس کے پیش نظر یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ بنی امیہ کے اس گروہ کو جس نے نسلی بادشاہت کا فتنہ کھڑا کیا، حدیث سازی کی مشینیں ایجاد کر کے حدیث اور فقہ کو برباد کیا، مکہ اور مدینہ پر حملہ کر کے حرمت کعبہ اور مسجد نبوی کی عزت برباد کی، مسلمانوں میں جہالت عام کر کے طرح طرح کے مہمل عقائد مسلمانوں میں جاری ہونے کا موقع فراہم کیا۔ آل رسولؐ پر مظالم کر کے اسلام کی تاریخ کو داغدار بنایا، مسند خلافت کو شراب نوشیوں اور عیاشیوں سے ناپاک کر کے نفس خلافت کی عزت و اہمیت کو ختم کیا اور مسلمانوں کے

دین کو دنیا کے ہاتھوں فروخت کرا دیا۔ برسر اقتدار لانے کی ذمہ داری کس پر ہے!

ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری آل رسول پر نہیں ہے اس لئے کہ ——

(۱) راس رئیس اہلبیت یعنی حضرت علی علیہ السلام کو حکومت ظاہری حاصل ہونے کے وقت امیر معاویہ شام میں مختار مطلق کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان کی سیاسی، مالی اور عسکری طاقت اتنی مضبوط تھی کہ وہ دنیائے اسلام کے مسلم الثبوت حکمران کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے!

(۲) بنی امیہ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں اتنے مالدار اور با اثر بن چکے تھے کہ یعلی بن منیہ اور عبداللہ بن عامر کی دولت اور اثرات نے حضرت عائشہ رض کو جنگ جمل پر آمادہ کر دیا۔

(۳) دنیائے اسلام میں بنی امیہ کے حامی اتنے زیادہ تھے کہ امیر معاویہ کو حربی شکست دینا محال ہو چکا تھا۔

(۴) حضرت علیؑ اور امام حسنؑ دونوں نے بنی امیہ سے متواتر جنگ جاری رکھی اور جنگ بندی کا معاہدہ صرف اسوقت کیا گیا جب پوری طرح یہ محسوس کر لیا گیا کہ بنی امیہ کے مقابلہ میں جنگ جاری رکھنے کا نتیجہ اسلام کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا!

(۵) جنگ بندی کے معاہدہ میں بھی جانشین مقرر نہ کرنے کی شرط داخل کر کے یہ کوشش کی گئی کہ بنی امیہ کے تسلط و اقتدار کو روکا جائے اور اس جماعت کو اتنے دن حکومت نہ کرنے دیا جائے کہ وہ عقائد اسلامی کی تباہی کا سبب بن سکے۔

ایسی حالت میں آلِ رسولؐ پر تو یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بنی امیہ کو مسلمانوں پر نافذ کر دیا۔ اس لئے اب یہ دیکھنا پڑیگا کہ اسلامی سیاست میں اس مہلک عنصر کو ابھارنے کی ذمہ داری کس پر آتی ہے؟ اور وہی گروہ اس نسلی بادشاہت کے قیام کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا جس نے اسلام اور اسلامی سیاست کو وہ ناقابل بیان نقصانات پہنچاتے ہیں جن کو ملت اسلامیہ آج تک بھگت رہی ہے۔ اور شاید ہمیشہ بھگتتی رہے گی!

بنی امیہ کو مسلمانوں پر نافذ کرنے اور ان کو طاقتور بنانے کی ذمہ داری جن حضرات پر ہے ان کا پتہ چلانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا جانتی ہے کہ

(۱) ابوسفیان کو سلطنت کا رکن اور مملکت کا مشیر بنانے کا پہلا فریضہ حضرت ابوبکرؓ نے انجام دیا۔

(۲) یزید بن ابوسفیان اور اس کے بعد امیر معاویہ کو شام کی حکومت حضرت عمر نے عطا کی اور موصوف ہی کے عہد سلطنت میں امیر معاویہ نے اتنی ترقی کی کہ خود خلافت مآب نے ان کو "عرب کا قیصر" کہہ کر یاد فرمایا۔

(۳) حضرت عمر کی تدبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف کی تجویز سے حضرت عثمان خلیفہ ہوئے جنہوں نے مملکت اسلامی کو بنی امیہ کی "گھریلو املاک" بنا دیا اور آپ کے ظل ہمایونی میں امیر معاویہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں صف آراء ہو گئے۔

(۴) صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت علانیہ یا در پردہ امیر معاویہ کی

حمایت کرتی رہی اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کی کامیابی کی خواہش مند رہی ۔

ایسی حالت میں دنیائے اسلام کو نسلی بادشاہت کے فتنہ میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری تمام تر ابتدائی تین خلفاء اور ان کے حامی صحابہ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے امیر معاویہ اور بنی امیہ کے قدم مضبوطی سے جما دیئے اور ان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ مسلمانوں کو شاہ پرستی کی غلامانہ رسم میں مبتلا کر جائیں ۔ امام حسن علیہ السلام اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ معاہدہ کے ذریعہ ایک اخلاقی پابندی عائد کریں اور دنیائے اسلام کو نسلی بادشاہت کے فتنہ سے آگاہ کر دیں لیکن اس شرط کے نفاذ کی کوئی طاقت امام حسن علیہ السلام کے پاس نہیں تھی ۔ ہاں اگر مسلمان جو تمام تر صحابہ و تابعین پر مشتمل تھے آزادی اور خیر پر توجہ رکھتے اور امیر معاویہ کو پاس داری پر توجہ دلاتے تو لازماً نسلی بادشاہت کے فتنہ کا سدباب ہو سکتا تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اس معاہدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے یزید کی بیعت کر لی ۔ اور کسی نے بھی امیر معاویہ کو اس بات پر نہیں ٹوکا کہ وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر رہے ہیں ۔ صرف آل رسولؐ نے اس فتنۂ عظیم پر آواز بلند کی ۔ اور کربلا کے میدان میں اپنی جانیں قربان کر کے مسلمانوں کو آنیوالے حالات کی جانب اشارہ کر دیا ۔ ورنہ جہاں تک دوسرے حضرات کا تعلق ہے انہوں نے بخوشی بنی امیہ کی نسلی بادشاہت کو قبول کر لیا اور حضرت عبداللہ بن عمر کی سی شخصیت نے تو یزید کی بیعت توڑنے والوں کے خلاف جہاد تک کی دھمکی دی جس سے اس عہد کے مسلمانوں کے رجحان کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے !

امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں یہ شرط داخل کر کے نہ صرف یہ کہ نسلی بادشاہت کا فتنہ رد کرنے کی تدبیر فرمائی بلکہ بڑی خوبصورتی سے یہ منوالیا کہ نامزدگی کا اصول غلط ہے۔ اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے اسلامی مملکت کا کوئی حکمران نامزد کر جائے۔ امیر معاویہ کا اس شرط کو قبول کر لینا حضرت عمر کی خلافت پر ایک کاری ضرب عائد کرتا ہے اس لئے کہ موصوف کا تقرر نامزدگی ہی کے ذریعہ سے عمل میں آیا تھا۔

اس معاہدہ پر دستخط کر دینے کے بعد امیر معاویہ نے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا جو اصولی اعتبار سے قطعاً غلط تھا، اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ یزید کی خلافت بھی ناجائز ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ عہد شکنی کی اساس پر جو خلافت قائم ہو اسے اصولی یا جائز نہیں کہا جا سکتا ——— اس ناجائز حکومت کے خلاف امام حسین علیہ السلام کا مجاہدہ نہ صرف یہ کہ جائز تھا بلکہ دنیائے اسلام کو ایک ناجائز حکمران سے نجات دلانا ایک اہم دینی و ملی فریضہ تھا۔ جسے امام نے انجام دیا تھا!

امیر معاویہ نے اس شرط کو مان کے بنی امیہ کے تمام حکمرانوں کی حکومت کو ناجائز اور غیر قانونی بنا دیا اور یہ سیاسی اعتبار سے ان کی ایک بہت بڑی شکست تھی!

معاہدہ کی تیسری شرط یہ تھی کہ کوفہ کے بیت المال کی ساری رقم امام حسن علیہ السلام کو ملے گی۔ یہ شرط خود امیر معاویہ کی نام نہاد خلافت پر ایک ضرب تھی اس لئے کہ کوفہ کا "بیت المال" خلافت اسلامی کا خزانہ تھا، جو مسلمانوں کا حق تھا اور اسے ایک "بادشاہ" کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ کو "خلیفہ" مانتے تو بیت المال ان کے حوالہ

کر دیتے لیکن چونکہ آپ نے امیر معاویہ کو محض " بادشاہ " تسلیم کیا تھا اس لئے آپ نے مسلمانوں کی دولت ان کے حوالہ نہیں کی بلکہ اسے خود اپنی نگرانی میں مسلمان غریبوں کو تقسیم کر دیا۔ جو بہ حیثیت خلیفہ برحق ان کا حق بھی تھا اور ان کا فرض بھی!

امام حسن علیہ السلام نے اس طرح بیت المال اور شاہی خزانہ کا فرق بھی دنیا پر واضح کر دیا اور مسلمانوں کو بتلا دیا کہ بیت المال ایک قومی امانت کا نام ہے۔ جسے اس خزانہ شاہی سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے جو شاہوں کی عیش پرستیوں، ہوس کاریوں اور جنگ اندازیوں کی نذر ہوا کرتا ہے۔ اس طرح آپ نے ملت اسلامیہ کے معاشی نظام پر ایک دور رس عمل روشنی ڈالی، اور مسلمانوں کو اس آنیوالے فتنہ سے باخبر کر دیا جو شاہ پرستی کے اقتصادی نظام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا تھا۔ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس اور سلطنت اسلامی کے زوال کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ملت کی دولت بادشاہوں اور ارکان دولت کی ذاتی ملکیت بن گئی اور ان لوگوں نے عوام کو افلاس، بھوک، جہالت اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس دولت کو اپنی عیش کوشیوں پر ضائع کر دیا۔ نظام ملوکیت کا یہی نتیجہ ہونا بھی چاہئے تھا اور امام حسن علیہ السلام مسلمانوں کو اسی آنے والی تباہی سے باخبر کر دینا چاہتے تھے۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ کوفہ کے بیت المال کی مثال مسلمان اپنے سامنے رکھیں اور یہ سمجھتے رہیں کہ سلطنت اسلامی کا خزانہ چند افراد کی ذاتی ملکیت نہیں بننا چاہئے بلکہ مسلمانوں کا ایسا مشترکہ سرمایہ قرار دیا جانا چاہئے۔ جس میں ہر مسلمان برابر کا حق دار تسلیم کیا جائے، مسلمانوں نے اس اہم سیاسی نکتہ کو نظر انداز کر دیا اور نظام ملوکیت پر ایسے ریجھے کہ

انہوں نے بیت المال کی اس اساسی اور اصولی شکل کو اپنے ذہنوں سے قطعاً محو کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا اور ملت اسلامیہ افلاس، تباہی اور پریشان حالی کا شکار ہو کر نہ صرف یہ کہ سیاسی اور عسکری حیثیت سے ختم ہو گئی بلکہ علمی، ادبی، ذہنی اور فکری میدانوں میں بھی پس ماندہ اور حقیر بن گئی۔ آلِ رسولؐ نے مسلمانوں کو مستقبل کی اس تباہی سے باخبر کرنے کی ہر امکانی سعی کی، چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں یہ شرط رکھی اور امام حسین علیہ السلام نے میدان کربلا، کے خطبات میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ۔

"بیت المال کو ذاتی املاک بنا لیا گیا ہے!"

لیکن مسلمانوں نے نہ تو معاہدہ کے مصلحت آفرین اشارہ کو سمجھا اور نہ مظلوم کربلا کی تقریروں سے متاثر ہوئے ——— اور اس کا جو نتیجہ نکلا ملوکیت کے اقتصادی نظام نے مسلمانوں کو افلاس اور تباہی کا جو روز بد دکھایا اور قومی دولت کے اتلاف کا جو نتیجہ مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

معاہدہ کے مالی شرائط میں ایک شرط یہ بھی رکھی گئی کہ ایران کے ایک صوبہ کا خراج امام حسنؑ کو ملتا رہے اس شرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کی توجہ آلِ رسولؐ پر مرکوز ہو گئی اور آج اسی کا یہ ثمرہ ہے کہ ایران آلِ رسولؐ کے شیدائیوں سے چھلکتا نظر آرہا ہے۔

امام حسن علیہ السلام کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی اس لئے کہ اوّل تو آپ اپنی تبلیغی مہم کے لئے روپیہ درکار تھا، دوسرے مدینہ سے مرکز حکومت منتقل ہو جانے کے نتیجہ میں یہ اندیشہ تھا کہ غریب اصحاب رسولؐ

مدینہ سے دوسرے شہروں کی جانب ہجرت کرنے لگیں گے اور اس طرح وہ جماعت منتشر ہو جائے گی جس نے زبان فیض ترجمان رسالت سے دین کی تعلیم حاصل کی تھی، جہاں تک امرائے مدینہ کا تعلق تھا، زر اندوزی اور حرص کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اپنا دینی جذبہ کھو چکے تھے۔ اور اموی خزانہ ان کو آسانی سے خرید سکتا تھا لیکن غریب اور پسماندہ طبقہ کے دل میں اب بھی دین کی سچی محبت موجود تھی اور اسی کے سہارے رسول اللہ کی تعلیم کی اشاعت ہو سکتی تھی۔ امام حسن علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ اگر یہ طبقہ افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر منتشر ہو گیا تو تفسیر، حدیث اور فقہ کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور بنی امیہ دین کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ آپ اہل مدینہ کے اس طبقہ کے آذوقہ کا بندوبست کر دیں تاکہ وہ غریب اصحاب پیغمبر جو اموی دولت پر اپنے دین کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھے مدینہ میں موجود رہیں اور ان کی مدد سے دین حق کی تبلیغ و اشاعت کا کام پورا ہوتا رہے۔ امام یہ جانتے تھے کہ بنی امیہ کی تلواریں اور ان کا جابرانہ انداز لوگوں کو آل رسول ؐ سے دین حاصل کرنے سے روک دے گا اور حکومت وقت یہ چاہے گی کہ عوام یا تو جاہل رہیں ورنہ آل رسول ؐ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے علم حاصل کریں، یہ لوگ دو حصوں میں منقسم تھے ایک تو وہ طبقہ تھا جسے بنی امیہ نے خرید لیا تھا، یہ جھوٹی حدیثیں گڑھ کے دین کو برباد کرنے والا تھا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو اپنے دین کو دنیا کے ہاتھوں فروخت کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس لئے اس طبقہ کے ذریعہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم کی اشاعت ہو سکتی تھی۔ امام نے اس موخر الذکر طبقہ کو مضبوط بنا دینے پر پوری توجہ کی اور اس کو منتشر ہونے

سے بچا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی علوم کی بربادی کا جو خدشہ پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو گیا۔

امام حسن علیہ السلام کے دسترخوان کی وسعت بہت مشہور ہے لیکن بہت کم آدمیوں نے اس پر غور کیا ہے کہ امام حسنؑ کے سے زہد پرور امام کو اس وسیع دسترخوان کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اسے محض فیاضی قرار دیا جائے تو دوسرے آئمہ نے اس قسم کی فیاضی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟ امیر المومنینؑ نے اپنا دسترخوان کیوں وسیع نہ رکھا؟ اور آل رسولؐ میں صرف امام حسن علیہ السلام نے اس قسم کی فیاضی کا کیوں مظاہرہ فرمایا؟ ——
بات دراصل یہ ہے کہ امامؑ کو غریب مگر ایماندار صحابہ رسولؐ کی پرورش مقصود تھی تاکہ یہ لوگ مدینہ چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائیں اور ان کی مدد سے رسول اللہؐ کے پیغام کی اشاعت ہوتی رہے۔ امام حسن علیہ السلام اپنی اس تدبیر میں کامیاب رہے اور آپ نے مرکز حکومت دمشق منتقل ہو جانے کے باوجود مدینہ کو اجڑنے نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علوم اسلامی کا ذخیرہ بڑی حد تک محفوظ رہا اور دسترخوان کی وسعت نے ان غریب صحابہ کے قدم مدینہ میں جمے رکھے جنہوں نے دین کی تعلیم لسان فیض ترجمان رسالت سے حاصل کی تھی۔

دنیا مانے یا نہ مانے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں دمشق سے بدعتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے اور بنی امیہ کے زرخرید بندگان دنیا جھوٹی حدیثوں اور جھوٹے فتاوے کے انبار لگا رہے تھے وہیں حسنؑ کی صلح کے نتیجہ میں اسلامی دنیا میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو رسولؐ اللہ کی سچی تعلیمات کو اپنے کلیجہ سے لگائے اسلام کو بنی امیہ کی تاخت سے

محفوظ رکھنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھا، اور آج یہ اسی طبقہ کا جسے امام حسنؑ نے روزی کی جانب سے مطمئن کر رکھا تھا، طفیل ہے کہ ہمارے پاس احادیث صحیحہ کا وہ گنج گرانمایہ موجود ہے جسے بنی امیہ تباہ کر دینے پر تلے ہوئے تھے!

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ زمانہ وہ تھا جب آل رسول سے براہ راست حدیث حاصل کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اس لئے آل رسول کو قطعاً اس کی ضرورت تھی کہ ایسے ایماندار لوگوں کی ایک جماعت مدینہ میں باقی رکھی جائے جو پیغام رسالت کی تبلیغ کرتے رہیں ان میں وہ صحابہ بھی تھے جو پوری دیانت داری سے لوگوں کو وہ چیزیں سُنا دیا کرتے تھے جو انہوں نے خود رسول اللہؐ سے سُنی تھیں اور وہ تابعین بھی تھے جو حدیث لیتے تو آل رسول سے تھے، لیکن مصلحت وقت کے پیش نظر اسے کسی دوسرے شخص سے منسوب کر کے امت تک پہنچا دیتے تھے، اور اس طرح حق دنیا پر آشکار ہوتا رہتا تھا۔ حسنؒ بصری نے اس راز کو یہ کہہ کر ہم پر آشکار کیا ہے کہ "میں نے جو احادیث حضرت علیؑ سے سُنی ہیں ان کو میں براہ راست رسول اللہؐ سے نقل کر دیتا ہوں" حسنؒ بصری کا یہ انکشاف ہمیں نہ صرف یہ کہ اس زمانہ کی اصل حالت سے باخبر کرتا ہے بلکہ امام حسن علیہ السلام کے دسترخوان کی وسعت کا راز بھی ہم پر ظاہر کر دیتا ہے اور ہمیں بتلاتا ہے کہ کس طرح اس پرآشوب دور میں آل رسولؐ صحابہ و تابعین کے غریب مگر ایماندار افراد کے ذریعہ دنیا تک پیغام حق پہنچاتی رہی ہے؟ ——— کون جانے کہ حسنؒ بصری کی طرح کتنوں نے آل رسولؐ سے احادیث اور احکام فقہ حاصل کئے ہوں گے اور اپنے نام سے دنیا تک

پہنچائے ہونگے!

امام حسن علیہ السلام کو اپنے نام کی ضرورت نہیں تھی، حق کی اشاعت کی ضرورت تھی، اور اگر یہ مقصد اس طرح پورا ہوتا تھا کہ حسنؑ کا نام آئے بغیر رسولؐ اللہ کی احادیث اور آپکے احکام امت تک پہنچ جائیں تو اس سے زیادہ بے لوث تبلیغ اور کیا ہو سکتی تھی۔

دسترخوان کی وسعت سے ایک دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ سے جو زائرین مدینہ آتے تھے وہ امامؑ کے مہمان ہوتے تھے۔ ان پر دین کے حقائق پیش کئے جاتے تھے اور پھر ان کے ذریعہ سے دور دراز علاقوں تک حق کی آواز پہنچائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس تبلیغی مہم کو منظم کرنے کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی اور یہ سرمایہ فراہم کرنے کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ معاویہ سے روپیہ لے کر اسی روپیہ سے اموی نفاق کی بنیادیں کھوکھلی اور اسلام کی دیواریں مضبوط کر دی جائیں!

معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ امیرالمومنینؑ پر سب وشتم نہیں کیا جائے گا۔ اس شرط کے پہلو تھے۔ ایک سلبی اور دوسرا ایجابی۔ اور دونوں پہلو امام حسن علیہ السلام کے لئے مفید تھے اور بنی امیہ کے لئے تباہ کن!

اگر امیر معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے سلاطین معاہدہ کی اس شرط کی پابندی کرتے تو وہ قرآن اور حدیث کے فرامین سے مجبور ہو کر نہ سہی، ایک سیاسی معاہدہ سے ہی مجبور ہو کر، آل رسولؐ کا احترام کرتے اور اس طرح دین کے ایک اہم رکن کو مان لیتے۔ یہ آل رسولؐ اور اسلام کی ایک اہم اصولی فتح ہوتی اور بنی امیہ اس دین کے سامنے سر جھکانے پر مجبور

ہوتے جسے وہ مٹا دینا چاہتے تھے، آلِ رسولؐ کے خلاف ان کا معاندانہ پروپا گنڈہ بند ہو جاتا۔ اور آلِ رسولؐ کو اس کا موقع مل جاتا کہ فراغت اور اطمینان کے ساتھ دینِ مبین کی اشاعت کر سکیں، یہ معاملہ کا ایجابی رخ تھا کیونکہ دراصل معاہدہ کے روپ میں معاویہ کے سامنے دین پیش کیا جا رہا تھا جو آلِ رسولؐ کی حکمت آفرین تبلیغ کا ایک شاہکار تھا، لیکن اس ایجابی رخ کے ساتھ معاملہ کا ایک سلبی پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ اگر معاویہ نے اس شرط پر عمل نہ کیا تو ———

(۱) آلِ رسولؐ پر سب وشتم کرنے کے نتیجہ میں جہاں ان پر دین سے خارج ہو جانے کا الزام عائد ہو گا وہیں معاہدہ کی خلاف ورزی ان کی اخلاق پستی اور ان کے کردار کی دنائت کو عالم آشکار کر دے گی۔

(۲) مسلمانوں کے چوتھے مسلّم الثبوت خلیفہ پر سب وشتم کرنے والے بنی امیہ اور ان کے حامیان مسلمانوں کے اس زمرہ میں بھی شامل نہیں کئے جا سکیں گے جو حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتا ہے!

(۳) حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ ماننے والے مسلمانوں کے لئے اصولاً یہ جائز یا ممکن نہیں رہے گا کہ وہ معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے سلاطین کو خلیفہ مفترض الطاعۃ مانیں اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسی بے اصولی ہو گی جسے وہ عقل ومنطق کے کسی اصول سے جائز قرار نہیں دے سکیں گے۔

(۴) جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اس فعل قبیح میں شریک ہوں گے

یا اس پر خاموش رہیں گے ان کی " عدالت " کا پول دنیا پر کھل جائے گا۔ اور ارباب بصیرت پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ لوگ یا تو حرص دنیا میں اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ محض بنی امیہ کی خوشنودی خاطر کے لئے رسولؐ اسلام کے گھرانے کی توہین و تذلیل کرنے پر تیار رہتے یا پھر اتنے بزدل تھے کہ امویوں کے خوف سے اس گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے تھے اور یا پھر خود ان کے دلوں میں خانوادۂ رسولؐ کے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا تھا کہ جیسے ہی ان کو موقع ملا، وہ آل رسولؐ پر سب و شتم کے لئے تیار ہو گئے۔ ان تینوں صورتوں میں نہ صرف یہ کہ ان کی عدالت تشریف لے جاتی ہے بلکہ صحابہ پر بلا تمیز نیک و بد " ایمان رکھنے کا اصول ہی ختم ہو جاتا ہے۔

(۵) امام حسن علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ مستقبل میں امیر معاویہ کو خلیفۂ برحق سے جنگ کے جرم سے بچانے کے لئے ان کے چہرہ پر " خطائے اجتہادی " کی نقاب ڈال دی جائے گی۔ اور اس طرح ان کو بے خطا ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن معاہدہ کی اس شرط نے اس نقاب کو تار تار کر ڈالا۔ اس لئے کہ اگر امیر المومنینؑ پر معاویہ کا خروج خطائے اجتہادی مان بھی لیا جائے تب بھی معاہدہ کے بعد امیر المومنینؑ پر سب و شتم کیا جاتا خطائے اجتہادی یا نادانی کی غلطی نہیں کہا جا سکتا ——— بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عظیم عہد شکنی کے بعد معاویہ کو " مجتہد " قرار دینا ہی ناممکن ہو

جاتا ہے۔ کیونکہ عہد شکنی کا گناہ کبیرہ ان کی "عدالت" کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اور جو شخص "عادل" نہ ہو اُسے کسی حالت میں مجتہد نہیں کہا جا سکتا ——— ظاہر ہے کہ جب معاویہ مجتہد ہی نہیں تھے تو ان کو "خطائے اجتہادی" کے دامن میں پناہ نہیں دی جا سکتی اور امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں یہ شرط داخل کر کے حامیان بنی امیہ سے ان کی آخری آڑ یا سپر بھی چھین لی اور معاویہ کے گناہوں پہ اجتہاد کا جو پردہ ڈالا جانے والا تھا اسے تار تار کر کے پھینک دیا۔

(۶) بنی امیہ کو چونکہ اس معاہدہ کی بنیاد پر حکومت حاصل ہوئی تھی اس لئے معاہدہ کی پابندی نہ کرنے کی حالت میں اصولاً اور قانوناً ان کو حکومت کرنے کا حق باقی نہیں رہا۔ ان کی حکومت غیر قانونی ہو گئی۔ اس لئے اس حکومت سے عدم تعاون یا اُسے ختم کر دینے کی ہر کوشش جائز ہو گئی اور اس حکومت سے تعاون یا اس کی بیعت حرام ہو گئی!

معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا ان سے نہ کوئی مواخذہ کیا جائیگا اور نہ ان کو سزا دی جائے گی۔ امیر معاویہ نے اس شرط کی بھی پابندی نہیں کی اور حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگین کر لئے۔ ان کے علاوہ دوسرے موالیان امیر المومنینؑ پر طرح طرح کے مظالم کئے گئے۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ معاویہ پر ظلم و خونریزی کا الزام عائد ہوا بلکہ یہ جرم اس اعتبار سے اور زیادہ گھناؤنا اور قابل مواخذہ ہو گیا کہ یہ سب مظالم ایک اہم دستاویزی معاہدہ کی

خلاف ورزی کرتے ہوئے کئے گئے تھے۔ اور اس اعتبار سے معاویہ کا کردار تاریخ میں اتنا پست ہو گیا کہ آنے والی نسلیں معاویہ اور ان کے بعد والے بنی امیہ کی " بیعت خلافت " کرنے کے باوجود یہ ہمت نہ کر سکیں کہ ان کو " علیٰ منہاج النبوۃ " والی خلافت میں شامل کر سکیں اور بنی امیہ کی حدیث سازی کے باوجود امت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ " خلافت راشدہ " حسنؑ پر ختم ہو گئی، اس کے بعد جو " خلافت " وجود میں آئی وہ " ملک عضوض " کی بادشاہت تھی!

امام حسن علیہ السلام اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ معاویہ معاہدہ کی پابندی نہیں کریں گے آپ معاویہ کی سیرت اور ان کے کردار سے بخوبی واقف تھے اور آپ نے کوئی دھوکا نہیں کھایا، آپ نے جو کچھ کیا خوب سوچ سمجھ کے کیا اور ایک ایسا معاہدہ ترتیب دیا جس کی ہر دفعہ آپ کی سیاسی بصیرت اور کامرانی کا ثبوت تھی اس معاہدہ کی ہر شرط معاویہ اور بنی امیہ کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے چہروں پر پڑی ہوئی ساری نقابیں الٹ گئیں۔ بنی امیہ امت اور تاریخ کے دربار میں پابہ زنجیر قیدیوں کی حیثیت سے کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے عقائد و افکار سے دنیا روشناس ہو گئی، ان کی سیرت کے جو نقوش اب تک دھندلے تھے وہ روشن ہو کر امت کے سامنے آ گئے، اور آل رسولؐ نے محض ایک ایسی تحریر سے، ایک ایسی دستاویز سے، جس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ اپنی حقانیت اور اپنے مخالفین کی باطل نوازی کے ایسے انمٹ نقوش دنیا کے سامنے پیش کر دیئے جن سے ارباب بصیرت کو ہمیشہ کے لئے حق کی تلاش آسان ہو گئی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا

ہمیشہ کے لئے واضح ہو گیا!

بعض کم فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے دھوکا کھایا اور ایک ایسے معاہدہ کی بنیاد پر حکومت چھوڑ دی جس پر عمل نہیں کیا گیا، ان کے خیال میں معاویہ نے امام کو سیاسی طور پر زک دیدی۔ اس لئے کہ اس نے حکومت بھی لے لی۔ اور معاہدہ پر عمل بھی نہیں کیا اور اس اعتبار سے معاویہ امام کے مقابلہ میں زیادہ صاحب عقل اور زیادہ بڑا سیاستدان ثابت ہوا —— لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس معاہدہ نے الٹا یہ ثابت کر دیا کہ معاویہ کی عقل و سیاست کے سارے افسانے غلط ہیں۔ اس میں نہ عقل تھی نہ سیاست، بلکہ صرف وہ معمولی درجہ کا سیاستدان تھا .... جسے سیاست کے اعلیٰ ایوان میں جگہ دینا خود لفظ سیاست کی توہین کرنا ہے!

معاویہ کی عقلی اور سیاسی بے بصیرتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ:-

(۱) جب جنگ میں اس کی فتح یقینی ہو چکی تھی تو اس نے صلح کر لی۔

(۲) جنگ جاری رکھ کے وہ خانوادہ نبوت کا خاتمہ کر سکتا تھا جو اس کا مقصد اصلی تھا لیکن صلح سے اس کا یہ مقصد فوت ہو گیا، آل رسول باقی رہی اور صرف باقی ہی نہیں رہی بلکہ دنیائے اسلام پر اس کا اثر اس حد تک قائم رہا کہ آج بھی دنیا کا ہر مسلمان مودت اہل بیت کو جزو ایمان تسلیم کرتا ہے۔

(۳) اس نے صلح کے نتیجہ میں وہ حکومت حاصل کی جسے خود حامیان بنی امیہ بھی خلافت راشدہ میں شامل نہیں کرتے بلکہ اُسے آغاز

ملوکیت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

(۴) اس پر اسلام میں نسلی بادشاہت قائم کرنے کا الزام عائد ہوا جس کے لیے مسلمان اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔

(۵) اس پر عہد سلطنت ظلم اور خونریزی کے وہ الزامات عائد ہوتے جو قیامت تک دور نہیں ہو سکتے اور جن کے نتیجہ میں پوری تاریخ بنی امیہ اتنی داغدار ہو گئی ہے کہ دنیا کا کوئی سنجیدہ مسلمان اس پر اظہار نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۶) اس نے عملاً تیسرے خلیفہ کی بیعت کو ناجائز تسلیم کیا اور در پردہ ابتدائی تینوں خلافتوں کا چہرہ داغدار بنا دیا۔

(۷) اس نے اپنے لئے دائمی بدنامی کا وہ لبادہ خرید لیا جس پر جھوٹی حدیثوں کا انبار بھی پردہ نہیں ڈال سکا۔

(۸) اس نے ہر مسلمان کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اس سے اظہار برات کرے۔ کیونکہ جو مسلمان ایسا نہیں کرتا وہ اسلام کے چوتھے خلیفہ پر سب و شتم جائز قرار دے کے خود دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

(۹) معاہدہ کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں خود اس کی اور تمام بنی امیہ کی حکومت غیر قانونی اور غیر اصولی ہو گئی جس کی بیعت کرنا بھی مسلمانوں کے لئے غلط ہو گیا۔

(۱۰) ایک غیر قانونی، غیر اسلامی اور ناجائز حکومت کے مقابلہ میں امام حسین علیہ السلام کا جہاد قطعاً جائز ہو گیا اور

بنی امیہ اپنے پروپاگنڈہ کی ساری قوتوں کے باوجود
اسے "خلیفہ پر خروج" قرار دینے میں کامیاب نہیں
ہو سکے۔

(۱۱) مسئلہ خلافت کے باب میں امیرالمومنین علیہ السلام کا موقف
بالکل صحیح ثابت ہو گیا۔

(۱۲) آل رسول کو تبلیغ اسلام کا پورا موقع ہاتھ آگیا اور اسلام کو
مٹا دینے کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔

(۱۳) عام مسلمانوں کو بنی امیہ کی حکومت سے یہ احساس پیدا ہو گیا
کہ خلافت کے باب میں ان کے وضع کردہ سارے اصول
غلط ثابت ہوئے۔

(۱۴) صحابہ پرستی کا طلسم پاش پاش ہو گیا۔ اس لئے کہ بنی امیہ اور
ان کے حامی صحابہ و تابعین کے کردار نے یہ حقیقت واضح کر دی۔
کہ بلا تمیز نیک و بد ہر صحابی کو حامل عدالت قرار دینا غلط ہے۔

امیر معاویہ اگر واقعی اتنے ہی عقلمند اور سیاستدان ہوتے جتنے کہ مشہور
کئے جاتے ہیں تو وہ ہرگز یہ معاہدہ کر کے ان نقصانات کا شکار نہ ہوتے
ان کا امام حسنؑ سے معاہدہ کر لینا ان کے سیاسی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے۔
اور دنیا کا ہر غیر جانبدار شخص جو تعصب اور اسلاف پرستی کا شکار نہ ہو یہ
تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ امیر معاویہ صلح، سیاست اور دماغ کی جنگ بری
طرح ہار گئے اس لئے کہ ان کو اس معاہدہ کے نتیجہ میں سوا اس کے اور کچھ
حاصل نہیں ہوا کہ چند روزہ حکومت حاصل ہو گئی اور اس حکومت کی
قیمت ان کو ایسی دائمی بدنامی کی شکل میں ادا کرنا پڑی کہ جس پر

ہر شریف النفس انسان شرم محسوس کرنے پر مجبور ہے!

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے جنگ بند کر دینے کے بعد مدینہ کو اپنا مستقر قرار دیا اور تبلیغ و اشاعت دین کی مہم میں مصروف ہو گئے، ملت اسلامیہ کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ امام کی زندگی کے اس انتہائی اہم دور کے حالات تاریخوں میں بہت کم ملتے ہیں اور شیعہ رواۃ نے بھی ان حالات کو جمع کرنے پر بہت کم توجہ دی ہے اس کے کئی اسباب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ امام حسن علیہ السلام کی یہ زندگی رسول اللہ کی مکی زندگی کے مانند سیاسی اعتبار سے بہت خاموش گذری۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی تاریخیں صرف سلاطین کی داستانیں ہیں جن میں امام حسن علیہ السلام کے تبلیغی مجاہدات کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی، تیسرے یہ کہ مورخین میں چونکہ خود ہی سیاسی بصیرت بہت کم تھی اس لئے وہ اس معاہدہ کو امام حسن علیہ السلام کی مکمل شکست کا مظہر سمجھے، اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ معاہدہ کے بعد امام نے باقی زندگی ایک ناکام و نامراد انسان کی حیثیت سے حسرت و اندوہ میں گذار دی ہو گی اس لئے ان کو اس عہد کی تفصیلات معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ———— رہے شیعہ رواۃ، تو ان کی دلچسپی کا مرکز زیادہ تر وہ روایات رہیں جن سے تفسیر، فقہ یا مناظرہ میں مدد ملتی تھی اور امام حسن علیہ السلام کی زندگی میں چونکہ ان کو ایسی چیزیں بہت کم ملتی تھیں اس لئے انہوں نے بھی امام کے حالات جمع کرنے کی پوری کوشش نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے ورثہ دار تھے اور اس اعتبار سے آپ

ساری توجہ دین کے ان اہم اصولوں کی تبلیغ و اشاعت پر مرکوز تھی جن کے فنا ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، یہ وقت فقہ کے جزئی مسائل بیان کرنے کا نہیں تھا بلکہ اصول اسلام کو بنی امیہ کی تاخت سے محفوظ رکھنے کا تھا، اس عظیم جنگ کی تیاریوں کا تھا جو کربلا کے میدان میں لڑی جانے والی تھی، مسلمانوں کو اس "حق" سے آشنا کرنے کا تھا جس پر باطل نے گہرے غلاف ڈال دیئے تھے اور اس پُرآشوب دور میں اسلام کو محفوظ رکھنے کا تھا، جب ایک طرف تو بنی امیہ کے خوف سے مسلمان آل رسولؐ کے قریب آنے گھبراتے تھے اور دوسری طرف اموی پروپاگنڈہ ان کو جہالت اور گمراہیوں کی ہولناک ظلمت میں دھکیل دینے پر تلا ہوا تھا۔ یہ وہ وقت جب انتہائی خاموشی اور رازداری سے کام لینے کی ضرورت تھی، جب ایک ذراسی غلطی آل رسول کی موت اور اسلام کی فنا کا سبب بن سکتی تھی۔ جب ایک ذرا سا بہانہ شامی عیسائیوں اور اموی دشمنان اسلام کو مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کی دعوت دے سکتا تھا اور جب اسلام کے لئے شاید اس سے بھی زیادہ کٹھن وقت تھا جس کا مقابلہ پیغمبر اسلامؐ کو مکی زندگی میں کرنا پڑا تھا، اس لئے کہ رسولؐ کے مقابلہ میں تو محض شیوخ قریش تھے جو اسلام کو ایک نوخیز اور معمولی سی تحریک تصور کرتے ہوئے اس کے مقابلہ میں اپنی پوری قوتیں صرف نہیں کرتے تھے، لیکن اب مقابلہ ایک منظم اور طاقتور حکومت سے تھا اور یہ حکومت بھی ان لوگوں کی تھی جو اسلام کی توانائیوں کا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لئے اگر یہ لوگ یہ محسوس کر لیتے کہ مدینہ کو اسلام کی حیاتِ نو کا گہوارہ بنایا جا رہا ہے اور حسینؑ کی تحریک ان کو پھر ایک بار دینی روزِ بدر

دکھائے گی جس کا تجربہ وہ رسولؐ کی مدنی زندگی میں کر چکے تھے تو یہ لوگ حکومت کی ساری قوتیں امام حسنؑ اور ان کے رفقائے کار کے خلاف استعمال میں لے آتے اور اس کے نتیجہ میں اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایسی حالت میں امام حسن علیہ السلام کو تلوار کی دھار پر رہتے ہوئے تبلیغ کا کام انجام دینا تھا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے یہ فریضہ اس خوب صورتی سے انجام دیا کہ دشمن کو آپ کے خلاف اقدام کرنے کا بہانہ بھی نہیں ملا اور اس اسلام حقیقی کی تبلیغ بھی ہوتی رہی جسے بنی امیہ مٹا دینا چاہتے تھے!

ہم یہ بات کسی حسن عقیدت کے نتیجہ میں عرض نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا ثبوت معاویہ کی جانب سے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا دیا جانا ہے۔

زہر خورانی کا یہ واقعہ معاہدہ کے دس سال بعد وجود میں آیا جبکہ اس دس سال کے دوران میں امام حسنؑ کی جانب سے بظاہر کوئی ایسی حرکت ظہور میں نہیں آئی جس سے امیر معاویہ کو کوئی شکایت ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ پھر امیر معاویہ کو اس کی کیا وجہ تھی کہ وہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا دیتے؟

امیر معاویہ پاگل نہیں تھے کہ بلا وجہ اتنا بڑا اقدام کر کے اپنے سر دائمی بدنامی لے لیتے! اگر یہ کہا جائے کہ خانوادۂ رسالت کی دشمنی کے نتیجہ میں وہ اس فعل کے مرتکب ہوئے تو دس سال تک وہ کیوں خاموش رہے؟ اور پھر صرف امام حسن علیہ السلام کو زہر کیوں دلوایا گیا؟ بنی ہاشم کے دوسرے افراد کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ امام حسین علیہ السلام اس واقعہ کے دس سال بعد تک زندہ رہے آپ پر معاویہ نے حملہ کیوں نہیں کیا؟

ظاہر ہے کہ دس سال کی خاموشی کے بعد امیر معاویہ کا امام حسن علیہ السلام کے درپے ہو جانا محض خاندانی دشمنی کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر صرف خاندانی دشمنی اس کی محرک ہوتی تو دس سال کے انتظار کی کوئی وجہ نہیں تھی اور صرف امام حسن علیہ السلام کو شہید کر دینے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ امیر معاویہ کے اس اقدام کی وجہ کچھ اور تھی!

امیر معاویہ کو حکومت حاصل ہو جانے کے بعد امام حسن علیہ السلام سے تنازعہ کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی اور چونکہ امام علیہ السلام کسی سیاسی معاملہ میں حصہ نہیں لے رہے تھے، اموی حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر رہے تھے، بنی امیہ کے حکومتی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے امیر معاویہ اپنی جگہ مطمئن ہو گئے تھے، امیر معاویہ دنیا دار آدمی تھے اور آلِ رسولؐ کو بھی عام دنیادار انسانوں کی طرح سمجھتے تھے، انہوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ آلِ رسولؐ ان کے سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں کر رہی ہے تو یہ سمجھ بیٹھے کہ خانوادۂ رسالتؐ کی ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ اس کا عزم شکستہ ہو گیا ہے۔ اور اب اس کی جانب سے بنی امیہ کے اقتدار کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں ہے، رہا مذہبی معاملہ، تو امیر معاویہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے نزدیک اسلام کی تحریک صرف حصولِ حکومت کا ایک بہانہ تھی چنانچہ آپ کے والد کا حضرت حمزہ کی قبر پہ ٹھوکر مار کے یہ فرمانا کہ۔

" کیوں اے بنی ہاشم! تم نے اسی حکومت کیلئے ہم سے تنازعہ کیا تھا، اب دیکھ کہ امیہ کے فرزند اس

کس طرح کھیل رہے ہیں!"

یا آپ کے فرزند یزید کا سر امام حسین علیہ السلام دیکھ کے یہ ارشاد کہ

"نہ کوئی وحی آئی نہ کوئی پیغام آتا۔ یہ تو ایک ڈھونگ تھا جو بنی ہاشم نے حکومت حاصل کرنے کے لئے رچایا تھا۔"

اس امر کا ثبوت ہے کہ امیر معاویہ اور آپ کے رفقاء کی نظر میں اسلام محض حصول حکومت کا ایک بہانہ تھا، اور یہ ایک کھیل تھا جو معاذ اللہ خاتم بدہن رسول نے کھیلا تھا تاکہ اس ترکیب سے ان کو اور ان کے افراد خاندان کو عرب کی تاجداری حاصل ہو جائے۔ امام حسن علیہ السلام کی ظاہری خاموشی اور سیاسی مسائل سے آپ کی بے تعلقی دیکھ کے امیر معاویہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب آل رسول نے "تمنائے حکومت" ترک کر دی ہے، اور چونکہ اسلام اسی "تمنائے حکومت" کا دوسرا نام تھا۔ اس لئے اسلام بھی لب گور ہے ——— اس مہمل اور احمقانہ تصور نے امیر معاویہ کو امام حسن علیہ السلام کی جانب سے مطمئن کر دیا تھا لیکن چند ہی سال میں انہوں نے دیکھا کہ حسنؑ اسلام کو زندہ کرنے اور اس کے کمزور جسم میں زندگی کا لہو دوڑانے میں مصروف ہیں۔ آل رسولؐ کی تبلیغی مہم رفتہ رفتہ کامیاب ہوتی جا رہی ہے، حدیث سازی، منبروں پر سب وشتم اور اسی قسم کی تدابیر کے باوجود عوام کے ذہن اور ان کے قلب آل رسولؐ کی جانب مڑتے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ عربی یا اموی ملوکیت کا نام اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام نام ہے اللہ کی

زمین پر اللہ کی بادشاہی کا ______ تو امیر معاویہ گھبرا گئے اور ان کو امام حسن علیہ السلام کے قتل کی سازش کرنا پڑی تاکہ اسلام کی وہ تحریک ختم ہو جائے جو اس عظیم امام کی انتہائی بلند مرتبہ قیادت میں اس خوب صورتی سے جاری تھی کہ حکومت کو بظاہر حرف گیری اور اعتراض کا بھی کوئی موقع نہیں ملتا تھا اور تحریک بھی طاقتور ہوتی جا رہی تھی۔

امام حسن علیہ السلام کی تبلیغی مہم کے سلسلہ میں تاریخیں بڑی حد تک خاموش ہیں لیکن آپ کی دو بڑی حسین تدابیر کا ذکر ہر تاریخ میں موجود ہے یہ اور بات ہے کہ مؤرخین نے جو تبلیغ کی نزاکت اور ایک پر آشوب دور میں تبلیغ کے پرخطر مگر موثر اور خاموش انداز سے قطعًا ناواقف تھے ان دونوں تدابیر کا ذکر موقف اعتراض میں کیا ہے۔ اور آلِ رسولؐ کی حکمت و بصیرت سے ناآشنا مسلمانوں نے بھی ان اہم تبلیغی تدابیر کو مؤرخین بنی امیہ کی غلط اندیشیوں کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ غلط سمجھا بلکہ اپنی کوتاہی فکر کے نتیجہ میں اس پر اعتراض کی بھی جسارت کی ہے!

تبلیغ کی ایک اہم خوبصورت اور پرتاثیر تدبیر "دسترخوان کی وسعت" تھی، جس کے نتیجہ میں ایک طرف تو غریب صحابہ کے قدم مدینہ میں جم گئے۔ اور دوسری طرف مدینہ آنے والے دور دراز کے مسافر امام علیہ السلام کے بیت الشرف میں جمع ہوتے رہے اور غذائے جسمانی کے ساتھ غذائے روحانی حاصل کرتے رہے۔ ان مہمانوں میں ہر ملک کے لوگ ہوتے تھے جو امام سے دین کی تعلیم حاصل کر کے اپنے اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔ اور وہاں لوگوں کو اس دین حقیقی سے

آگاہ کرتے تھے جن پر اموی حکومت پردے ڈال دینا چاہتی تھی، یہ تبلیغ اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بنی امیہ کی وضعی احادیث کی قوت اور سب وشتم کا زور بھی اس کے سامنے بے حقیقت ثابت ہوا، اور جیسے ہی معرکہ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا، ان کے قلب و دماغ پر ضرب عائد کی، اور انکے مُردہ ضمیر بیدار کئے، ویسے ہی اس تبلیغ کے اثرات اس شدت سے ظاہر ہوئے کہ بنی امیہ کا ایوان اقتدار زمین بوس ہونے لگا۔ جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہوگئیں اور ہر سمت سے کھلم کھلا آل رسول کی حمایت میں مظاہرے عام ہوگئے!

تبلیغ کی دوسری خوب صورت، خاموش اور موثر تدبیر وہ تھی جو امام علیہ السلام نے اپنے نانا جانؐ سے سیکھی تھی، جس پر ناسمجھ مسلمان جو تبلیغ کی حکمتوں اور نزاکتوں سے ناآشنا ہیں تعریض کی نگاہیں ڈالا کرتے ہیں!

وہ تدبیر تھی، نکاح! ——— امام علیہ السلام نے بالکل اسی طرح جس طرح آپ کے نانا جانؐ نے کئی نکاح فرمائے تھے مختلف قبائل عرب میں بہت سی شادیاں فرمائیں اور جس طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد ان شادیوں سے یہ تھا کہ مختلف قبیلوں کی حمایت حاصل کی جائے یا ان قبائل میں تبلیغ کی راہ ہموار کرلی جائے، اسی طرح امام علیہ السلام نے بھی کثرت ازدواج کے ذریعہ عرب کے مختلف قبائل کو آل رسول کا ہمنوا بنادیا، اور ان سے ایسے دوستانہ روابط قائم کرلئے جن کے نتیجہ میں ان پر تبلیغ آسان ہوگئی،

شادی بیاہ کے ان تعلقات کے نتیجہ میں عرب کے زیادہ سے زیادہ قبائل کو آل رسولؐ سے قریب تر آنے اور ان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا، اور پھر اس میل جول کے نتیجہ میں لازمی طور پر دین کے متعلق آل رسول کے افکار ان تک پہنچے جس سے ان میں حق و باطل کی تمیز کا جذبہ ابھرا، انہوں نے ایک طرف بنی امیہ کے کردار اور ان کے افکار کا مطالعہ اور دوسری طرف آل رسولؐ کے تصور دین اور ان ذوات مقدسہ کے کردار و عمل کا جائزہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق پر باطل کے جو غلاف ڈال دیئے گئے تھے، منبروں سے باطل کا جو شور برپا تھا اور جھوٹی حدیثوں کی مدد سے مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی جو تدبیریں کی جارہی تھیں ان کا سارا اثر ختم ہو گیا، باطل کے شور بے ہنگام کے باوجود حقیقت برابر لوگوں کے سامنے آتی رہی، حق کی آواز عمل کی شکل میں برابر ابھرتی رہی اور ازدواجی تعلقات کی مدد سے مسلمانوں کا دوسرا امام اموی پروپا گنڈہ کے اثرات کو اس خوب صورتی سے مٹاتا چلا گیا کہ حکومت وقت کو اعتراض کا موقع بھی نہیں ملا اور جس حق کو دبانے پر حکومت کی ساری قوتیں مرکوز تھیں وہ نہ صرف یہ کہ دب یا مٹ نہ سکا بلکہ مختلف قبائل میں اس خوبصورتی سے عام ہو گیا کہ حکومت کا جبر اور پروپا گنڈہ کی قوتیں بھی اسے دبانے یا مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

ظاہر ہے کہ حکومت وقت اس کی اجازت ہرگز نہ دیتی کہ امام حسن علیہ السلام بھری مسجدوں میں تقریریں کرتے یا ساری مملکت اسلامی میں دورہ کر کے جگہ جگہ آل رسولؐ کی حقانیت کا اعلان کرتے، ہر قبیلہ میں جا کے لوگوں کو تحریک اسلامی کی دعوت دیتے، بنی امیہ

کی اسلام دشمن حرکتوں کو علانیہ بیان فرماتے اور ان کے مقابلہ میں خلافت الٰہیہ کے اصولوں کو واضح کرتے ——— ایسا کرنا بلا وجہ موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اور حسنؑ کی موت اسلام کی موت ثابت ہوتی، اس لئے کہ بنی امیہ اسلام کی کھلم کھلا تبلیغ پر لازماً چراغ پا ہوتے، آل رسولؐ کے سارے افراد اسی طرح تہہ تیغ کر دیئے جاتے جس طرح ان کی حمایت کے جرم میں حجر اور ان کے ساتھی تہہ تیغ کر ڈالے گئے۔ اور عام مسلمان بھی اس قربانی کا کوئی اثر نہ لیتے اس لئے کہ ابھی بنی امیہ اور آل رسولؐ کے افکار و اعمال کا فرق عام مسلمانوں پر واضح نہیں ہوا تھا۔ اور اس ٹکراؤ کو محض دو طلبگاران شاہی کا ٹکراؤ قرار دے کے نظر انداز کر دیا جاتا، قربانیوں کا اثر تبھی ہوتا ہے جب عوام ان مقاصد کے ہم نوا ہو جاتے ہیں جن کے لئے قربانی پیش کی جاتی ہے اس لئے قربانی پیش کرنے سے قبل مقاصد کی اشاعت اور ان کی صحت کا ثبوت فراہم کرنا ضروری ہوا کرتا ہے، حجر اور ان کے ساتھی قتل ہو گئے لیکن چونکہ ابھی تک عوام آل رسولؐ اور بنی امیہ کے افکار و عمل کا فرق صحیح طور پر نہیں جانتے تھے اس لئے ان قربانیوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ الٹے اثر یہ ہوا کہ عوام دہشت زدہ ہو کر اور زیادہ بنی امیہ کے مطیع ہو گئے، اس کے برعکس بیس سال کی تبلیغ کے نتیجہ میں امام حسن اور امام حسین علیہم السلام نے اسلامی دنیا کو اپنے مقاصد کی صحت و عظمت کا اس حد تک معترف بنا دیا کہ معرکہ کربلا کے بعد یزید کے لئے تخت حکومت کانٹوں کا بستر بن گیا اور اس قربانی کے نتیجہ میں آل ابوسفیان نہ صرف یہ کہ حکومت سے محروم ہو گئی بلکہ دنیا سے اس

کا نام و نشان تک محو ہوگیا، یہ تھی وہ صورت جو تحریک اسلامی کے دوسرے قائد کے سامنے تھی، اس لئے وہ ایک فضول اور بے نتیجہ ٹکراؤ کو دعوت دیکر نہ تو اپنی عظیم قربانی کو رائیگان جانے دے سکتا تھا اور نہ بنی امیہ کو عتاب میں لا کے اسلام کو مہلکہ میں مبتلا کر سکتا تھا، امام حسن علیہ السلام ایسا کرتے تو یہ چیز قوموں کی نفسیات سے لاعلمی اور قیادت کی غلطی سے تعبیر کی جاتی یہ وقت ٹکراؤ کا تھا ہی نہیں۔ بلکہ اسی طرح جس طرح مکی زندگی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ٹکراؤ کا موقع نہیں تھی اس لئے امام حسن علیہ السلام نے دسترخوان کی وسعت اور ازواج کی کثرت کی وہ عجیب و غریب تبلیغی تدابیر اختیار کیں جن سے تبلیغ کا کام بھی جاری رہا اور حکومت بھی آپ پر کوئی شبہ نہیں کر سکی، آل رسول کی مہم جاری رہی، تحریک اسلامی پروان چڑھتی رہی اور دشمن غافل رہا۔ دس سال میں امام حسن علیہ السلام نے اسلام کے اکھڑے ہوئے قدم پھر سے جما دیئے اور بنی امیہ کے پروپاگنڈہ کو اتنا بے اثر کر ڈالا کہ اب حکمران طبقہ کو اپنی ناکامی کا احساس ہونے لگا، وہ یہ سمجھ گیا کہ دسترخوان پر محض روٹیاں تقسیم نہیں ہوتیں، اموی ملوکیت کے مقابلہ میں خلافت ربانی کی نعمتیں تقسیم ہوا کرتی ہیں اور حسنؑ کے نکاح و طلاق کا مقصد نہ عیش ہے نہ جمود، بلکہ اس تدبیر سے مختلف قبائل عرب کو قریب تر لا کے ان کو دعوت اسلامی سے ہمکنار کیا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سب کچھ اس خاموشی سے ہو رہا تھا کہ حکومت امام حسن علیہ السلام کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کرنے سے قاصر تھی اور ان پر کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کا الزام عائد کرنا ناممکن تھا ——— دوسرے حسنؑ کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے

یا ان کو قید کرنے میں ان قبائل سے ٹکراؤ کا خطرہ مقابلہ سے امام رشتہ داریاں کر چکے تھے۔ اس لئے امیر معاویہ اس پر مجبور ہو گئے کہ ایک..... بزدل سازشی کا کردار انجام دیتے ہوئے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا دیں اور اس طرح تحریک اسلامی کی دعوت کے اس عجیب وغریب نظام کو ختم کر دیں جسے اس عظیم المرتبت اور عرش پیما عقل وفہم رکھنے والے قائدین و امام عصر نے منظم فرمایا تھا۔ لیکن امیر معاویہ اپنی کوتاہی فہم کے نتیجہ میں پھر ایک بار دھوکا کھا گئے۔ حسن تحریک کو اتنا مضبوط بنا چکے تھے۔ کہ اب ان کی مظلومانہ شہادت اس تحریک کو ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی تحریک اسلامی نے دلوں میں اتنی جگہ نہیں پکڑی تھی کہ امام حسنؑ کی شہادت پر مسلمان اسی طرح غضبناک ہو کر شمشیر بکف ہو جاتے جس طرح امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ہوا۔ لیکن پھر بھی یہ تحریک دماغوں پر اتنا اثر ضرور ڈال چکی تھی کہ اب لبوں پر بنی امیہ کی شکائیتیں آنے لگیں لوگ امیر معاویہ سے مرعوب ہونے کے بجائے اُن پر اعتراض کرنے لگے، زبانوں پر چڑھے ہوئے قفل کھل گئے۔ چنانچہ یزیدؔ کی ولیعہدی کے سلسلہ میں امیر معاویہ کو جن اختلافات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ امیر معاویہ کے اقتدار کا محل لرز چکا تھا۔ اور بنی امیہ کی دہشت اور ہیبت دلوں سے رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی، مسلمانوں میں جراٗت کردار پیدا ہونے لگی تھی، اور وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انہوں نے بنی اُمیہ کو حکمرانی عطا کر کے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے!

امام حسن علیہ السلام کی زہر خورانی کے سلسلہ میں دو بڑی اہم چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ امام کو جس عورت نے زہر

دیا وہ حضرت ابوبکر کی بھانجی، حضرت عائشہ کی پھوپھی زاد بہن اور حضرت ابوبکر کے نواسے عبداللہ بن زبیر کی خالہ تھی جس سے حضرت ابوبکر کے خاندان اور آلِ رسولؐ کے تعلقات پر کافی سے زیادہ روشنی پڑتی ہے۔

اور دوسرے امام حسن علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ میں سیرتِ رسولؐ کا رنگ کتنا گہرا تھا اس کا ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ امام کو زہر دینے والی عورت جعدہ اس اشعث بن قیس کندی کی بیٹی تھی جو فرقہ خوارج کا بانی تھا۔ اور جس کے مقابلہ میں امیرالمومنینؑ کو جنگ نہروان لڑنا پڑی تھی۔ اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے ایسی عورت سے شادی کیوں کی؟ ـــــــ اور اس دشمنی کے پیش نظر جو اشعث بن قیس کندی کو آپکے خانوادۂ مبارکہ سے تھی۔ اس کی بیٹی سے عقد کیوں فرمایا!

اس کا جواب یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام کے سامنے بھی وہی مصالح تھے جو جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تھے۔ اور جن کے نتیجہ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کی بیٹی سے عقد کیا تھا!

واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ رسول وآلِ رسول کے افعال پر خود اپنے کردار وعمل کی روشنی میں غور کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، ہم سے اگر کوئی شخص دشمنی برتے تو ہم اس سے شادی بیاہ کے تعلقات ہرگز قائم نہیں کریں گے۔ لیکن رسول وآلِ رسول کی صورت بالکل دوسری تھی، اِن کی دوستی اور دشمنی، ان کے روابط وتعلقات، ان کے شادی بیاہ کے معاملات، ان کا میل جول، سب اللہ اور اسلام کے لئے ہوتا تھا، اِن کے کسی عمل میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا۔

سرکار دو عالمؐ نے مختلف قبائل اور خاندانوں میں شادیاں کیں تاکہ ان کو اسلام سے قریب تر کر دیں۔ یا کم از کم وہ اسلام کی مخالفت ترک کر دیں۔ بالکل یہی صورت امام حسن علیہ السلام کی تھی۔ اشعث بن قیس کی امیر المومنینؑ سے جنگ کے نتیجہ میں قبیلہ بنی کندہ آل رسولؐ کا مخالف ہو گیا تھا اور اس طرح اسلام حقیقی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ امام حسن علیہ السلام نے اس قبیلہ کی ایک عورت سے عقد فرما کے اس دیوار کو منہدم کر دیا۔ جسے اشعث نے اپنی منافقت، کور باطنی اور اسلام دشمنی کے نتیجہ میں آلِ رسولؐ اور بنی کندہ کے درمیان میں کھڑا کر دیا تھا۔ اور اس طرح اپنی جان کو مہلکہ میں ڈال کے آپ نے عرب کے قبیلہ کو جو اسلام اور آلِ رسولؐ سے دور ہوتا جا رہا تھا اسلام سے قریب تر رہنے پر مجبور کر دیا۔ بالکل یہی صورت آپ نے بعض اور قبائل کے سلسلہ میں بھی برتی۔ چنانچہ آپ کی ازواج میں کئی عورتیں ایسی ملتی ہیں جو ان قبائل سے تعلق رکھتی تھیں جو آل رسول کے دشمن خیال کئے جاتے تھے ان میں سے بعض عورتیں ایسی بھی نکلیں جو آپ کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھیں لیکن آپ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ اور ان عورتوں سے عقد کر کے ان قبائل اور خاندانوں تک آل رسول کا پیغام پہنچایا جن تک اسلام کی آواز اور آل رسولؐ کی تحریک پہنچانے کا کوئی دوسرا وسیلہ اس دور میں موجود نہیں تھا۔!

امام حسن علیہ السلام جعدہ کو بھی جانتے تھے اور ان دوسری عورتوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے قبائل اور ان کے خاندانوں کا

سارا کردار آپ کے سامنے تھا، آپ بخوبی سمجھتے تھے کہ ان عورتوں سے شادی آپ کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان قبائل اور خاندانوں کو آل رسول کی تحریک سے روشناس کرانے اور ان کو اسلام و پیغمبر اسلامؐ سے قریب تر کر دینے کے لئے آپ نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا۔ اور اس طرح اسلام کی تبلیغ کا وہ عظیم الشان فریضہ انجام دیا جو صرف سید شباب اہل الجنۃ ہی انجام دے سکتا ہے۔

امام حسن علیہ السلام ملت اسلامیہ کے مامور من اللہ قائد کی حیثیت سے اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایک کامیاب انسان نظر آتے ہیں۔ آپ نے امیر معاویہ کو حکومت کا کھلونا دے کے بنی امیہ کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی بیخ کنی میں مصروف رہنے سے روک دیا بلکہ وہی قوتیں جو اسلام کو مٹانے پر صرف ہوتیں، حدود سلطنت اسلامی کی مدافعت اور مملکت اسلامی کی توسیع پر صرف ہونے لگیں۔ اسلام کے دشمن بنی امیہ اسلام کے لئے ممالک فتح کرنے لگے اور چونکہ ان کو حکومت کے اندرون ملک میں خانہ جنگی اور انتشار پھیلانے سے روک دیا گیا تھا۔ اس لئے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ دوبارہ عربوں میں صحیح اور سچے اسلام کی تبلیغ کر کے شیطان کی وہ بازی الٹ دی جو وہ بنی امیہ کی مدد سے کھیلنا چاہتا تھا چنانچہ حسنؑ نے اپنے نانا کی مکی زندگی کی خاموشی اختیار کر کے اور حسینؑ نے نانا کی مدنی زندگی کا جہاد اختیار فرما کے دوبارہ وہی کام انجام دیا جو پیغمبر اسلامؐ نے انجام دیا تھا۔ اور آج یہ انہیں دونوں عظیم قائدین نسلِ

انسانی کا کارنامہ ہے۔ کہ دنیا میں وہ الٰہی پیغام زندہ اور موجود ہے جس پر انسانیت کی فوز و فلاح کا انحصار ہے!

یہ ایک حقیقت ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے بنی امیہ کو بادشاہت سپرد کر کے ان کے چہروں سے نفاق کی نقابیں نہ الٹ دی ہوتیں اور حکومت الٰہیہ اور انسانی حاکمیت کے فرق کو عملاً واضح نہ کر دیا ہوتا تو امام حسین علیہ السلام کو وہ کامیابی ہرگز نصیب نہ ہوتی جو آپ کو حاصل ہوئی۔ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے تلوار کی جنگ بند کرنے کا جو معاہدہ فرمایا تھا وہ دراصل معرکہ کربلا کی تمہید تھی کربلا کے فیصلہ کن مجاہدہ کا آغاز تھا، یہاں سے آل رسول ص کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ اسلامی دنیا کو اسلام کے صحیح تصورات سے آگاہ کرے۔ پھر جن لوگوں میں اسلام کی سچی لگن پیدا ہو جاتے، ان کو منظم کرے اور اس جمعیت کو کربلا کے میدان میں اتار کے اپنی لافانی قربانیوں سے اسلام کو حیات جاوداں عطا کر دے۔!

امام حسن علیہ السلام جنگ بندی کا معاہدہ نہ کرتے تو بنی امیہ حدود مملکت اسلامی میں ویسا ہی غدر مچاتے رہتے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انہوں نے برپا کرنا شروع کر دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ صحابہ و تابعین کی وہ مختصر سی جماعت جو احادیث رسول ص کی امین اور شریعت اسلامی کی خزینہ دار تھی یا تو اموی تلواروں کے گھاٹ اتر جاتی اور یا پھر منتشر ہو کر بے اثر اور تباہ ہو جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عرب میں دوبارہ دور جاہلیت پلٹ آتا۔ اسلام کی تعلیم دینے والے ختم ہو جاتے۔ فقہ اسلامی کے جاننے والے معدوم ہو جاتے

اور اللہ کا آخری پیغام مٹ جاتا۔

امام حسن علیہ السلام نے جنگ بند کر کے اس خطرہ کو دور کر دیا۔ آپ کے اس اقدام کے نتیجہ میں بنی امیہ اسلام کی بیخ کنی کے بجائے انتظام مملکت میں مصروف ہو گئے، ان کی توجہ اسلام دشمنی سے ہٹا کے سیاست ملکی پر مرکوز کر دی گئی اور ادھر آل رسولؐ اور ان کے ساتھیوں کو سکون کی فضا میں اسلام کی تبلیغ کا موقع ہاتھ آگیا —— امام حسن علیہ السلام نے تبلیغ کا موقع فراہم کیا، امام حسین علیہ السلام نے اس تبلیغ کے اثرات کو اپنی قربانی سے پائیدار بنا دیا۔ اس طرح ان دونوں بھائیوں نے جو قدرت کی جانب سے نسل انسانی کی ہدایت پر مامور تھے، اپنی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں سے اسلام کو اموی فتنہ سے بچا لیا۔ اور وہ کام جو بدر و احد میں رسول اللہ نے شروع فرمایا تھا مدینہ اور کربلا کی مقدس زمینوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسوں نے اس شان سے پورا کیا کہ آج تک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اسلام کا پھریرا لہرا رہا ہے!

یہاں ہم امام حسن علیہ السلام کے بے پناہ تدبر و بصیرت کے ایک اور اہم مظاہرہ کی جانب ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں، اور وہ یہ کہ آپ نے معاویہ سے معاہدہ کر کے جہاں امام حسین علیہ السلام کو مناسب وقت پر ایک عظیم قربانی پیش کرنے اور اس طرح اسلام کو حیاتِ نو عطا کرنے کا موقع عنایت کر دیا۔ وہیں مستقبل میں اس قربانی کی یادگار کو محفوظ رکھنے کا بھی سامان کر گئے۔ امام کی دور بین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ بنی امیہ امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دینے کے بعد جہاں جبر و قدر کا مسئلہ ایجاد کر کے قتل حسینؑ کی ذمہ داری خدا پر ڈالیں گے یا قتل الحسین بسیف جدہ

کا نعرہ بلند کر کے قتل حسینؑ کا الزام رسولؐ کی پاک ذات پر لگائیں گے۔ وہیں کوفہ والوں کی "شیعیت" کا شور برپا کر کے اپنا جرم شیعوں کے سر تھوپنے کی کوشش بھی کریں گے اور بنی امیہ کے ہوا خواہ اس الزام کو ہمیشہ شد و مد سے دہراتے ہوئے حسینؑ کی عزاداری کی مخالفت کریں گے۔ امام نے معاویہ سے معاہدہ کر کے شیعوں کو اس الزام سے قطعاً بری الذمہ کر دیا اس لئے کہ معاہدہ پر دستخط ہوتے ہی کوفہ والوں نے امیر معاویہ کی بیعت کر لی۔ اور "اموی خلافت" پر ایمان لے آئے ان کے اس اقدام نے یہ ثابت کر دیا کہ کوفہ والے ہرگز شیعہ نہیں تھے۔ اس لئے کہ شیعہ امامت کے لئے عصمت اور منصوص من اللہ ہونا ضروری تصور کرتے ہیں اور امیر معاویہ نہ معصوم تھے نہ مامور من اللہ۔ ایسی حالت میں کوئی شیعہ نہ تو ان کی بیعت کر سکتا ہے۔ اور نہ ان کو خلیفہ مان سکتا ہے۔ کوفہ والوں نے امیر معاویہ کی بیعت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "انسانی حاکمیت" کے اصول پر ایمان رکھتے تھے اور یہ وہی لوگ تھے جو حضرت علی علیہ السلام کو "اپنے مقرر کردہ" چوتھے خلیفہ کی حیثیت سے مانتے تھے۔

ٹکراؤ کی تیاریاں

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد اسلامی تحریک کی قیادت امام حسینؑ کے ہاتھوں میں آئی۔ وقت بڑا پُر آشوب تھا۔ بنی امیہ یہ سمجھ چکے تھے کہ آلِ رسول کے قائدین ان کی بساط کفر و نفاق کو الٹ ڈالنے پر تلے ہوتے ہیں۔ اور ان کی صلح دراصل ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ ہے اس سکون کے پردے میں ایک بڑا طوفان پرورش پا رہا ہے اور حسنؑ کی خاموشی درحقیقت ایک فیصلہ کن اور عظیم ٹکراؤ پہ منتج ہونے والی ہے۔ اسی لئے انہوں نے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا دیا تاکہ آلِ رسولؐ مشتعل ہو کر ایک ایسے وقت میں ٹکراؤ پر مجبور ہو جائے جبکہ اس کی تیاریاں مکمل نہیں ہیں اور معاویہ کو "صحابیت" کی وہ آڑ حاصل ہے جس کے پردے میں وہ گلشن اسلام کو تاراج کر ڈالنے کے باوجود اپنے چہرے پر بے گناہی اور معصومیت کی نقاب ڈالے رہ سکتا ہے لیکن بنی امیہ کا اندازہ بالکل غلط نکلا۔ آلِ رسول کے افراد حکمت ربانی کے امین تھے۔ اور وہ کسی وقتی اشتعال پہ اپنے دائمی مقاصد کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔ بنی امیہ اور ان کے ہمنواؤں کی تمام اشتعال انگیزیوں پر صبر کا ٹھنڈا پانی چھڑک دیا گیا۔ حسنؑ کی نعش حجرہ رسولؐ میں دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی، حضرت عائشہ خچر پر سوار ہو کر مخالفت کرنے والوں کے پیش پیش تھیں مروان اور اس کے ساتھیوں نے سبطِ اکبر کے تابوت پر تیر اندازی شروع کر دی۔ غرض اشتعال انگیزی کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ لیکن تحریک اسلامی

کے تیسرے قائد کی جبین صبر پر کوئی شکن نمودار نہ ہو سکی حسینؑ جانتے تھے کہ ابھی ان کے لئے ٹکراؤ کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اس وقت ٹکراؤ کے معنی یہ ہونگے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور خال المومنین امیر معاویہ دونوں "صحابیت" اور "خطائے اجتہادی" کی ردائوں میں منہ چھپا کے تاریخ کی نگاہوں میں بیگناہ بننے کی کوشش کریں گے اور آلِ رسول کو ختم کر دینے کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔ قربانی رائیگاں جائے گی، جمل اور صفین کے پٹے ہوئے مہرے جیت جائیں گے۔ اور بنی امیہ دُنیا کو یہ فریب دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کہ حسنؑ کے مرتے ہی حسینؑ نے "حصولِ حکومت" کی جنگ چھیڑ دی تھی جس میں وہ مارے گئے۔ پھر مدینہ کا ماحول بھی کسی قربانی کے لئے سازگار نہیں تھا۔ اس لئے کہ جس مدینہ میں سبط اکبر کی نعشِ مطہر پر تیروں کی بارش ہو۔ اور لوگ اس واقعہ کو محض تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں۔ وہاں اگر سبط اصغر بھی ذبح ہو جاتا تو دلوں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ مدینہ والوں کے دل مردہ اور ضمیر افسردہ ہو چکے تھے۔ اس لئے وہاں کسی قربانی سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت سے امام حسین علیہ السلام نے یہی مناسب جانا کہ خانوادۂ رسالت پر جو ظلم ہو رہا ہے اسے انگیز کر لیا جائے اور اسلام کو تاراجی سے بچا لیا جائے۔ حسنؑ کی نعش حجرۂ رسول میں دفن نہیں ہو سکتی تو نہ ہو۔ لیکن بنی امیہ کو اسلام کی تدفین کا موقع نہ ملنے دیا جائے۔ معاویہ اور مروان کی سازش کو ناکام بنا دیا جائے۔ اور اس شجر اسلام کی بیخ کنی نہ ہونے دی جائے جسے حسنؑ کی موت سے فائدہ اٹھا کے بنی امیہ ہمیشہ کے لئے

کاٹ دینا چاہتے تھے!

ٹکراؤ کے لئے یہ وقت اس اعتبار سے بھی مناسب نہیں تھا کہ ابھی بنی امیہ کی بہت سی بداعمالیاں منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ اور عوام امیر معاویہ کو صحابی تصور کرتے ہوئے "فریب عدالت" میں مبتلا تھے اس لئے یہ ضروری تھا کہ ابھی انتظار کی روش قائم رکھی جائے اور جب نفاق کے چہرے پر پڑے ہوئے سب پردے الٹ جائیں تو میدان میں قدم رکھا جائے تاکہ ٹکراؤ میں کامیابی یقینی ہو جائے۔ چنانچہ امام حسین علیہ السلام نے دشمن کی شدید اشتعال انگیزیوں پر بھی درگذر سے کام لیا اور اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان عظیم تیاریوں میں مصروف رہے جو معرکہ کرب و بلا کے لئے درکار تھیں!

مروان اور حضرت عائشہ مدینہ میں جنگ چھیڑ کے شامی مسیحی لشکر کو "بغاوت فرو کرنے" کے بہانے مدینہ پر لشکر کشی کی دعوت دے سکتے تھے۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ مدینہ کی تاراجی اور اصحاب رسول کا قتل عام تفسیر، حدیث اور فقہ کے خزانوں کی پامالی پر منتج ہوگا اور دنیا سے اسلام مٹ جائے گا، ان کو بس فکر تھی تو اتنی کہ اس طرح وہ امیر معاویہ کے دربار میں محترم ہو جائیں گے اور آل رسول کی فنا کے انعام میں امیر معاویہ ان کو سونے چاندی میں تول دیں گے، لیکن امام حسین علیہ السلام اتنے پست اور ذلیل مقصد کی خاطر مدینہ کو خونریزی کا شکار نہیں ہونے دے سکتے تھے۔ آپ نے صبر سے کام لیکے مدینہ اور علوم اسلامی دونوں کو تباہی سے بچا لیا۔ اور ایک چپ سے وہ بلا ٹال دی جو اسلام کے سر پر منڈلا رہی تھی!

وقت گذرتا اور بنی امیہ آل رسول کو خاموش دیکھ کے اپنی حرکتوں پر شیر ہوتے چلے گئے۔ ظلم وعدوان عام ہو گئے بیت المال اسلامی شاہی خزانہ بن گیا، فسق و فجور کی گرم بازاری ہو گئی ——— اور اب ملت اسلامیہ کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے، قیصریت شام کے راستے عربستان میں داخل ہو گئی ہے۔ قیصر و کسریٰ کی روح دمشق میں رقص کناں ہے۔ وہ آزادی جو اسلام نے انسان کو عطا کی تھی سلب ہو رہی ہے۔ اور انسان پر انسان کی حکومت کے جس طلسم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توڑ ڈالا تھا وہ اموِیت کی شکل میں دوبارہ مسلمانوں پر نافذ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس احساس کا اظہار قریش کے ایک بہت بڑے ستون سعد بن ابی وقاص نے معاویہ کے بھرے دربار میں اس طرح کیا کہ آپ نے

"السلام علیکم اے بادشاہ!"

کہہ کر معاویہ کو سلام کیا۔ اور جب معاویہ نے اس معنی خیز جملہ کے اثر کو کم کرنے کے لئے کہا کہ

"اے سعد! اگر تم السلام علیکم اے
امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا؟"

تو سعد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس جملہ کا یہ جواب دیا کہ

"معاویہ! خود اپنے دل سے پوچھو
کہ میں نے تمکو جس لقب سے پکارا ہے
وہ تمہارے دل کو کتنا محبوب ہے؟"

یہ تھی وہ کیفیت جو معاویہ کے دورِ سلطنت کے آخری ایام میں پیدا ہو چکی تھی لیکن ابھی حسینؑ کو کچھ اور درکار تھا۔ ابھی مسلمانوں کے قلب و ذہن پر ایک اور چوٹ لگنا باقی تھی اور تحریک اسلامی کا بالغ نظر قائد اسی چوٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت نے یہ کسر بھی پوری کر دی امیر معاویہ نے یزید کی جانشینی کا فیصلہ کر دیا۔ اور یہ فیصلہ اتنا مہیب، اتنا تباہ کن اور اتنا خوفناک تھا کہ عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر، اور عبداللہ بن عمر کے سے اعیان قریش بھی اس فیصلہ پر تلملا اٹھے۔ مسلمانوں میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی اور عوام ملوکیت کا یہ ننگا ناچ دیکھ کر بے چین ہو گئے یہ پہلا موقع تھا جب امام حسین علیہ السلام نے سیاسی مطلع پر ظہور فرمایا اور آپ نے کھلم کھلا نسلی بادشاہت کے قیام پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر فرمائی —— لیکن یہ احتجاج محض زبانی تھا۔ اس لئے کہ ابھی وقت نہیں آیا تھا جب تحریک اسلامی کا قائد اموئیت پر فیصلہ کن ضرب عائد کرتا۔ ابھی نظام اسلامی کی پیہم مخالفتوں کے باوجود اموی حکمران کے چہرہ پر صحابیت کی نقاب پڑی ہوئی تھی اور مسلمان آسانی سے مبتلائے فریب ہو سکتے تھے اس لئے امام نے خاموشی ہی مناسب جانی اور صرف احتجاج پر اکتفا فرمائی۔ لیکن امیر معاویہ سمجھ گئے کہ یہ احتجاج ایک ٹکراؤ کا پیش خیمہ ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ آلِ رسولؐ کے متعلق ان کے سارے اندازے غلط تھے ان کا تصور مہمل تھا کہ آلِ رسول کی ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ دل بیٹھ چکے ہیں، عزم شکستہ ہو چکا ہے۔ اور اب وہ بنی امیہ کی قہرمانی قوتوں کو چیلنج نہیں کرے گی۔ چند سال قبل ان کو یہ احساس پیدا ہوا ہوتا تو وہ

حسینؓ بن علیؓ کا بھی وہی حشر کر ڈالتے جو انہوں نے حجر بن عدی اور رشید ہجری کا کیا تھا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوا تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی دنیا میں حسینؓ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو چکی ہے، مسلم عوام میں فرزند رسولؐ کا وقار کافی بلند ہو چکا ہے۔ بنی امیہ کے افعال ناشائستہ کے نتیجہ میں عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کو دھوکہ دیا گیا ہے اور اموی خلافت کے نام سے ان پر قیصری ملوکیت نافذ کر دی گئی ہے۔ عوام میں اب یہ احساس بھی ابھرنے لگا ہے کہ آل رسولؐ کا موقف صحیح تھا، آل رسولؐ اپنی ذاتی یا خاندانی بادشاہت کے لئے نہیں لڑ رہی تھی بلکہ ایک ایسے اصول کے لئے رزم آرا رہی تھی جس میں خود مسلمانوں کا فائدہ تھا۔ اور اس احساس کے نتیجہ میں عوام کی نگاہیں اپنی قیادت کے لئے حسینؓ کی جانب اٹھنے لگی تھیں۔ ایسی حالت میں امیر معاویہ کے لئے حسینؓ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہا تھا، اور وہی شخص جو چار سال تک امیر المومنینؑ کے مقابلہ میں تیغ بکف رہ چکا تھا، جس نے حسنؓ کو زہر دغا کا نشانہ بنا دیا تھا، جس کے ہاتھ سینکڑوں بیگناہوں کے خون سے رنگین ہو چکے تھے، اور جو قتل و خونریزی کو ایک کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا۔ حسینؓ کے باب میں کانپتا نظر آرہا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ علیؓ کے فرزند کو دعوت مبارزت دے سکے، یا یزید کی جانشینی سے انکار کے سوال پر حسینؓ کے قتل کا حکم جاری کر سکے، ـــــ کیوں؟ ـــــ صرف اس لئے کہ اب زمانہ بدل چکا تھا، معرکہ صفین کو بیس سال بیت چکے تھے، اس بیس سال میں مسلمانوں کو کافی تجربے ہو چکے تھے۔ اموّیت پر اسلام کے جو پردے ڈال رکھے گئے تھے وہ سب اٹھ چکے تھے، حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے

چکی تھی، فریب کاریوں کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور دنیا یہ سمجھ چکی تھی کہ
بنی امیہ کیا چاہتے ہیں ؟
اور
آلِ رسول کیا چاہتی ہے ؟

آلِ رسولؐ کے مقاصد کی ترویج و اشاعت کی جنگ جیتی جا چکی تھی اور جن حقیقتوں پر قریش اور بنی امیہ نے اپنی مفاد پرستی کی خاطر پردے ڈال رکھے تھے۔ وہ اس بیس سال کے عرصہ میں پورے طور پر عوام کے سامنے آ چکی تھیں۔ معاویہ کو اس چیز کا پورا احساس تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خود امام حسین علیہ السلام سے ٹکراؤ لینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ یزید کو بھی مشورہ دیا کہ حتی الوسع حسینؑ سے جنگ نہ کرنا کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ مسلم عوام کے دل آلِ رسولؐ کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اور ایسی حالت میں اگر جنگ ہوئی تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ اسلام دشمن قوتوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور وہ اسلام پھر سے سربلند ہو جائے جسے مٹانے کی خاطر بنی امیہ کو اپنے کفر پر اسلام کا ملمع چڑھانا پڑا تھا !

معاویہ کی جانب سے خوف اور کمزوری کا یہ مظاہرہ تحریک اسلامی کے تیسرے قائد کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی !

زمانہ نے ایک اور ورق الٹا۔ معاویہ کا انتقال ہو گیا، یزیدؔ کو دمشق کا تخت و تاج حاصل ہو گیا، افغانستان سے لے کر تیونس تک اور قسطنطنیہ سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی عظیم اسلامی سلطنت یزیدؔ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ لیکن یزیدؔ نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ سمجھ لیا کہ اس کی

سلطنت محکم نہیں ہے، اس کی بادشاہت کے قدم لرزاں ہیں، اس کا قصرِ حکومت کانپ رہا ہے اس لئے کہ مدینہ کے ایک گوشہ میں آلِ رسول کا جو بوریا نشین قائد موجود ہے اسے نسلی بادشاہت کا یہ فتنہ سخت ناپسند ہے۔ یزیدؔ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ دادا کا مقصد اسلام کو فنا کر دینا تھا لیکن وہ اپنے اس مقصد میں محض اس لئے کامیاب نہیں ہو سکے کہ آلِ رسول ان کی راہ میں مزاحم تھی اور ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ آلِ رسول کو ختم کر کے دنیا سے اسلام کے نقوش کو فنا کر ڈالتے۔ یزید جوان تھا اور جوانی کے نشہ کو طاقت، سلطنت اور دولت کے نشہ نے دو آتشہ کر دیا تھا، شراب اور عیاشی نے عقل و خرد پر کچھ اور پردے ڈال دیئے تھے، اس نے زمامِ حکومت سنبھالتے ہی یہ حکم صادر کر دیا کہ

"حسینؑ سے بیعت لی جائے اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر گردن سے جدا کر دیا جائے"

یزیدؔ دمشق کے ایوانِ حکومت میں پلا، بڑھا اور جوان ہوا تھا۔ اُسے آلِ رسولؐ کی طاقت یا ان کے کردار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اسے صرف قیصری انداز کا علم تھا امامت کے طریق کار کا کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے وہ کیا جو ایک قیصر کو کرنا چاہیے تھا حسینؑ سمجھ گئے کہ وہ جس موقع کے منتظر تھے وہ آگیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے قیصریت کے مقابلہ میں اسلامیت کے حربے سنبھال لئے اور اس عظیم ٹکراؤ پر آمادہ ہو گئے جس پر اسلام کی حیاتِ نو کا انحصار تھا، !

جنگ کا آغاز مدینہ کی سرزمین سے ہوا۔

یزیدؑ کے عامل ولید بن عقبہ نے امام سے بیعت کا مطالبہ کیا اور مروان بن حکم نے صاف صاف کہہ دیا کہ "حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر کاٹ لیا جائے"

یہ پہلا ٹکراؤ تھا جو حسینؑ اور یزیدؑ کے مابین ہوا۔ حسینؑ جانتے تھے کہ مدینہ میں تلوار سنبھال لینے کا نتیجہ قبر رسولؐ کی اہانت اور علوم اسلامی کے خزانہ داروں کی موت کی شکل میں برآمد ہو گا، اس لئے آپ نے تلوار کی جنگ سے گریز کیا اور مدینہ سے رخت سفر باندھ دیا۔ یزیدؑ کا عامل نہ آپ کو قتل کر سکا اور نہ گرفتار کر سکا۔ یہ یزیدؑ کی پہلی شکست تھی اور حسینؑ کی ایک عظیم کامیابی۔

یزیدؑ نے جنگ کے لئے مدینہ کا انتخاب کیا تھا اس لئے کہ مدینہ میں قتل حسینؑ کے ساتھ ساتھ اسلام کا نقش آخریں فنا کر دینے کا بھی موقع تھا۔ لیکن حسینؑ نے دشمن کو یہ موقع نہیں دیا بلکہ اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس مقام پر حسینؑ سے جنگ کرے جو حسینؑ کیلئے بہتر ہے۔ جو حسینؑ کے مقاصد کے لئے مفید ہے۔ اور جس سرزمین پر جنگ کا نتیجہ یزیدیّت کی موت، امویّت کی شکست اور جزیرہ نمائے عرب میں کفر و نفاق کی قوتوں کی مکمل بربادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

یزیدؑ کے لئے جنگ کا بہترین میدان مدینہ تھا اور حسینؑ کے لئے ٹکراؤ کی بہترین جگہ کربلا، مدینہ وہ سرزمین تھی جہاں ——

(۱) حضرت علی علیہ السلام کے مخالف مہاجرین

قریش کی باقیات کافی تعداد میں موجود تھی جسے ظاہر ہے کہ امام حسین علیہ السلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) عوام اپنا کردار اور حرارت ایمانی اس درجہ کھو چکے تھے کہ واقعہ حرہ میں قبر رسولؐ کی اہانت کے بعد لوگوں نے یزید کی غلامی تک پر بیعت کر لی۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے باوجود مدینہ والوں نے جنگِ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی بہت کم مدد کی تھی۔

(۴) مدینہ میں امام حسین علیہ السلام قتل ہو جاتے تو مدینہ میں توابین یا مختار کی سی کوئی تحریک شروع نہ ہوتی اور مدینہ والے اس شہادت پر بھی اسی طرح بے حسی کا مظاہرہ کرتے جس طرح امام حسن علیہ السلام کی شہادت پر کر چکے تھے!

اس کے مقابلہ میں عراق وہ سرزمین تھی جہاں ـــــــــــــــــ

(۱) آلِ رسولؐ کے موقف کو سمجھنے والے موجود تھے۔ چنانچہ شہدائے کربلا میں کوفہ کے حضرات کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

(۲) عراقیوں نے جمل اور صفین میں بڑے پکے

جوش طریقہ پر آل رسولؐ کا ساتھ دیا تھا۔

(۳) عراقیوں میں حرارت ایمانی اور زندگی کے جوہر موجود تھے چنانچہ امامؑ کی قربانی کا جیسا اثر عراقیوں نے لیا ویسا کہیں نہیں لیا گیا۔ توابین اور مختار اسی سرزمین سے اٹھے اور بنی امیہ کا خاتمہ کرنے میں عراقیوں نے پرجوش حصہ لیا ہے۔

(۴) عراق میں قربانی دینے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ عراق اس وقت کے اسلامی عالم کے قلب میں تھا۔ اور یہاں سے واقعۂ شہادت کی خبریں ساری اسلامی دنیا میں پہنچ جانا یقینی تھیں۔

امامؑ نے مدینہ میں جنگ نہ کر کے اموی سیاست کو ایک بڑی زک دی ایسی زک جس کے اثرات عالم میں آشکارا ہیں۔

امام مدینہ سے نکل کے مکہ چلے گئے۔ اور اس زمانہ میں گئے جب مکہ میں اطراف و اکناف عالم کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دنیا بھر میں اپنے مقاصد کی اشاعت کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔؟ امامؑ نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور حجاج کے ذریعہ عالم اسلام کو آنے والے واقعات سے باخبر کرنا شروع کر دیا۔ یہاں بھی یزید نے یہ چاہا کہ ٹکراؤ ہو جائے اور اموی لشکروں کو حرمت کعبہ برباد کرنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ تیس آدمیوں کی ایک جماعت حجاج کے پردہ میں مکہ بھیجی گئی تاکہ وہ حسین علیہ السلام کا

کام تمام کر دے۔

یزیدؔ جانتا تھا کہ اس وقت حسینؑ کے ساتھ کئی ہزار آدمی موجود ہیں اس لئے اگر حسینؑ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو مکہ میں غدر برپا ہو جائے گا۔ اور یزیدؔی لشکر کو "بقائے امن" یا "بغاوت فرو کرنے" کے نام پر کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ کوئی اچھا جرنیل ایسی جگہ نہیں لڑتا جہاں اُس کے مقاصد کو شکست ہو سکے۔ تحریک اسلامی کا قائد اعظم بھی ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ حسینؑ کو جنگ کا دفاع کرنا تھا اسلام کے لئے۔ اس لئے وہ ایک ایسی جگہ جنگ نہیں کر سکتے تھے جہاں جنگ کا نتیجہ اسلام کی بربادی کی شکل میں برآمد ہو سکتا تھا۔ اس لئے امامؑ نے حج کو عمرہ سے بدل کے مکہ کو چھوڑ دیا۔ حج کے لئے جمع ہونے والے لاکھوں مسلمان فرزندِ رسولؐ کو اس طرح مکہ چھوڑتے دیکھ کے حیران ہو گئے ہوں گے اور یقیناً ان کے دلوں اور دماغوں پر ایک ضرب سی لگی ہو گی انہوں نے سوچا ہو گا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اور جب ان کو یہ معلوم ہوا ہو گا کہ اموی خلافت حرم محترم کی عزت و عظمت لوٹنے پر آمادہ تھی تو ان کے دلوں میں جو جذبات پیدا ہوتے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

امیر معاویہ کا انتقال ۲۲ رجب کو ہوا تھا۔ اور امامؑ نے ۲۸ رجب کو مدینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ امامؑ نے شعبان، رمضان، شوال اور ذیقعدہ کے پورے چار مہینے اور ذی الحجہ کا ایک ہفتہ مکہ میں گذارا۔ اس میں بظاہر مصلحت یہ تھی کہ یزیدؔ کا کردار اسلامی

دنیا پر پوری طرح روشن ہو جائے اور مسلمان اپنے حکمران کی جانب سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ چنانچہ یہ مقصد بھی پورا ہوا۔ یزید کے حالات عام ہو گئے۔ مسلمانوں میں بے چینی بڑھنے لگی اور عراقی مسلمانوں نے اپنی بے چینی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں ہزاروں خطوط پہنچنا شروع ہو گئے جن میں یزید سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ درخواست کی جارہی تھی کہ آپ عراق تشریف لا کے مسلمانوں کو اس غلامی سے نجات دلائیں جن میں وہ بنی امیہ کی بدولت مبتلا ہو گئے تھے"!

یزید کے خلاف یہ بے چینی صرف عراق تک محدود نہیں تھی بلکہ بعد کے حالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ پوری دنیائے اسلام میں اموی اقتدار کے خلاف بے چینی پیدا ہو گئی تھی، جس سے سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ بن زبیر نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی!

مکہ چھوڑ کے امام نے عراق کا رخ کیا تاکہ ایک ایسے مقام پر یزید سے ٹکراؤ ہو جو اس وقت کی مملکت اسلامی کے عین قلب میں واقع تھا اور افریقہ اور ایشیا کے مابین قافلوں کی سب سے بڑی گذرگاہ شمار کیا جاتا تھا عراق میں حسینی قربانی کا مقصد یہ تھا کہ یزید اور اس کے ساتھی واقعات پر پردہ نہ ڈال سکیں بلکہ ایران، شام، فلسطین اور عرب کے گوشہ گوشہ میں حسینؑ کے مقاصد عام ہو جائیں۔ یہ سرزمین آلِ رسولؐ کے مقاصد جنگ کے اعتبار سے بہت اچھی اور مناسب تھی اور امویوں کے لئے جنگی اعتبار سے قطعاً تباہ کن، یزید اس رمز کو نہیں سمجھ سکا اور وہ ایک ایسے علاقہ میں حسینؑ کا خون بہانے پر آمادہ ہو گیا جہاں اس جرم پر پردہ ڈالنا محال تھا۔ جہاں سے حسینی قربانی کی اطلاع

جنگل کی آگ کی طرح پھیل جانا یقینی تھی، اور جہاں سے وہ شرارے بلند ہونے والے تھے جو اموی بادشاہت کے ساتھ ہی ساتھ اموی اصولوں کو بھی جلا کے خاکستر کر دینے والے تھے!

امامؑ نے عراق کا رُخ کرنے سے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیا تھا۔ تاکہ وہ عراقیوں کو امامؑ کی آمد، امام کے مقاصد اور آلِ رسولؐ کی تحریک سے پوری طرح باخبر کر دیں۔ کوفہ میں اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے مسلم کی بیعت کی۔ جو اس کا ثبوت ہے کہ مسلم عوام اموی حکومت سے تنگ آچکے تھے۔ اور ان کے دماغوں میں یہ خیال گردش کرنے لگا تھا کہ اموی حکومت اس خلافت الٰہیہ سے بالکل الگ ایک چیز ہے جس کے قیام کا اسلام داعی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں عبیداللہ بن زیاد کے خوف اور طمع دنیا میں مبتلا ہو کر کوفیوں نے مسلم کی بیعت توڑ دی اور ان کو ذبح کر ڈالا۔ لیکن یہ واقعہ کہ کوفیوں نے مسلم کی بیعت کی اس امر کا ثبوت ہے کہ آلِ رسولؐ کی تحریک دلوں میں گھر کر چکی تھی، پیغام عام ہو چکا تھا اور اب ضرورت صرف اس امر کی رہ گئی تھی کہ ایک بڑی قربانی پیش کر کے اس احساس کو اعتقاد میں اور اعتقاد کو عمل میں تبدیل کر دیا جائے!

کوفہ میں حسینؑ کے قاصد اور ابن زیاد کے مابین جو ٹکراؤ ہوا وہ بھی حق پرستی کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم شہید ہو گئے مگر لیکن ان کی گرفتاری کے لئے پے در پے تین دستوں کا روانہ کیا جانا اور ہر دستہ کا شکست کھانا، شجاعت کی تاریخ کا ایک محیر العقول باب ہے۔

بہر حال اس جنگ کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سارے عراق میں امام حسین علیہ السلام کی آمد اور آپکے مقاصد کی اشاعت ہو گئی اور یزید کے

بہ ناممکن ہو گیا کہ وہ حسینی قربانی پر پردہ ڈال دے۔ اموی سیاست کے طریق کار کا اندازہ رکھنے والے صاحبان فہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ یزید کی کتنی بڑی شکست تھی!

مسلم کی شہادت سے امام کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ کوفہ کے سچے مسلمانوں کے دل لرز اٹھے۔ اور ان کے خفتہ ضمیر بیدار ہو گئے چنانچہ میدان کربلا میں امام کے ساتھیوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء میں بڑی اکثریت کوفہ والوں کی تھی۔ بریر بن خضیر، مسلم بن عوسجہ، حبیب ابن مظاہر، سعید ابن عبداللہ، زہیر بن قین، حُر بن یزید، عابس بن شبیب غرض سید الشہداء کے ممتاز ساتھیوں کی اکثریت کوفہ والوں پر مشتمل تھی۔

لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امامؑ نے مکہ اور مدینہ پر کوفہ کو کیوں ترجیح دی لیکن وہ یہ بھولتے ہیں کہ حسنؑ کی شہادت پر مکہ یا مدینہ میں ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو اموی حکومت کے خلاف محض زبانی احتجاج بھی کر دیتا لیکن کوفہ وہ جگہ تھی جہاں مسلم کی شہادت نے یہ اثر کیا کہ امام پر جان قربان کرنے کیلئے تقریباً پچاس آدمی میدان کربلا پہنچ گئے۔ اور پھر حسینؑ کی شہادت نے کوفہ پر یہ اثر کیا کہ یا لثارات الحسین کی آوازیں اس وقت تک نہ دب سکیں جب تک کہ نہ صرف اموی حکومت کا بلکہ بنی امیہ کی نسل تک کا نام و نشان دنیا سے نہ مٹا دیا گیا۔ تحریک اسلامی کے تیسرے قائد کی یہ انتہائی بالغ نظری تھی کہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ کوفہ اس کے مقاصد کے اعتبار سے بہترین جگہ ہے اور وہاں کے رہنے والوں میں اب بھی اتنی جرأت اور زندگی موجود ہے کہ اگر ایک قربانی کے سہارے ان کی رگ دل میں نشتر چبھو دیا گیا تو وہ اموی‌ت کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس کے برعکس مکہ اور مدینہ کے لوگ اتنے مردہ ہو چکے

ہیں کہ کعبہ کا پردہ جل اُٹھے گا، حرم محترم پر آتشبازی ہو جائے گی۔ قبر رسولؐ پر گھوڑے بندھ جائیں گے، انصار کی عورتوں کی حرمت لٹ جائے گی۔ لیکن مکہ اور مدینہ کے لوگ پھر بھی غیرت و حمیّت کی چنگاریوں کو اپنے دلوں سے دُور رکھیں گے اور ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے کے باوجود اسلام کو دشمنوں کے پنجہ سے رہا کرانے کے لئے کوئی جد و جہد نہیں کریں گے۔

حضرت عائشہؓ کے چہیتے بھانجے، حضرت ابوبکر کے حقیقی نواسے اور قریشی مفادات کے بہت بڑے علمبردار، عبداللہ بن زبیر کا خود مکہ میں قتل بھی ان کے دلوں میں کوئی حرارت نہیں پیدا کر سکے گا۔ ایسی حالت میں حسینؑ کو ان لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی، ؟ جو قریش و انصار اس عبداللہ بن زبیر کے نہ ہوسکے جو ان کو دوبارہ سلطنت اور دولت کا مالک بنا دینے کا دعویٰ کر رہا تھا، وہ بیچارے حسینؑ کا ساتھ کیسے دیتے جو حکومت کو اللہ کے لئے اور دولت کو مساویانہ تقسیم کی شے قرار دیا کرتا تھا! ایسی حالت میں یقیناً کوفہ امامؑ کے مقاصد کے اعتبار سے بہتر تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی قربانی کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں اس قربانی کا زبردست اثر ہونا اور اس اثر کے نتیجہ میں اموی اقتدار کے خاتمہ کی داغ بیل پڑ جانا یقینی تھا۔

امامؑ عراق کی سرحد میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے یزیدی فوجوں نے حرؔ کی قیادت میں آپکا راستہ روکا لیکن حرؔ نہ تو آپ کو گرفتار کر سکا اور نہ ایک ایسی غیر معروف منزل پر آپ سے جنگ کر سکا۔ جہاں جنگ کا مطلب آپ کے لئے گمنامی کی موت ہو سکتا تھا مقصدی اعتبار سے یہ بھی یزید کی ایک بڑی شکست تھی اور اس ٹکراؤ میں بھی امام کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ امام برابر اپنی منزل کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ اور یزیدی لشکر آپ کو کوفہ سے

قریب تر پہنچ جانے سے نہ روک سکا۔

اس سلسلہ میں امام کو ایک اور بڑی کامیابی یہ نصیب ہوئی کہ حُر اور اس کے ساتھیوں کو امام کے کردار اور آپ کے بلند مقاصد کے مطالعہ کا پورا موقع حاصل ہوا جس کے نتیجہ میں حُر اتنا متاثر ہوا کہ جب وہ روز عاشورہ آپ پر قربان ہو گیا تو کم از کم اس کے لشکری اتنے متاثر ضرور ہوئے ہوں گے کہ بعد شہادت ان کے لبوں پر مہر لگانا حکومت کے لیے ناممکن ہو گیا ہوگا۔ اور یہ دشمن کے سپاہی حسینی مقاصد کی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے ہونگے۔

امام کربلا پہنچے تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ سرزمین ساٹھ ہزار درہم میں خرید لی۔ اب امام سرزمین کربلا کے مالک تھے اس شرعًا اور قانونًا اس سرزمین پہ یزیدی فوجوں کی آمد ایک جارحانہ دراندازی کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار دی جا سکتی۔ اور یزید کی پوزیشن صاف صاف ایک ایسے حملہ آور کی ہو جاتی ہے۔ جو ایک شخص کی زمین پر لشکر کشی کر کے اس کے قتل و غارت کا بندوبست کر رہا ہو۔ قانونی، اخلاقی اور شرعی ہر اعتبار سے اس سرزمین پہ یزیدی فوجوں کا داخلہ ناجائز ہو جاتا ہے اور یزید کی حیثیت ایک مجرم کی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا غیر عادل، انصاف ناشناس اور قانون شکن بادشاہ ثابت ہو جاتا ہے۔ جسے خلیفہ کا لقب دینا خود لفظ خلافت کی تحقیر و توہین کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا!

امام چاہتے تو عشرہ محرم کی ابتدائی تاریخوں میں ہی یزید سے جنگ کر سکتے تھے۔ لیکن آپ جنگ کو ٹالتے رہے تاکہ یزیدی فوجوں کا زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو جائے۔ چنانچہ نویں محرم تک کربلا کے میدان میں ۲۵ ہزار آدمیوں کا اجتماع ہو گیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ چیز یزید کے لیے انتہائی

مہلک ثابت ہوئی اس لئے کہ جس واقعہ کو ۴۵ ہزار آدمیوں نے دیکھا ہو، اس پر پردہ ڈالنا یا آل رسول کو "ترک و دیلم کے باغی" قرار دینا اب قطعاً ناممکن ہو گیا اور بنی امیہ کی یہ تدبیر ناکام ہو گئی کہ خاموشی سے آل رسول کا خاتمہ کر دیا جائے۔

یزیدی لشکر نے نویں محرم کی شام کو جنگ چھیڑنا چاہی لیکن امام نے عبادت کیلئے ایک رات کی مہلت لے لی۔ اس طرح گویا لشکرِ یزید کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ حسینؑ اور یزید کے کردار، دونوں کے مقاصد جنگ اور دونوں کے موقف پر غور کرے۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ ایک بہت ہی اہم ضرب تھی جو یزید پر عائد کی گئی اس لئے کہ جس لشکر کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ حق کی خاطر نہیں لڑ رہا ہے اور ایسے لوگوں کے مقابلہ میں نبرد آزما ہے جو سرتاسر حق پر ہیں۔ اس لشکر کا نظم لازماً بگڑ جاتا ہے۔ اس کے سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، یزیدی لشکر میں نہ یادہ تر کوفہ کے لوگ تھے جو حسینؑ کی شخصیت سے واقف تھے۔ اور اب وہ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ ایک ایسا شخص جو آسانی سے بیعت کر کے موت سے بچ سکتا ہے نہ صرف یہ کہ موت کو لبیک کہہ رہا ہے بلکہ موت پر اتنا مطمئن بھی ہے کہ اپنی تمنائے عبادت پوری کرنے کے لئے ایک رات کی مہلت طلب کر رہا ہے اس واقعہ نے یزیدی سپاہیوں پر جو اثر ڈالا ہو گا اور رات بھر خیام حسینیؑ سے اٹھتی ہوئی تسبیح و تہلیل کی آوازوں نے دشمن سپاہیوں کے قلب پر جو تاثرات پیدا کئے ہونگے ان کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے —— اور اس کے نتیجہ میں ان کے عزم و حرب پر جتنے خراب اثرات مرتب ہوتے ہونگے، نفسیاتی طور پر ان کے دلوں میں جو کمزوری

پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے مشکل نہیں ہے!

دسویں کی صبح کو امام نے صفوفِ لشکر آراستہ کرتے ہی بریر بن خضیر ہمدانی کو لشکرِ مخالف کی جانب بھیجا کہ وہ اسے سمجھائیں، نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی ایک کاری ضرب تھی جو یزیدیت پر عائد کی گئی اس لئے کہ بریر کوفہ کے ایک مشہور عالم تھے اور لشکرِ مخالف میں سینکڑوں ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے بریر سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی، کوفہ کے سب سے بڑے عالم اور معلم قرآن کو سامنے دیکھ کے کوفی سپاہیوں کے دلوں کی جو کیفیت ہوئی ہوگی، ان میں اپنے طریق کار کی غلطی کا جو احساس ابھرا ہوگا اور ان پر جو ندامت طاری ہوئی ہوگی ——— اور پھر اس کے نتیجہ میں ان کے جذبہ جنگ میں جس حد تک کمی آئی ہوگی ان کے دلوں میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا بھی ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں ہے!

صبح عاشور کے اس پہلے ٹکراؤ میں حسینؑ کی کامیابی ناقابلِ تردید ہے!

بریر کی واپسی کے بعد خود امام میدان میں برآمد ہوئے اور کوفیوں کو اپنی منزلت سے آگاہ کرنے کے بعد آپ نے ان کے سامنے وہ خطوط پیش فرمائے جو انہوں نے امام کو کوفہ تشریف لانے کے متعلق روانہ کئے تھے۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی ایک غضب کا وار تھا، اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ دشمن ندامت کا شکار ہو کر ہمت چھوڑ دے۔ چنانچہ امام اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے، دشمن کا عزمِ جنگ، اس کی جرأت، اور اس کی جنگ آزمائی کی قوتیں اتنی کمزور ہو گئیں کہ ۷۲ آدمیوں کی ایک مختصر سی جماعت ۳۵ ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں دن بھر جنگ جاری رکھ سکی، جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ

آدھ گھنٹہ میں ختم ہو جاتی اور یزیدی لشکر ایک ہی ریلے میں حسینی جماعت کا خاتمہ کر دیتا!

عاشورِ محرم کی جنگ حق پرستوں کی تاریخ میں ہمیشہ آبِ زر سے لکھی جائے گی اس لئے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے مٹھی بھر انسانوں کا ایک لشکرِ عظیم سے دن بھر مردانہ وار مقابلہ اور دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں کا قتل، تاریخ شجاعت کا ایک ایسا محیر العقول کارنامہ ہے جس پر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے!

عمر بن حجاج زبیدی کی سرکردگی میں یزید کے دس ہزار سواروں نے امامؑ کے میسرہ پر جو صرف تیس آدمیوں پر مشتمل تھا حملہ کیا۔ کہاں دس ہزار سوار اور کہاں تیس پیادے، لیکن حبیب بن مظاہر نے اس خوب صورتی سے اس ریلے کو روکا کہ دشمن کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے۔ اور بالآخر اُسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ تاریخ اسے "حملہ اولیٰ" کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ اور اس میں یزیدی فوج کی شکست کا صاف صاف اعتراف کرتی ہے۔

ظہر کے وقت شمر کی سرگردگی میں یزید کے دس ہزار سپاہیوں نے پشت کی جانب سے خیام حسینی پر حملہ کیا۔ لیکن یزیدی فوج اس حملہ میں بھی ناکام رہی، اور شمر کو کافی جانی نقصان اٹھانے کے بعد پسپائی کا رُخ اختیار کرنا پڑا۔

نہر کے چار ہزار پاسبانوں کی حضرت عباسؑ کے مقابلہ میں شکست تاریخ کی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے!

حضرت علی اصغرؑ کی شہادت یزیدی فوج کی وہ اخلاقی ابدی شکست ہے

جس پر پردہ ڈالا جانا قطعاً محال ہے۔ عمر سعد کے لشکر کا بے شیر کی تشنگی پر رو دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس حسینی حربہ نے وحشیوں کے دلوں میں بھی سوئی ہوئی انسانیت کو تھوڑی دیر کے لئے جگا دیا تھا اور یزیدی لشکر کو ایک مرتبہ یہ احساس پیدا کرا دیا تھا کہ اس کی روش حق دشمنی اور انسانیت دشمنی پر مشتمل ہے!

حضرت علی اصغر کی شہادت کے بعد خود امام حسین علیہ السلام نے جنگ فرمائی اور اس قیامت کی جنگ فرمائی کہ لشکر یزیدی میں بھگدڑ مچ گئی۔ مورخین اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ لشکر یزیدی کا نظم اس درجہ بگڑ چکا تھا کہ اس میں ایک یکہ و تنہا انسان کا مقابلہ کرنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی اور امام نے اپنی مختصر سی جنگ میں تقریباً دو ہزار یزیدی سپاہیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ سے امام کا مقصد محض یہ تھا کہ جہاد کا فریضہ پورا کر لیا جائے اور یہ ظاہر کر دیا جائے کہ حق پرست مردانہ وار جنگ سے کبھی منہ نہیں پھیرتے!

چنانچہ یہ مقصد پورا ہو گیا تو آپ نے تلوار نیام میں رکھ لی، جنگ بند کر دی۔ اور اس مقصد عظیم کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے۔ جو یزیدیت کی شہ رگ کو ہمیشہ کے لیے کاٹ دینے والا تھا ـــــــ یعنی شہادت عظمیٰ!

امام علیہ السلام شہید ہو گئے۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ امامؑ کی شہادت کے ساتھ جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ اب بھی جاری رہی! بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد جاری رہی۔ یہ اور بات ہے کہ حق پرستوں کے لشکر کا سردار بدل گیا۔ حسینؑ بن علیؑ کی جگہ علی ابن الحسینؑ سالار لشکر ہو گئے۔

یا جس طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام نے جنگ کا انداز بدل دیا تھا اسی طرح امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام نے اندازِ جنگ بدل دیا۔ تیغ و سنان کی جگہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں نے لے لی، اور حبیب ابن مظاہر و زہیر و علی اکبر کے بجائے زینب و اُمِّ کلثوم و فاطمہ کبریٰ نے مورچے سنبھال لئے ــــــ بہرحال اندازِ جنگ بدلا۔ جنگ ختم نہیں ہوئی، اور اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں بعض کوتاہ فہم لوگ یہ فیصلہ دے دیا کرتے ہیں کہ معرکہ کربلا میں آلِ رسولؐ کو ظاہری طور پر شکست ہوگئی ــــــ واقعہ یہ ہے کہ ایک عظیم جنگ میں درجنوں چھوٹے بڑے معرکے ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں کبھی ایک فریق کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کا، لیکن ان چھوٹے چھوٹے معرکوں کی اساس پر شکست یا فتح کا فیصلہ نہیں کیا جاتا، شکست و فتح کا فیصلہ دراصل اختتامِ جنگ پر ہوتا ہے۔ اگر عاشور کے روز جنگ ختم ہوگئی ہوتی تو ہم لازماً یہ کہہ سکتے تھے کہ آلِ رسولؐ کو ظاہری شکست ہوئی لیکن چونکہ جنگ ختم نہیں ہوئی اس لئے امام کی ظاہری شکست کا فیصلہ کر دینا حقیقت سے بعید اور کوتاہ فہمی کا مظاہرہ ہے۔ معرکہ کرب و بلا دراصل مجاہدۂ حق و باطل کا ایک معرکہ تھا، جس میں بظاہر پلہ یزید کی جانب جھکا نظر آتا ہے، لیکن محض اس معرکہ کو اصل جنگ تصوّر کر لینا غلط ہے۔ ابھی جنگ جاری تھی، اور میدان جہاد میں نہ سہی، قید خانہ کی دیواروں میں لڑی جارہی تھی، اس لئے امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر فتح و شکست کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اس فیصلہ کیلئے ہمیں اختتامِ جنگ کا انتظار کرنا پڑے گا!

امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد لشکر یزید نے خانوادہ رسالت کی خواتین کو گرفتار کر لیا، اور یہیں سے بنی امیہ کی شکست کا آغاز ہو گیا۔ یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ پہنچا، ہم دربار کوفہ کے تفصیلی واقعات بیان نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ محض تین دن کے اندر اندر کوفہ کے حالات ایسے بدلے کہ عبیداللہ بن زیاد اہل حرم کو کوفہ سے دمشق روانہ کرنے پر مجبور ہو گیا، اس لئے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ اگر خانوادہ عصمت کی خواتین چند روز اور کوفہ میں رہ گئیں تو عراق میں زبردست بغاوت ہو جائے گی، اور یہ بغاوت ایسی ہو گی جس پر قابو حاصل کرنا اموی حکومت کے لئے ناممکن ہو جائے گا، عبیداللہ بن زیاد کے اس اقدام کو بظاہر ایک بڑی سیاسی دور بینی قرار دیا جائے گا۔ لیکن درحقیقت یہ اس کی انتہائی خوفناک غلطی تھی اس لئے کہ اس کے اس اقدام کے نتیجہ میں آل رسولؐ کو پہلی بار شام کی سرزمین پر قدم رکھنے اور شامیوں کے سامنے حقیقت اسلام اجاگر کرنے کا موقع ہاتھ آگیا، امام حسین علیہ السلام اپنے ساتھ خواتین کو جس غرض سے لے گئے تھے وہ پوری ہو گئی، اور شام کے جن دروازوں پر بنی امیہ نے پہرے بٹھا رکھے تھے وہ آل رسولؐ کے لئے پاٹوں پاٹ کھل گئے!

مقصدی اعتبار سے یہ بھی اموی سیاست کی ایک ہولناک شکست تھی!

کوفہ سے دمشق تک کا راستہ ایک دریائے خون تھا جس سے یزیدی لشکر کو گذرنا پڑا۔ راستہ میں انہیں مقامات پر یزیدی لشکر کو مقامی آبادیوں سے جنگ کرنا پڑی جن میں صرف ایک مقام پر یزیدی لشکر

کامیاب ہوا اور اٹھارہ مقامات پر اسے شکست اور فرار کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ لڑائیاں چھوٹی چھوٹی سہی لیکن ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ قتل حسینؑ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے سوئے ہوئے ضمیر بیدار ہو چکے تھے، اور بنی امیہ کا طلسم ٹوٹتا جا رہا تھا، آل رسولؐ کو سیاسی پسپائی، گمنامی اور تباہی کے غاروں میں دھکیل دینے کی سازش ناکام ہو چکی تھی اور اسلامی دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی تھی کہ قریش کے مفاد پرستوں اور بنی امیہ کے منافقوں نے اسے سخت دھوکا دیا ہے۔ اور آل رسولؐ یقیناً اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو اس سے کیا گیا ہے!

ہم یہ مانتے ہیں کہ عراق کی یہ لڑائیاں ایک وقتی اشتعال کا نتیجہ تھیں، اور ان کو کوئی اصولی حیثیت نہیں دی جا سکتی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار محال ہے کہ آل رسولؐ کی حمایت میں اس جذباتی مظاہرہ کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ مسلم عوام آل رسولؐ کی تحریک اور اس کے موقف پر غور کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آخر وہ کیا حالات تھے جن میں آل رسولؐ کو اتنی عظیم قربانی پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ —— اسلامی دنیا میں وہ کونسی دور رس اصولی تبدیلیاں وجود میں آ رہی تھیں جن کو روکنے کے لیے کربلا کا ہولناک سانحہ وجود پذیر ہوا؟ رسولؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر اندر یہ کیسے حالات ہو گئے جن میں رسولؐ زادیاں قید و بند کے مصائب جھیل رہی ہیں؟ یہ یزید کون ہے جس کے ہاتھوں پیغمبر اسلام کی اتنی کھلی ہوئی توہین ظہور میں آ رہی ہے؟ یزید تک منصب خلافت آنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ اگر اسے خلافت محض وراثت پدری کے طور پر حاصل ہوئی ہے تو اسلام میں

اس نسلی بادشاہت کا جواز کیسے پیدا کر لیا گیا ؟ اگر نسلی بادشاہت کا اسلام میں امکان تھا تو حضرت ابو بکر کے بعد ان کے بیٹے محمدؐ یا عبدالرحمٰن کیوں خلیفہ نہیں بنائے گئے ؟ یا حضرت عمر کے بعد عبداللہ بن عمر کو منصب کیوں نہ حاصل ہوا ؟ اگر نسلی بادشاہت کا اسلام میں کوئی وجود نہیں تو امیر معاویہ نے باوجود شرف صحابیت و عدالت یہ بدعت سیئہ کیوں جاری فرمائی ؟ —— اور پھر ذہن یہیں جا کے نہیں رُک سکتے تھے بلکہ یہ دماغوں میں یہ خیالات پیدا ہونا بھی ناگزیر تھے کہ امیر معاویہ کون تھے ؟ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ان کا کردار کیا تھا ؟ بدر و اُحد کے میدانوں میں وہ کس فریق کے ساتھ تھے ؟ ان کے خاندان کی اسلامی خدمات کیا تھیں ؟ ان کو خلافت کا استحقاق کس طرح حاصل ہو گیا ؟ اگر وہ محض بزور شمشیر، بلا کسی حق کے، خلیفہ بن بیٹھے تو کیا یہ بات اصولاً صحیح ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جس کو سازش فریب کاری، خونریزی اور قتل و غارت میں ملکہ حاصل ہو وہ نہ صرف یہ کہ خلیفہ رسولؐ بن سکتا ہے بلکہ اس کی خلافت کو دینی جواز بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ اس قسم کے آدمی کو اتنی طاقت حاصل کر لینے کا موقع کیسے حاصل ہو گیا ؟ اگر اسے یہ موقع اس لئے حاصل ہو گیا کہ اسے حضرت خلیفہ ثانی نے مملکت شام سپرد کر دی تھی تو کیا یہ خلافت مآب کی انتہائی تباہ کن غلطی نہیں تھی کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو شام کا گورنر بنا دیا، جس نے اوّل تو خلافت میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون نافذ کر دیا، اور دوسرے نسلی بادشاہت کی داغ بیل ڈال دی ؟

ممکن ہے کہ بعض آدمیوں نے اس کے بعد یہ بھی سوچا ہو کہ جس صاحب نے امیر معاویہ کے سے آدمی کو اتنی بڑی طاقت کا مالک بننے

کا موقع دیدیا یا وہ خود کس آئین و اصول کے ماتحت خلیفہ بن گئے تھے؟ اگر وہ نامزدگی کے نتیجہ میں خلیفہ مقرر ہوئے تھے تو ایک ایسے شخص کو جس نے معاویہ کے سے سازشی اور قاتل فرزندِ رسولؐ کو حصولِ خلافت کا موقع عنایت کر دیا۔ مسندِ خلافت پر بٹھا دینے کی غلطی کس سے صادر ہوئی تھی؟ اگر یہ غلطی ان کے پیشرو بزرگ سے ہوئی تھی تو ایک ایسے شخص کو دنیائے اسلام کی قیادت کیوں دیدی گئی جو اپنا جانشین مقرر کرنے میں اتنی بڑی غلطی اور ایسی غیر محتاط روش کا مرتکب ہوا؟ —— اور یہاں سے ذہنوں کا دھارا یقینی طور پر قریش کی سازش کی جانب مڑا ہو گا، سقیفہ بنی ساعدہ کے انتخاب اور اس کے اصول معرضِ بحث میں آئے ہوں گے، اور اس طرح لوگوں کے لئے گذشتہ حالات کی تحقیق و تنقید اور اسلامی سیاست کے پس منظر پر بحث و نظر کے دروازے کھل گئے ہوں گے —— اور یہی آلِ رسولؐ کی بہت بڑی کامیابی ہے!

یہ صرف قیاسی بات نہیں ہے بلکہ واقعہ کربلا کے اسباب پر اس وقت سے لے کر آج تک جب بھی بحث کی جاتی ہے تو ذہنوں میں ہمیشہ یہی سوالات ابھرا کرتے ہیں، ایسی حالت میں ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کوفہ سے دمشق تک آلِ رسول کی تشہیر سے لازمی طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیالات پیدا کئے ہوں گے۔ چنانچہ اس اندازِ فکر ہی کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر کو قریش کی پوری حمایت حاصل ہونے کے باوجود حصولِ حکومت میں ناکامی ہوئی، اور آلِ رسولؐ کربلا میں پامالی اور قتل و غارتگری کا شکار ہونے کے باوجود مسلمانوں کے ذہنوں پر اتنی حاوی ہو گئی کہ بنی عباس نے اس کا نام لے کر بنی امیہ

وجود تک صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، اور مسلم عوام میں عام طور پر یہ احساس بیدار ہو گیا کہ خلافت آلِ رسولؐ کا حق تھا، جس حق سے انہیں سازشوں کے ذریعہ محروم کر دیا گیا تھا!

عبداللہ بن زبیر نے یہ سمجھا تھا کہ لوگوں میں صرف یزید کی مخالفت عام ہوئی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ مسلم عوام بنی امیہ سے برہم ہو گئے ہیں، ایسی حالت میں وہ لازماً دوبارہ قریش کے اس مفاد پرست طبقہ کو برسرِ اقتدار لانے میں مدد دیں گے جس کو بنی امیہ نے حصولِ اقتدار کے بعد دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا تھا۔ لیکن یہ ان کی بھول تھی، قتلِ حسینؑ سے لوگوں کے دلوں کو جو زبردست دھچکا لگا تھا، ان کے دماغوں پر جو شدید جھٹکے پڑے تھے ان کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ لوگ بنی امیہ کے مخالف ہو گئے تھے بلکہ قریش کا طلسمِ سیادت بھی ٹوٹ کے تار تار ہو چکا تھا، لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ یزید کے ہاتھوں فرزندِ رسولؐ کا قتل اور رسول زادیوں کی تشہیر صرف ایک فردِ واحد کی ذاتی غلطی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہے گذشتہ پچاس سال کی سیاست کا، قریش اس حرصِ اقتدار کا جس نے آلِ رسولؐ کو مسلمانوں کی قیادت کے الٰہی حق سے محروم کرا دیا تھا، قریش کی اس سیاسی غلطی کا کہ انہوں نے بنی امیہ کو شام کی گورنری تفویض کر دی تھی اور اس غلط سیاسی و معاشی نظام کا جو قریش کے حکمرانوں نے اسلامی دنیا پر نافذ کیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے نتیجہ میں صرف بنی امیہ کے "استحقاقِ خلافت"، کا خاتمہ نہیں ہوا۔ قریش کے "استحقاقِ حکومت"، کا طلسم بھی پاش پاش ہو گیا، اور مسلم عوام نے یہ سمجھ لیا کہ مسندِ خلافت اگر شراب خور یزید کیلئے نہیں تو خانہ کعبہ میں اعتکاف کا ڈھونگ رچانے والے عبداللہ بن زبیر کیلئے

بھی نہیں ہے۔

اِس مسند کے اہل آلِ رسول ہیں۔ اور یہ منصب صرف انہیں کو زیب دیتا ہے! ——— چنانچہ شہادت حسینؑ کے بعد کوئی مدعی خلافت صحابیت، تابعیت یا قریشیت کی اساس پر خلافت کا دعویٰ نہیں کر سکا بلکہ خلافت کا مطالبہ اگر کیا گیا تو یا آلِ رسولؐ کے نام پر، جیسے بنی عباس یا مصر کے بنی فاطمہ کا مطالبہ، اور یا پھر "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول کی بنیاد پر۔ جیسا کہ آلِ عثمان کی خلافت، جو سرتاسر

"ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند"

کی اساس پر وجود میں آئی تھی!

بہر حال راستہ کٹا اور لشکر یزید دمشق میں داخل ہوا۔ یزید خوش تھا کہ اس نے آلِ رسولؐ کو قتل اور قید کر کے اسلام کے خاتمہ کا بندوبست کر دیا ہے۔

اور تحریک اسلامی کا چوتھا قائد حسینؑ کا جانشین، مسرور تھا کہ شامیوں کے دلوں کو مسلمان بنانے کی جو تمنا علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے دلوں میں مستور رہی۔ وہ اس کے ہاتھوں پوری ہو رہی ہے۔

قافلہ بڑھتا رہا اور اس کے ساتھ ہجوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ خلیفہ ثانی کے دور کی نسل جسے جبراً مسلمان بنالیا گیا تھا جو بظاہر مسلمان اور بباطن عیسائی تھی، چالیس سال بیت جانے کی وجہ سے تقریباً ختم ہو چکی تھی! اب اس مجمع میں وہ لوگ تھے جو اپنی پیدائش کے وقت سے یہ سنتے رہے تھے کہ وہ "مسلمان" ہیں۔ لیکن اسلام کیا ہے؟ اس سے قطعاً بے خبر تھے۔ ان کو صرف "معاویہ شاہی اسلام" کی خبر تھی:-

"آلِ رسولؐ کے اسلام" کا کوئی علم نہیں تھا۔ پیغمبرؐ اسلام کا انہوں نے نام ضرور سُنا تھا لیکن آنکھیں کھول کے دیکھا صرف معاویہ اور یزیدؔ کو تھا۔ اور انہیں کو وہ اسلام کا مظہر تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک اسلام اللہ کی اطاعت اور باری تعالیٰ کی محبت کا نام نہیں تھا، یزیدؔ اور اس کے خاندان کی اطاعت و محبت اسلام تھی۔ اس مجمع نے پہلی بار ایک ایسے بیمار مرد اور چند ایسی قیدی عورتوں کو دیکھا جن کے متعلق اسے معلوم ہوا کہ یہ پیغمبرؐ اسلام کی ذریت ہیں۔ یہ اس کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھی، سکتہ میں ڈال دینے والی تھی، ایسی چیز تھی جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ——— لوگوں کے دلوں پر ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ ششدر سے رہ گئے۔ ان کے ذہن تھوڑی دیر کے لیے ماؤف ہو گئے ان سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں ——— آخر یہ کیا؟ جس رسولؐ کا ان کو کلمہ پڑھوایا گیا۔ ان کا فرزند زنجیروں میں جکڑا ہوا ——! اس کی بیٹیاں رسن بستہ اور اس کے جگر پاروں کے سر نوک نیزہ پر! —— آخر کیوں؟ نسلِ رسولؐ اور جانشین رسولؐ میں جنگ کیوں؟ خلیفہ وقت کے ہاتھوں خانوادہ رسالتؐ کی تباہی آخر کس لئے؟

اور اگر رسولؐ کے مسند نشین یزیدؔ اور رسول کی آل میں ایک خونی ٹکراؤ ظہور میں آیا تو اس میں خطا کس فریق کی ہے؟ کون حق پر ہے اور کون غلط کار؟ کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟

ناممکن ہے کہ اس قسم کے خیالات شامیوں کے دلوں میں

پیدا نہ ہوئے ہوں ـــــ اور آلِ رسولؐ نے اس نفسیاتی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے محترم ارکان نے اس مجمع کو حقیقت حال سے آشنا کیا اور سید سجادؑ، سیدہ زینبؑ اور سیدہ ام کلثومؑ نے اس مجمع کے سامنے وہ دل ہلا دینے والی تقریریں کیں جن سے دمشق کے در و بام کانپ اٹھے۔ یہ صحیح ہے کہ یزیدی سپاہیوں نے ان کو زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن نفسیات کے ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ایسے پرہول مقامات پر زیادہ بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ابھرے ہوئے جذبات پر چند موثر الفاظ ہی وہ کام کر دکھاتے ہیں جو دوسرے مقامات پر لمبی لمبی تقریروں سے نہیں لیا جا سکتا۔ آل رسولؐ کے محترم ارکان کی زبانوں سے نکلے ہوئے چند الفاظ نے شامیوں کو سوچ میں ڈال دیا۔ ان کو فکر کی ایک نئی راہ دکھا دی۔ آپس میں بات چیت کا ایک نیا موضوع دے دیا۔ تاکہ جب وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوں تو گھروں میں، بازاروں میں، ہر جگہ صرف اسی موضوع پر بات چیت کریں کہ

"پیغمبرؐ کی اولاد ذبح کر ڈالی گئی، بقیۃ السیف ہمارے شہر میں قیدی کی حیثیت سے لائی گئی ہے"

ظاہر ہے کہ دمشقیوں نے پہلی بار آل رسولؐ کو دیکھا تھا، اور بالکل غیر معمولی حالات میں دیکھا تھا۔ اس لئے یہ لازمی چیز ہے کہ دمشق کے گھر گھر میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہوگا۔ لوگوں نے یزیدؔ

حسینؑ کی جنگ کے اسباب پر گفتگو کی ہو گی۔ دونوں کے کردار کا تقابل کیا ہوگا۔ اسلام اور بانی اسلام سے دونوں کے رشتہ و تعلق پر تبادلہ خیال کیا ہوگا۔ آل رسولؐ سے یزیدؔ اور معاویہ کے تعلقات زیر بحث آئے ہوں گے۔ اور ان سب کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، آل رسولؐ کی جیت ہمیشہ اسی چیز میں رہی ہے کہ لوگوں میں فکر کا جذبہ ابھر جائے اس لئے کہ جب بھی لوگ معاملات کی تحقیق کریں گے، چھان بین کریں گے اور تعصّبات سے ہٹ کے آزادانہ فکر کریں گے تو حق کے چہرے پہ پڑی ہوئی نقابیں لازماً الٹ جائیں گی، آفتاب حقیقت پر چھائی ہوئی بدلیاں یقینی طور پر چھٹ جائیں گی۔ اور اسی میں سچائی کی فتح تھی!

دارالخلافہ میں یزیدؔ کی یہ پہلی شکست تھی!

دربار میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے دامن میں آج تک محفوظ ہے، یزیدؔ نے قیدیوں سے سخت گفتگو کی تاکہ اہالیان دربار پہ اس کی شوکت، طاقت اور دبدبہ ظاہر ہو، لیکن آل رسولؐ کی جانب سے اس کو جو جوابات دیئے گئے وہ ایسے تھے کہ حاضرین پر سناٹا چھا گیا، خود یزیدؔ کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی، طاقت کے ساتھ ہی شراب کا نشہ بھی ہرن ہو گیا۔ اور یزیدؔ کو اپنی ناکامی پہ پردہ ڈالنے کے لئے آل رسولؐ کو قید خانہ بھیج دینا پڑا۔!

دربار میں سینکڑوں آدمی موجود تھے اس لئے یہ لازمی امر

ہے کہ دربار کے واقعات بھی شہر میں مشہور ہوئے ہوں گے۔ اور مشہور ہونا بھی چاہیئے تھے اس لئے کہ یہ قیدی کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ یہ وہ آلِ رسول تھی جن کا ذکر دمشقیوں نے ہمیشہ سُنا تھا۔ لیکن جسے دیکھنے کا شرف ——— اور پھر قطعاً غیر معمولی اور حیران کن حالات میں دیکھنے کا موقع ان کو زندگی میں پہلی مرتبہ نصیب ہوا تھا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یقیناً لوگوں کو فکر اور تشویش ہو گی۔ لوگ واقعہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ جزو معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہوں گے۔ دربار سے پلٹنے والوں سے ایک ایک بات مکرر، سہ کرر پوچھی گئی ہو گی، اور پھر اس پر آپس میں گفتگو کے سلسلے چھڑے ہوں گے، ہماری تاریخیں اس باب میں خاموش ہیں۔ اس لئے کہ تاریخیں صرف سلاطین و ملوک کی داستان بیان کرتی ہیں، عوام کی کیفیات، جمہور کے افکار اور نفسیاتی اثرات وعوامل سے بحث نہیں کرتیں۔ تاریخ کی اس کمی کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے اس لئے کہ نفسیاتی عوامل اور عوام کی ذہنی و فکری کیفیات کو سامنے رکھے بغیر تاریخ کی رفتار اور واقعات کی نوعیت کو سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔ دمشق کی جس کیفیت کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اس قسم کے حالات میں نفسیاتی اعتبار سے بالکل درست ہے اور شامی عوام کے ان افکار اور اس نئے رجحان کا اموی سیاست پر جو اثر پڑنا چاہیئے، وہ اظہر من الشمس ہے!

آلِ رسولؐ کی دربار میں بار بار طلبی یزیدی سیاست کی ایک اور بڑی شکست تھی، یزید کا خیال تھا کہ اس طرح عوام پر اس کی

سطوت شاہانہ، اس کی قوت وجبروت، اس کے قہر واقتدار اور اس کے غلبہ وجلال کا اثر قائم ہو جائے گا، لیکن نفسیاتی اور سیاسی نقطہ نظر سے اس کا یہ اقدام اس کے لئے تباہ کن تھا، آل رسولؐ کو عوام کی ہمدردیاں حاصل ہوتی جارہی تھیں۔ عوام میں یزیدؔ کی غلط کاری کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا اور وہ شام جسے آل رسول سے بے خبر رکھنے پر معاویہ نے اپنی ساری قوتیں مرکوز کردی تھیں یزید کی اس غلطی کے نتیجہ میں آل رسولؐ کے تذکار مبارکہ سے گونجنے لگا تھا۔ دربار اور زندان خانہ کے درمیان جو خاموش معرکہ جاری تھا اس میں روز بروز سید سجادؑ کا پلہ بھاری ہوتا جارہا تھا۔!

امام زین العابدینؑ کو بھی اپنی اس کامیابی کا پورا احساس تھا، چنانچہ آپ نے بھی رفتہ رفتہ اپنے انداز میں تبدیلی کرنا شروع کی۔ پہلے آپ دربار میں آتے تھے تو ایک مجبور اور بے بس قیدی کی طرح، لیکن جب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ اب شامی عوام میں آل رسولؐ کی ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جارہا ہے تو آپ نے یہ انداز تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اور یزیدؔ پر دباؤ ڈالنے کی روش اختیار کی، پہلے آپ کا رُخ بالکل دفاعی ہوتا تھا اب آپ نے یزیدؔ کو دفاعی رخ اختیار کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جامع مسجد دمشق میں آپ نے۔

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ

کی آواز پر یزید سے جو سوالات کئے وہ آپ کے اس بدلے

ہوئے انداز کا کھلا ہوا ثبوت ہیں ، اور اس موقع پر یزیدؔ کی یہ پسپائی اور مجبوری قابلِ دید ہے کہ وہ آپ کو مسجد جامع میں خطبہ کہنے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن جب یہ دیکھتا ہے کہ بازی اُلٹی جا رہی ہے تو مجبوراً اقامت کا حکم دے کر اس تقریر کو جو ایک بے بس قیدی کے انداز میں نہیں ایک فاتح کے انداز میں کی جا رہی تھی ختم کرا دیتا ہے ۔ اس تقریر کا انداز دیکھئے اس کے تیور دیکھئے اس کی رجز خوانی ملاحظہ فرمایئے ۔ اور پھر سوچئے کہ کیا کوئی مجبور اور بے بس قیدی اپنی شان میں ایسی باتیں کہنے کی جرأت کر سکتا ہے ؟ کیا کسی شکست خوردہ اور پامال انسان کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ وہ فاتحین کی موجودگی میں اس انداز سے اپنی بڑائی بیان کرے ؟ اور کیا کوئی مغلوب ، مقہور اور مفتوح فریق بھرے مجمع میں وہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکتا ہے ۔ جو سید سجادؑ کی زبان سے ادا ہو رہے تھے ؟ ——————— یہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے ، کہ حالات بدل چکے تھے ۔ عوام میں آلِ رسول کی حمایت بڑھتی جا رہی تھی ، اور یزید کی عارضی کامیابی شکست میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی !

زمانہ نے ایک اور کروٹ بدلی ۔ اور اب دنیا نے دیکھا کہ یزیدؔ اپنے منہ پر طمانچے مار رہا ہے ۔ اور اس کی زبان سے

مَا لِیْ وَ لِقَتْلِ الْحُسَیْنِ

کے ندامت خیز الفاظ جاری ہو رہے ہیں !

سوال یہ ہے کہ یہ ندامت کس قسم کی تھی ؟ کیا یزیدؔ کو قتلِ

حسینؓ کے "مذہبی" جرم کا احساس ہو گیا تھا؟ کیا اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آلِ رسولؐ لائقِ احترام تھی اور اس نے اس کی تذلیل کر کے ایک گناہ کبیرہ انجام دیا ہے؟

نہیں! ——— بالکل نہیں!

یزید نہ جنت و نار کا قائل تھا، نہ نبوت و رسالت کا ماننے والا تھا۔ جس کا ثبوت آج بھی اس کے اقوال سے ملتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو "گناہ" کا احساس پیدا ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ گناہ و ثواب، جزا و سزا، انعام و عقاب کا سوال اس شخص کے لئے پیدا ہوتا ہے جو دین پر ایمان رکھتا ہے، جو رسول اللہؐ پر ایمان رکھتا ہے۔ جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن جو شخص یہ کہتا ہو کہ

"نہ کوئی وحی آئی نہ کوئی پیغام، بلکہ یہ سب
ایک ڈھونگ تھا، جو بنی ہاشم نے حصولِ سلطنت
کے لئے رچایا تھا!"

یا

"پی اے محبوبہ طناز پی! اگر مذہبِ اسلام
میں پینا ممنوع ہے تو دینِ مسیحی پر پی۔ اس لئے
کہ اس دنیا کے بعد کوئی زندگی نہیں، جنت
اور دوزخ سب ڈھکوسلا ہیں"

اسے قتلِ حسینؓ کو "گناہ" تصور کرتے ہوئے اس پر نادم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی؟۔

دراصل یزید کو ندامت اپنی "سیاسی شکست" پر تھی اس لئے کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ حسینؑ کے قتل اور آل رسولؐ کی گرفتاری سے اس کی جو غرض تھی وہ ناکام ہو چکی ہے، وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جس اسلام کو وہ مٹا دینا چاہتا تھا اس کی جڑیں خود شام میں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں، اُسے یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ جو شامی پہلے سو فیصدی بنی امیہ کے حامی تھے اب آل رسول کے طرفدار ہوتے جا رہے ہیں اور جس مملکت کے استحکام کے لئے اس نے آل رسولؐ کو قتل کر ڈالا، اس مملکت کی بنیادیں اس قتل کے نتیجہ میں ہل گئی ہیں۔ بادشاہ کی حیثیت سے اسے مملکت کے ہر حصہ کی خبریں پہنچتی تھیں۔ ایسی حالت میں وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ قتل حسینؑ نے عراق کو برہم کر دیا ہے۔ حجاز میں آگ بھڑکا دی ہے، ایران اور یمن میں نفرت پھیلا دی ہے، اور خود شام میں عوام کے تیور بدل چکے ہیں۔ رعایا میں بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، بنی امیہ کا سارا وقار جسے جھوٹی حدیثوں کے سہارے قائم کیا گیا تھا ایک بڑے جھٹکے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے، خود اس کا نام لوگوں کیلئے گالی بن گیا ہے۔ نسل ابوسفیان نفرت و حقارت کا مرکز بن گئی ہے۔ اور جس آل رسولؐ کو مٹانے کی مہم میں قریش کے مفاد پرستوں اور بنی امیہ کے منافقوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ عوام کی نگاہوں، محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز بن گئی ہے ــــ اور یہ سب قتل حسینؑ کی بدولت ــــ اس لئے یزید کو حسینؑ کے قتل حسینؑ پر ندامت محسوس ہو رہی تھی، مذہبی احساس پر نہیں،

خالص سیاسی مصالح کی بنیاد پر!

یزیدؔ کو حسینؑ کی مذہبی حیثیت کا احساس ہو جاتا اور وہ اپنے "گناہ" پر نادم ہوتا تو خانہ کعبہ پر آتش باری نہ کرتا، مسجد نبوی میں گھوڑے نہ بندھواتا اور ان مقدس شہروں میں خون کی ندیاں نہ بہائی جاتیں، ان واقعات کا ظہور بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ یزیدؔ میں کوئی مذہبی احساس نہیں تھا، اور آل رسولؐ کی تاراجی پر اس کا ماتم اس لئے نہیں تھا کہ دوزخ کا خوف ستا رہا تھا، یا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عتاب کا خوف اس کے دل پر غالب ہو گیا تھا۔ واقعہ بس اتنا تھا کہ یزیدؔ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ قتل حسینؑ کے نتیجہ میں اسلام مٹنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ آل رسولؐ کے اثرات ختم ہونے کے بجائے ہزاروں گنے بڑھ گئے ہیں اور اموی سیاست معرکہ کربلا کے نتیجہ میں ذلت آمیز طریقہ پر ناکام ہو گئی ہے!

آل رسولؐ ایک سال شام میں رہی اور سال بھر میں حالات اتنے بدل گئے کہ یزیدؔ کو اپنا تخت حکومت لرزتا نظر آنے لگا۔ اب اس کے سامنے صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ آل رسولؐ سے صلح اور دوستی کا ڈھونگ رچا کے معاملہ کو رفع دفع کر دیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ آل رسولؐ ایک سال کی مسلسل اسیری اور تکالیف کے نتیجہ میں اتنی پریشان ہو چکی ہو گی کہ مژدہ رہائی سنتے ہی شاد شاد ہو جائے گی اور یزیدؔ سے "صلح" کو غنیمت شمار کرتے ہوئے اسی غیر فیصلہ کن طریقہ پر لڑائی ختم کر دیگی

جس طرح میدان صفین میں ختم ہو گئی تھی!

یزیدؑ کی جانب سے رہائی کی پیشکش دراصل ویسی ہی چال تھی جیسی کہ میدان صفین میں نیزوں پر قرآن بلند کر کے عمر عاص نے چلی تھی اور جس کے نتیجہ میں امیر المومنینؑ کی جیتی ہوئی لڑائی غیر فیصلہ کن طریقہ پر ختم ہو گئی تھی ———— لیکن یزیدؑ اس حقیقت کو بھول رہا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے اب صفین کا میدان نہیں ہے۔ اور اس مرتبہ آل رسولؐ کے ساتھ وہ ضعیف الاعتقاد لوگ نہیں ہیں جو عمر عاص کی چال میں پھنس کے امام زمانہ کی مخالفت پر تیار ہو گئے تھے اب آل رسولؐ فیصلہ کن جنگ لڑ رہی ہے۔ اور علی ابن الحسینؑ بظاہر بیمار کمزور اور ستم رسیدہ ہیں اتنے کمزور قلب و دماغ کے مالک نہیں ہیں۔ کہ محض رہائی کی خاطر ایک جیتی ہوئی جنگ کو غیر فیصلہ کن نتیجہ پر ختم کر دیں اور بنی امیہ کو یہ موقع دیدیں کہ وہ دوبارہ اپنے اکھڑے ہوئے قدم جما لیں، اپنی شکست پر پردہ ڈالدیں۔ اور معاملات پر لیپ پوت کر کے اپنا کھویا ہوا وقار چند دن میں دوبارہ بحال کر لیں، یزیدؑ نے امام زین العابدین علیہ السلام کے متعلق جو اندازے قائم کئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے۔ خون بہا کی پیشکش حقارت کے ساتھ ٹھکرا دی گئی اور امامؑ نے صاف الفاظ میں یزیدؑ کو مطلع کر دیا کہ اب آل رسولؐ مکمل اور واضح فتح کے حصول سے کم پر راضی نہیں ہو سکتی۔ یزیدؑ نے چاہا تھا کہ خون بہا پر معاملہ ٹل جائے۔ لیکن سید سجادؑ نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ہم دمشق میں اپنے شہداء کا ماتم کریں گے جس کا ہمیں موقع دیا جائے!

بظاہر یہ بڑا معصومانہ اور بے حد مظلومانہ مطالبہ تھا۔ لیکن یہ حقیقت یہ حکمت ربانی کے چو تھے امین کی سیاست الٰہیہ کا شاہکار تھا۔ یزیدؔ کے شاہی محل میں حسینؑ کا ماتم نہیں ہو رہا تھا آلِ رسولؐ کی فتح مبین کا اعلان کیا جارہا تھا۔ اب یزیدؔلعین کی حیثیت ایک ادنٰے قیدی کی سی تھی جو محل کے ایک گوشہ میں بیٹھا اموی سیاست کی ناکامی پہ حسرت کے آنسو بہا رہا تھا۔ اور وہی شامی جو کبھی معاویہ کے جانثار کہلاتے تھے سیّد سجادؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر آلِ رسولؐ کو نذرانہ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ شامی عورتیں سیّدہ زینبؑ اور سیّدہ ام کلثومؑ کے قدم چوم رہی تھیں۔ علی ابن الحسینؑ کی امامت کا آفتاب دمشق میں چمک رہا تھا۔ اور

"واحسیناہ"

کی صداؤں سے بنی امیہ کی باطل پرستی کا اعلان کیا جارہا تھا، معاویہؔ اور یزیدؔلعین کے جس محل میں ہمیشہ آلِ رسولؐ کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں۔ اس پر اب آلِ رسولؐ کا قبضہ تھا۔ جن ایوانوں میں کبھی یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ علیؑ پر سب و شتم کیا جائے انہیں ایوانوں میں آج علیؑ اور آلِ علیؑ کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ جس راج محل میں قتل حسینؑ کا فیصلہ کیا گیا تھا اسی کے در و دیوار حسینؑ کے نام سے گونج رہے تھے، اور جس شام کے لوگ علیؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کی دشمنی کو اپنا ایمان تصور کرتے تھے اسی شام کی آبادی آج آلِ رسولؐ کے قدموں پہ سجدہ ریز تھی۔ آج کوئی شامی یزیدؔلعین کا حامی نہیں تھا۔ بنی امیہ کا پرستار نہیں تھا، آلِ ابی سفیان کا مدح خواں نہیں تھا۔ آج سب کی زبانوں پہ علیؑ بن الحسینؑ

کا نام تھا۔ زینبؑ کا نام تھا، ام کلثومؑ کا نام تھا، اور اس اعتبار سے اس علیؑ بن ابی طالبؑ کا نام تھا جس سے شامیوں کو برگشتہ رکھنے کے لئے معاویہ نے .... حدیث سازی، قتل غارت، غرض ہر تدبیر استعمال کی تھی، بیس سال کے قلیل عرصہ میں زمانہ ایسا بدلا کہ معاویہ کے شاہی محل میں علیؑ کے لال کا ماتم ہونے لگا، معاویہ کا جگر بند چوروں کی طرح ایک کمرے میں چھپ کے اشک افشانی پر مجبور ہوا۔ اور علیؑ کے فرزند کے ماتم سے شاہی محل کے در و دیوار ہل گئے ——— یہ فتح مبین کا اعلان تھا، اس فتح مبین کا اعلان جس پر کوئی پردہ ڈالا جانا محال ہے!

یزیدؔ کی جانب سے خون بہا کے نام سے جو رقوم حضرت علی بن الحسین علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی گئی تھیں وہ دراصل وہی تھیں جن کو آج کی اصطلاح میں "تاوان جنگ" کہا جاتا ہے۔ یزیدؔ فاتح ہوتا تو وہ ہرگز تاوان جنگ پیش نہ کرتا بلکہ شاید آل رسولؐ سے تاوان وصول کرتا۔ اس لئے کہ تاوان ہمیشہ مفتوح ادا کرتا ہے۔ فاتح نہیں دیا کرتا، یزیدؔ کا تاوان جنگ، پیش کرنا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی شکست کا اعتراف کر رہا تھا!

یزیدؔ کے گھر سے آٹھ روز تک مسلسل حسینؑ اور آل رسولؐ کی حقانیت اور کامرانی کا اعلان ہوتا رہا اور جب یہ حقیقت ناقابل انکار حد تک واضح کی جاچکی کہ اس جنگ میں آل رسولؐ کو مکمل اور واضح فتح ہوئی ہے تو تحریک اسلامی کے چوتھے قائد نے یہ فیصلہ کیا کہ اس فتح مبین سے ساری دنیا ئے اسلام کو آگاہ کردیا جائے

چنانچہ دمشق سے کربلا جانے کا اعلان کیا گیا تاکہ جس عراق کی سرزمین پہ آل رسولؐ کو قتل اور قید کیا گیا تھا۔ جہاں اہل بیت کی خواتین گرفتار کی گئی تھیں، جہاں عبیداللہ بن زیاد کی ہیبت سے کمزور دل مسلمان اپنے ایمان تک سے دستکش ہو جایا کرتے تھے۔ وہاں بھی آل رسولؐ کی کامیابی و کامرانی کے پرچم بلند کر دیئے جائیں!

آلِ رسولؐ کا قافلہ دمشق سے روانہ ہوا۔ اور اس شاہانہ کرّ و فر سے روانہ ہوا کہ آگے آگے پانسو آہن پوش محافظ ہاتھوں میں نیزے سنبھالے نگاہیں جھکائے، ادب سے رواں، ان کی پشت پر زرکار محملوں میں بیبیاں ان کے عقب میں تحریک اسلامی کا چوتھا قائد، مسلمانوں کا امام، رسولؐ کا جانشین علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا دلبند، علی بن الحسینؑ!

اور آخر میں یزید اور اس کے ارکان سلطنت، اپنی شکست اور ناکامی پر ماتم کناں، اموی سیاست کی پامالی پر سینہ کوب، اسلام کی اس عظیم فتح پر دل ریش!

یہ کسی گرفتار محن، دلشکستہ، مجبور و مقہور، شکست خوردہ اور مغلوب انسان کی سواری نہیں تھی، یہ ایک فاتح کا جلوس ہے، اس فاتح کا جلوس جس نے ایک مجبور قیدی بن کے شام میں زندگی کا ایک سال بسر کیا تھا۔ اور اس قلیل عرصہ میں شام کو ہمیشہ کے لئے "اسلام کا قیدی" بنا دیا تھا۔

ایک ایسے فاتح کا جلوس جو صرف چند بے بس عورتوں اور چند کمزور بچوں کا "لشکر" لے کر اسلام کی لڑائی لڑنے آیا تھا۔ لیکن اس نے ایسا شاندار جہاد کیا کہ ایک عظیم اور ظالم سلطنت اس کے

سامنے سربسجود ہوگئی۔ جس نے دنیا کو حق پرستوں کی جنگ کے ایک بالکل نئے انداز کی تعلیم دی، تیغ وسنان کے مقابلہ میں اشک وآہ اور ظلم وستم کے مقابلہ میں مظلومانہ جرأت واستقلال سے کام لینا سکھایا۔ اور جس نے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے باطل کے شور بے ہنگام کو دبا دینے کے وہ اصول دنیا کو بتلا دیے جو رہتی دنیا تک انسانیت کے مشعل راہ کا کام دیتے رہیں گے!

آج نہ وہ شمر[۲] تھا جو سید سجاد[۲] پر کوڑے برساتا تھا۔ نہ وہ خولی[۳] تھا جو اپنے نیزہ پر سر حسین[۲] کی نمائش کرتا تھا۔ نہ وہ عمر سعد[۳] تھا جو سرداری لشکر پر نازاں تھا۔ اور نہ وہ خونخوار سپاہی تھے جو عورتوں پر ستم توڑنے میں پیش پیش تھے۔ ——— یہ سب سین سے غائب تھے۔ ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ سامنے آئیں اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ دنیا ان پر تھوکے گی، وہ جنگ بھی ہار چکے تھے اور عزت کی بازی بھی ہار چکے تھے۔ آج وہ ذلیل تھے، بد تھے، حقیر تھے، اور دوسرے تو خیر خود یزید[؟] کی نگاہ میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اس لئے کہ یزید[؟] یہ سمجھ رہا تھا کہ بنی امیہ کے مقاصد کی دائمی اور ابدی شکست کو قریب تر لانے کی ذمہ داری میں ان لوگوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے!

قافلہ شاہی محل سے نکل کے بازار میں پہنچا۔ اچانک سید سجاد نے قافلہ کو رکنے کا حکم دیدیا۔ اس لئے کہ تحریک اسلامی کے قائد نے چلتے چلتے پھر ایک بار اپنی فتح مبین کا اعلان ضروری سمجھا تھا۔ ہزاروں شامیوں کے مجمع میں سید الساجدین[۳] نے تقریر شروع کی۔

تقریر جس میں آپ نے اموی سیاست کو پوری طرح بے نقاب کر ڈالا، جس میں آپ نے آل رسولؐ کے مقاصد پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے۔ جس میں آپ نے شامیوں کے سابقہ کردار کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ اور وہ زلزلہ خیز حقائق بیان فرمائے جنہیں سن کے مجمع میں کہرام مچ گیا، ہر آنکھ اشکبار ہو گئی اور ہر گردن ندامت سے جھک گئی ——— ظاہر ہے کہ ایک مجبور قیدی، قید زندان سے چھوٹ کے، دشمن کے دارالحکومت میں، ایسی تقریر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سید سجادؑ نے وہ تقریر فرمائی جو ایک ایسا فاتح ہی کر سکتا ہے جس نے دشمن کو اس بری طرح کچل ڈالا ہو کہ اب اسے غنیم کے دوبارہ ابھرنے کا خوف مطلق باقی نہ رہا ہو ——— اور سید سجادؑ ایسا کیوں نہ کرتے! ——— اللہ نے ان کے دست حق پرست پر اسلام کو وہ فتح عظیم عطا فرمائی تھی کہ جو قیامت تک شکست میں تبدیل ہونے والی نہیں تھی، آج قریشی مفاد پرست بھی ہار چکے تھے اور منافقین بنی امیہ کی کمر بھی ٹوٹ چکی تھی، دین حنیف کے لیے ہر خطرہ ختم ہو چکا تھا، خلافت ربانی کے اصول واضح ہو چکے تھے، صحابیت کے پردہ میں جو باطل ابھرا تھا اس کا دامن تار تار ہو چکا تھا، انسان پر انسان کی حکومت کے جس باطل اصول کو قریش نے صحابیت سے اور بنی امیہ نے تلوار سے نافذ کر دیا تھا۔ آج شکست کیا جا چکا تھا۔ نسلی بادشاہت کو منافی اسلام ثابت کیا جا چکا ہے۔ خلافت کی تقدیس اور آبرو بچا لی گئی تھی، اسلام کے اصول محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ ایمان کے آئینہ پر گذشتہ پچاس سال میں جو گرد پڑ گئی تھی،

اُسے صاف کیا جا چکا تھا، دنیائے اسلام کے بنی امیہ کے اثرات کے ماتحت مرتد یا گمراہ ہو جانے کا خطرہ دُور ہو چکا تھا۔ خونِ حسینؑ و اشکِ سجادؑ سے اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں، آلِ رسولؐ سے آئندہ طلبِ بیعت کا خطرہ ختم ہو چکا تھا، قوم کا ضمیر بیدار ہو چکا مظلومیت کی طاقت آشکار ہو چکی تھی، انتہائی بے بسی کے عالم میں باطل کی قہرمانی قوتوں کو شکست دینے کے اصول دنیا کو سکھائے جا چکے تھے، بنی امیہ نے بادشاہت، جاگیرداری، اور نسل پرستی کے جو بت تیار کئے تھے وہ پاش پاش کئے جا چکے تھے، بادشاہوں کی "الوہیّت و ربوبیّت" کو ٹھکراتے ہوئے اِلٰہِ وَاحِد کی پرستاری کا عملی درس دیا جا چکا تھا۔ تاجوروں کی غلامی کے مقابلہ میں مر جانے اور صرف اللہ کی عبدیّت اختیار کرنے کا فرمان سنایا جا چکا تھا۔ صحابیت پر عدالت کے غلاف چڑھا کر اس کی مدد سے باطل کو ابھار دینے کی تدبیریں ناکام بنائی جا چکی تھیں، حکومت اور بیت المال کے متعلق اسلام کا نظریہ واضح کیا جا چکا تھا، اسلامی قوانین اخلاق کی عملی صورت دُنیا کے سامنے پیش کی جا چکی تھی، زیرِ خنجر نماز ادا کرنے کے آداب سکھائے جا چکے تھے، شریعت اسلامی کی روح کو فنا ہو جانے سے بچا لیا گیا تھا۔ آلِ رسولؐ کے لئے تعلیم و تبلیغ کی آزادی حاصل کر لی گئی تھی: دُنیا دار سلاطین کی نام نہاد "خلافت" کے ساتھ مذہب کا تصور وابستہ رہنے کے نتیجہ میں اسلام کی جو بدنامی ہو سکتی تھی اُس کا خطرہ دُور کر دیا گیا تھا، اس لئے کہ اب یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ دنیاداروں کی "خلافت" نری بادشاہت ہے۔ اور

اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اجماع، نامزدگی، شوریٰ، اور قہر و غلبہ کے سارے اصول غلط ثابت کر دیئے گئے تھے، اس لئے کہ جس یزید کی ذات پر اجماع بھی ہوا اور جسے معاویہ کے سے صحابی خلیفہ نے نامزد بھی کیا، جس کیلئے اکابر بنی امیہ و اکابر قریش کا شوریٰ بھی ہوا، اور جسے قہر و غلبہ بھی حاصل تھا، اس کی "خلافت"، جتنی غیر اسلامی تھی وہ قتلِ حسینؓ اور واقعہ حرہ سے ثابت ہے، اجماع، نامزدگی، شوریٰ اور قہر و غلبہ سے بنی ہوئی حکومت کی مخالفت جائز، آئینی اور سیرت صحابہ قرار پاگئی تھی اس لئے کہ جہاں ان اصولوں پر قائم شدہ یزیدی حکومت کے خلاف صحابی رسولؐ حسینؑ بن علیؑ نے جنگ کی، وہیں مکہ اور مدینہ کے ہزاروں صحابہ و تابعین نے بھی عبداللہ بن زبیر کی سرکردگی میں اس کے خلاف جنگ کرکے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان نام نہاد اصولوں کی بنیاد پر بنی ہوئی کسی حکومت کو "مقدس، اسلامی یا الٰہی حکومت" کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ اصول تو محض ایک وقتی سیاسی کرشمہ تھے، ان کو نہ کوئی دوام حاصل تھا اور نہ تقدس، چنانچہ خود صحابہ و تابعین نے ایک ایسی حکومت کو مردود قرار دیدیا۔ جو بیک وقت ان چاروں اصولوں پر قائم تھی، یہ آلِ رسولؐ کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی اور سید سجادؑ کو اس کامیابی کا پورا احساس تھا:

آج سید سجادؑ اس احساس کامرانی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے کہ انہوں نے تمام کو ہمیشہ کے لئے مسلمان بنا لیا ہے اور آلِ رسول کے لئے وہ ہمہ گیر ہر دلعزیزی اور مرجعیت حاصل

کرلی ہے کہ اب آلِ رسولؐ کو گمنامی کے غار میں پھینک دینے
یا مسلمانوں کو اس کی روحانی عظمت کا منکر بنا دینے کی کوئی سازش
کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ لوگ آلِ رسولؐ کے دشمنوں کی خلافت
بھی مانتے رہیں گے لیکن اس کے باوجود آلِ رسولؐ کی محبت کو
عین ایمان تسلیم کرنے پر مجبور رہیں گے۔ قریشی مفاد پرستوں،
بنی امیہ کے منافقوں اور بنی عباس کے عیش پرست سلاطین کو
رضی اللہ عنہ کا لقب بھی دیتے رہیں گے لیکن پھر بھی آلِ رسولؐ
کی عظمت کے سامنے جھکتے رہیں گے۔ اور فدک کی ضبطی، علیؑ کی خلافت
سے علیحدگی، علیؑ و اولادِ علیؑ پر سب و شتم، آلِ رسولؐ کے قتل عام
خانوادہ رسالت کی تشہیر، غرض آلِ رسولؐ کے نام اور ان کی
عزت و عظمت کو فنا کر دینے کی جتنی تدابیر اب تک کی گئی تھیں
وہ اس بری طرح ناکام ہو چکی ہیں کہ ان کا ذکر تو تاریخ کی
کتابوں میں باقی رہے گا، لیکن ان کے اثرات کبھی دیکھنے
میں نہیں آئیں گے!

قافلہ دمشق سے روانہ ہوا، اور شام و عراق کی درجنوں
بستیوں سے گذرتا ہوا کربلا پہنچا، بے شک سید سجادؑ اور
خواتین محترم کی یہ خواہش تھی کہ قبر حسینؑ کی زیارت کیجائے
لیکن اس عظیم خواہش کے ساتھ ہی عراقیوں کو اور ان کے پڑوس
میں ایرانیوں کو آلِ رسولؐ کی فتح مبین سے باخبر کرنا بھی ضروری
تھا، آلِ رسولؐ کا قافلہ کربلا پہنچا، سیدانیوں نے اپنے دارثوں
کا ماتم کیا۔ اور اس ماتم کے پردے میں بنی امیہ کی ناکامی اور

آلِ رسول کی فتح مبین کا اعلان کیا، دنیا نے دیکھا کہ کوفہ میں ابن زیاد بھی موجود ہے۔ قاتلانِ حسینؑ بھی جمع ہیں، لیکن آج وہ بے بس ہیں، ان پر کھلم کھلا لعنت کی جا رہی ہے۔ ان کے مظالم کا اعلان ہو رہا ہے۔ آلِ رسولؐ کے سلسلہ میں ان کے گھناؤنے کرتوت عام کئے جا رہے ہیں لیکن آج نہ ان میں یہ جرأت ہے کہ سید سجادؑ کو ٹوک سکیں، نہ یہ ہمت ہے کہ سیدانیوں کو دل دوز نوحوں کی شکل میں بنی امیہ پر لعنت برسانے سے روک سکیں اور نہ وہ اس قابل ہیں کہ اسی آلِ رسولؐ کے سامنے آسکیں جسے ابھی ایک سال قبل وہ گرفتار کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے تھے۔ عراقیوں نے آلِ رسولؐ کی قوت و کامرانی کا یہ منظر نہ صرف یہ کہ تعجب کی نگاہوں سے دیکھا بلکہ عبرت کی نگاہوں سے بھی دیکھا۔ اب ان کو معلوم ہوا کہ عبیداللہ بن زیاد اور یزید خدا نہیں ہیں جن سے ڈرا جائے یا جن کے ہاتھوں پر غلامی کی بیعت قبول کر لی جائے۔ یہ تو اتنے کمزور ہیں کہ چند بے بس خواتین نے ان کے ایوان اقتدار کو زمین بوس کر دیا! ————— اور اس احساس نے ان کے دلوں پر چھائی ہوئی بنی امیہ کی ہیبت ختم کر دی، ان کے دبے ہوئے جذبات ابھرنے لگے، ان کی بزدلی کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہی کوفہ والے جو عبیداللہ بن زیاد کے ڈر سے مسلم بن عقیل کی بیعت توڑ بیٹھے تھے۔ پہلے توابین کی شکل میں یزید کے خلاف صف آرا ہو گئے اور بعد میں مختار کی قیادت میں انہوں نے اسی عبیداللہ بن زیاد

کو کیفر کردار تک پہنچادیا۔ بزدل عراقی بہادر بن گئے اور وہی لوگ جن کے ضمیر اتنے مردہ ہو چکے تھے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے خانوادہ رسالت کی خواتین کی تشہیر ہوئی اور وہ چپ رہے۔ اتنے جری ہو گئے کہ انہوں نے یزید اور عبیداللہ ابن زیاد کی سیادت و حکمرانی کا خاتمہ کر دیا، یہی اثر ایران پر بھی پڑا، تلوار کی طاقت اور فاتحین کے جبر سے مسلمان ہونے والے ایرانی مظلومیت کی اس عظیم فتح اور آل رسول کے حق پرستانہ کردار سے متاثر ہو کر دل سے مسلمان ہو گئے۔ اور جس طرح شام کو دائمی طور پر مسلمان بنا لیا گیا تھا اسی طرح نہ صرف یہ کہ ایران کو ہمیشہ کے لئے مسلمان بنا لیا گیا بلکہ آل رسول کا اس شدت سے حامی بنا لیا گیا کہ انہیں ایرانیوں کی شمشیر برق تاب نے بنی امیہ کی نسل کو دنیا سے فنا کر دیا اور آج تک ایران آل رسولؐ کا شیدائیوں سے چھلکتا نظر آرہا ہے!

کربلا سے اسلام کا فاتح اعظم اور دین مبین کی تحریک کا چوتھا قائد مدینہ روانہ ہوا، اس مدینہ کی جانب جسے حسینؑ کو مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا، لیکن سید سجاد اس شان سے مدینہ میں داخل ہوئے کہ سارے شہر نے استقبال کے لئے آنکھیں بچھادیں! یہ وہی شہر تھا جہاں علیؑ کو آسانی سے خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جہاں فاطمہؑ کے آنسوؤں کی بھی قدر نہیں کی گئی تھی، جہاں قریش کے مفاد پرستوں نے آل رسولؐ کو گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا، جہاں سیرت شیخین کے " مذاق " پر علیؑ کا استحقاق

ختم کردیا گیا تھا، جہاں حسنؑ کے جنازے پر تیر برسائے گئے تھے اور جس کی زمین حسینؑ پر تنگ کر دی گئی تھی، لیکن آج سارا مدینہ بہتے ہوئے آنسوؤں، دردناک نوحوں، تڑپتے ہوئے کلیجوں، اور دل دوز چیخوں سے علی بن الحسینؑ کا خیر مقدم کر رہا تھا، آج نہ یزید کے گورنر میں یہ ہمت تھی کہ وہ حسینؑ کے جگر بند سے بیعت کا مطالبہ کرتا اور نہ مروان میں یہ طاقت تھی کہ وہ حسینؑ کی طرح علی بن الحسینؑ کو قتل کی دھمکی دیتا، آلِ رسولؐ کے دشمن یا تو گھروں میں روپوش تھے اور یا پھر سیاسی مطلع سے غائب۔ مدینہ پر علی ابن الحسینؑ کا پرچمِ فتح لہرا رہا تھا اور وہ مسجدِ نبوی جہاں حسینؑ کے نانا قیصر و کسریٰ کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے حسینؑ حسینؑ کی دردناک آوازوں سے لرز لرز کر دنیا کو آلِ رسولؐ کی ابدی اور دائمی فتح کا پیغام سنا رہی تھی! ——— شاید مسجد کی دیواریں زبانِ حال یہ اعلان کر رہی ہوں کہ

"دین کی جنگ ہمیشہ کے لئے
جیت لی گئی"!

انسان پر انسان کی حکومت کے ملعون اور جاہلی تصور کو بے نقاب کر دیا گیا۔

خلافت کے باب میں مسلمانوں کی ساری غلط فہمیوں اور غلط اندیشیوں کا پردہ چاک کر کے اسلام کے صحیح تصورِ خلافت اور حکومتِ الٰہیہ کے حقیقی اصولوں کو واضح کر دیا گیا!

قریش اور بنی امیہ کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں دین کے مسخ

ہو جانے کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا!

تلوار کی طاقت سے جن علاقوں کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا ان کو آلِ رسولؐ کی مظلومیت کا عکس دکھا کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے واقعتاً مسلمان بنا لیا گیا!

مسلمانوں میں یہ تصور عام کر دیا گیا کہ اسلام کی روحانی، مذہبی اور اخلاقی قیادت و سیادت کے حقدار صرف وہ محترم ارکان آلِ رسولؐ ہیں جو معصوم اور مامور من اللہ ہیں!

یہ تھی اس عظیم، طویل اور صبر آزما جنگ کی داستان جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہوئی تھی اور زندان خانہ شام سے اہلِ بیتؑ کی رہائی پر تمام ہوئی! ——— جو علیؑ ابن ابیطالب نے شروع کی اور علی ابن الحسینؑ پر ختم ہوئی! ——— اور جس میں قدم قدم پر آلِ رسولؐ کو وہ عظیم اور شاندار کامیابیاں نصیب ہوئی. جو ان کے مامور من اللہ قائد اور حکمت ربانی کا امین ہونے کا ایسا شاندار، تابناک اور ناقابلِ تردید ثبوت ہیں جس پر تاریخ اسلام ہمیشہ ناز کرتی رہے گی!

معاویہ اور یزید کے پاس دولت تھی، بادشاہت تھی، محلات تھے، خزانے تھے، لشکر تھے، دربار کے خوشامدی ٹٹو تھے، ظاہری جاہ و جلال تھا، مادی شان و شوکت تھی، بیعت کرنے والوں کی اکثریت تھی۔ غرض خالص دنیاوی نقطہ نظر سے ان کی طاقت اور قوت ناقابلِ انکار تھی، ——— اسکے

مقابلہ میں آل رسولؐ بوریا نشین تھی، مفلس تھی، اس کے پاس نہ خزانے تھے، نہ لشکر تھے، نہ حمایتیوں کی کثرت تھی اور نہ دنیاوی ساز و سامان، لیکن ان دونوں کے ٹکراؤ کا جو نتیجہ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ نتائج کا پتہ چلانے کے لئے دُور کیوں جائیے، تاریخ کے صفحات کیوں الٹیئے۔ سامنے کی چیزیں دیکھ لیجئے —— آج دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کے ناموں میں علیؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کا لفظ موجود ہے۔ لیکن کسی مسلمان کا نام معاویہ یا یزید نہیں ہوتا، ہر مسلمان کے گھر میں پنجتن پاک کے ناموں کا طغرائی آویزاں نظر آتا ہے۔ آل ابی سفیان کے نام کوئی دیواروں پر لکھ کے نہیں لگاتا مسلمان جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو آل رسولؐ کا واسطہ دیتے ہیں، معاویہ اور یزید کے واسطہ سے کوئی دعا نہیں مانگتا، معاویہ اور یزید کی قبروں کا کوئی نشان نہیں، لیکن نجف، کربلا، اور بقیع میں ہزاروں زائرین دُور سے جا کے جمع ہوتے ہیں، اور ان مشاہد مقدسہ کی زیارت کو اپنے لئے سرمایہ آخرت تصور کرتے ہیں۔

آل رسولؐ کی شان میں عربی، فارسی، ہندی، اردو، ترکی، انگریزی، فرانسیسی غرض دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں نظم و نثر کے موتی لٹائے جاتے ہیں۔ اور مسلمان ادبار شعراء سے قطع نظر، غیر مسلم ادیب و شاعر بھی ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ لیکن بنی امیہ کے ان سلاطین کا نام آتے ہی ذوق سلیم کی پیشانی پہ بل آجاتے ہیں، محرم آتے ہی اسلامی

دنیا کے گوشہ گوشہ میں آل رسولؐ کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ اور خوش بیان واعظین آل رسول کی تعریف میں اپنی طلاقت لسانی کے جوہر دکھانا شروع کر دیتے ہیں لیکن یزید اور معاویہ کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کو یاد رکھنا بھی غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ آلِ رسولؐ کے ذکر کے لئے دنیا میں ہزاروں عمارتیں امام باڑوں اور عاشور خانوں کے نام سے موجود ہیں۔ لیکن اموی حکمرانوں کے نام سے ایک ٹیلہ بھی موسوم نہیں۔ اردو زبان میں یزید کی شان میں ایک لفظ بھی ملنا محال ہے۔ لیکن اردو کے شعری ادب کا سب سے تابناک جواہر پارہ "مرثیہ" آلِ رسولؐ ہی کے ذکر سے مملو نظر آتا ہے۔ معاویہ اور یزید کا فاتحہ کوئی نہیں دلاتا لیکن آلِ رسولؐ کی نیاز ہر گھر میں عام ہے، اموی سلاطین کے نام سے خود مسلمان متنفض ہو جاتے ہیں، اور حسینؑ حسینؑ کا نعرہ ہندو بھی بلند کرتے ہیں ——— اور یہ ساری عظمت، عزت، شہرت ان لوگوں کے لئے ہے جو مادی نقطہ نظر سے قطعًا کمزور اور بے بس تھے لیکن چونکہ وہ حق کے لئے لڑے، حق کے لئے جیئے، حق کے لئے مرے اور حق کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرتے رہے اس لئے وہ زندگی میں بھی کامیاب رہے اور مرنے کے بعد بھی کامیاب ہیں، زندگی میں انہوں نے جابر بادشاہوں اور باطل کی قوتوں کو شکست دے کر اپنے مقاصد حاصل کیئے۔ اور موت کے بعد ان کو ان کی ان عظیم کامیابیوں یہ ثمر حاصل ہوا کہ آج ان کے نام عظمت، محبت اور عقیدت کے مرکز بنے ہوئے

یہ صحیح ہے کہ ان کو آگ اور خون کے دریاؤں سے گذرنا پڑا، ان کو قدم قدم پر طوفانوں اور زلزلوں کا مقابلہ کرنا پڑا، ان کی زندگی کے آبگینے مصائب کے پتھروں سے چکنا چور ہوتے رہے۔ ان کی حیاتِ ظاہری آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی نظر آئی ——— لیکن ان کے باطن ہمیشہ مسکراتے رہے۔ ان کے قلب ہمیشہ مسرور رہے، اور ہجوم مصائب میں بھی خوشیاں ان کے قدم چومتی رہیں، اسلئے کہ ان کو اپنے حریف کے مقابلہ میں قدم قدم پر کامیابیاں نصیب ہو رہی تھیں، وہ اپنا ہر پسندیدہ مقصد حاصل کر رہے تھے اور ان کے مخالف اپنی ہر سازش، ہر تدبیر میں ناکام ہو رہے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس فتح مبین کے حصول میں اشک و آہ کا بڑا حصہ رہا اور ان عظیم انسانوں کو بے پناہ قربانیاں پیش کرنا پڑیں لیکن دنیا کی کوئی کامیابی قربانیوں اور سعی و جہد کے بغیر نصیب نہیں ہوتی، یہ دنیا دار العمل ہے، سعی و حرکت کا میدان ہے۔ اور یہاں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سعی کرتا جانتا ہے۔ قربانیاں دینا جانتا ہے، خون پسینہ ایک کرنا جانتا ہے، پھر مقصد جتنا عظیم ہوگا، کامیابی جتنی بڑی درکار ہوگی، فتح جتنی دیر پا چاہئے ہوگی، قربانیاں بھی اتنی ہی زیادہ پیش کرنا پڑیں گی، یہ دنیا کا دستور ہے، اس لئے اگر آل رسولؐ کو آگ اور خون کے

دریاؤں سے گذرنا پڑا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے یہ انہیں قربانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج دُنیا کے سُران کے آستانوں پر جھکے نظر آرہے ہیں!



القرآن الحکیم

ترجمہ و تفسیر

مولانا حکیم حافظ فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ

امامیہ مشن پاکستان نے افادۂ مومنین کے لیے زرِ کثیر صرف کر کے
اس قرآن مجید کو شایانِ شان طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔
صرف ایک ہزار نسخے طبع کرائے گئے ہیں جلد طلب فرمائیے ورنہ
اتنے کم ہدیہ پر یہ قرآن مجید آپ کو کہیں نہ مل سکے گا۔

کتابت: عالی اور معیاری • طباعت: اعلیٰ اور رعنائی

کاغذ: سفید کرنافلی • جلد: مضبوط اور سنہری ڈائی

ھدیہ: ساڑھے بارہ روپے۔ ممبرانِ امامیہ مشن سے صرف دس روپے

(علاوہ محصول ڈاک) (ممبری نمبر کا حوالہ ضروری ہے)

جنرل سیکریٹری امامیہ مشن پاکستان لاہور

فتحِ مبین

از قلم

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی

ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی



ناشر

بہ امامیہ ◎ اُردو بازار

لاہور